ہم فکری سے ہم راہی تک
سید جہانزیب عابدی
(جلد چہارم)

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَعَجِّلْ فَرَجَهُمْ

انتساب

اس روشنی کے نام جو ہمارے تاریک ترین اوقات میں رہنمائی کرتی ہے،

امام زمانہؑ کے لیے، انسانوں کے نجات دہندہ، خدا کی نشانی حضرت بقیۃ اللہ،

اور اپنے والدین کے لیے، جو میرے وجود کی بنیاد ہیں، ظاہری اور فکری،

سید سرکار حیدر عابدی (مرحوم) اور سیدہ رفعت عابدی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہا)

آپ کی محبت اور حکمت میرے رہنما ستارے رہے ہیں اور

ان سرپرستوں اور روحانی مربیوں کے نام جنہوں نے میر اراستہ روشن کیا، منزل کو واضح کیا۔۔۔

آیت اللہ سید حسین مرتضیٰ نقوی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہ) اور ان کے اہل خانہ، اور

حجۃ الاسلام والمسلمین سید غلام عباس رضوی (حسین آغا) حفظ اللہ تعالیٰ عنہ

نیز آیت اللہ شیخ شبیر حسن میثمی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید ظفر مہدی نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید علی سلمان نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ نور عالم، دامت توفیقاتہم

آپ حضرات کی تعلیمات نے زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور عقل و دانش سے فائدہ اٹھانے کے طریق واضح کیے،

میری پیاری بیوی سیدہ مہوش زہرہ، جن کی زحمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کیلئے ایک مقالہ لکھنا پڑے،

اور میرے نوجوان بیٹے،

سید محمد حسین مہدی، مستقبل کی روشن کرنوں میں سے ایک کرن،
آپ سب کی غیر متزلزل حمایت اور پشت پناہی میرے سفر کو تیز کرتی ہے۔
میرے پورے خاندان کے لیے، لامتناہی طاقت اور محبت کا ذریعہ،
برادران حجۃ الاسلام سید شعیب عابدی، عدیل عابدی، مصطفیٰ عابدی،
بہنیں اسرا اور فرحین، اور میرے پیارے سسرالی، ماں اور باپ اور بہنیں،
اے خدا تو میرے وجود کی جڑ ہے، زندگی کے طوفانوں میں مجھے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے،
میرے ساتھ چلنے والے دوستوں اور خیر خواہوں کے نام،
آپ کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی میرے لیے باعث برکت ہے۔
عاجزی کے ساتھ، میں "ہم فکری سے ہم راہی تک" کتاب آپ سب کے نام کرتا ہوں۔
یہ کتاب یہ علمی و فکری لگن آپ میں سے ہر ایک کے لیے میری شکر گزاری اور پیار کا ایک چھوٹا سا نذرانہ ہے۔ آپ سب میرے آسمان میں بالائی برج ہیں، زندگی کے سفر میں میری رہنمائی کر رہے ہیں۔ آپ کی محبت، حکمت اور تعاون اس کتاب کے صفحات میں بنُے ہوئے ہیں اور میں اس کام کی تشکیل میں آپ کے کردار کے لیے ہمیشہ مقروض ہوں۔
دل کی گہرائیوں سے شکریہ اور اٹوٹ محبت کے ساتھ!

سید جہانزیب عابدی

فہرست

کچھ کتاب کے بارے میں

الحمد للہ، جو ہمیں عقل اور فہم کے اس راستے پر لے کر آیا ہے، جو ہمیں اسلامی اصولوں اور معاشرتی اصولوں کی روشنی میں زندگی کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کا مقصد، ہمارے دین کے ثبوتی دلائل کو فراہم کرنا ہے۔

یہ کتاب پندرہ، بیس سال کی فکری محنت اور مشاہدے اور اصلاح کے عمل کا نتیجہ ہے۔یہ مضامین زندگی کے متفرق زندہ موضوعات پر مشتمل ہیں جو اس عرصے میں زیر قلم آئے، یہ ایک خود اونچ پنچ کا سفر ہے، جس میں میری زندگی کے مختلف مراحل کا تجربہ شامل ہے، جس نے میری فہم اور تجدید کو اضافی روشنی دی ہے۔

اس کتاب میں اسلامی اصولوں کو بنیاد بنا کر ایک خالص فکری کاوش پیش کی گئی ہے۔ اس سے اختلاف کا حق اختلاف کی اہمیت اور احترام کے باعث روا ہے ہر ایک کے پاس خود کے خیالات اور رائے کا حق ہوتا ہے اور وہ اپنے خیالات کو پیش کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں قرآن، حدیث، تاریخ، علمیات، نفسیات، سیاسیات، معاشیات، ابلاغیات، اور دیگر سماجی علوم کی موٹی موٹی باتوں کو متعدد مواقع پر پیش کیا گیا ہے، تاکہ ہم اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکیں اور ان کو اپنی زندگی میں عمل میں لا سکیں۔

یہ کتاب خصوصی طور پر نوجوانوں کیلیئے ہے، تاکہ وہ اس میں سے کام کی باتیں انتخاب کریں اور اپنے فکری جولان کو بڑھا سکیں۔ اس کتاب کی تیاری کے اسباب نے میری زندگی کو تبدیل کیا ہے، اور میری امید ہے کہ یہ اپنی مخصوص اہمیت کے ساتھ آپ کی زندگی کو بھی تبدیل کرے گی۔

کتاب میں جس جگہ مضامین دوسرے لکھاریوں سے لے کر اضافہ جات کیے ہیں یا ترجمہ کیے ہیں وہ مضمون میں عنوان کے ساتھ مشخص کر دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی امید کے ساتھ، میں آپ کو اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کتاب کو پڑھ کر، آپ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا راستہ تلاش کر سکیں گے اور اپنے اصولوں کو مضبوط کرنے میں کافی کامیاب رہیں گے۔ ان شاء اللہ

عابدی

zaib.abidi.pk@gmail.com

اختلاف میں ہم آہنگی

انسان اپنی فطرت، خیالات اور رجحانات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، مگر اس اختلاف کے ساتھ ساتھ وہ بہت سی بنیادی صفات میں بھی یکساں ہے۔ یہی یکسانیت معاشرتی زندگی کی بنیاد ہے، اور یہی وہ پہلو ہے جس پر توجہ دی جائے تو انفرادی اور اجتماعی اصلاح ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر ہم اپنی توانائیاں ان اختلافی امور کو بدلنے میں صرف کریں جن کا بدلنا ممکن نہیں، تو نہ صرف مایوسی پیدا ہوتی ہے بلکہ تعلقات میں تناؤ بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر ہم ان پہلوؤں کو سمجھیں جو ہم سب میں مشترک ہیں اور ان کی اصلاح پر توجہ دیں، تو ہم ایک بہتر اور متوازن معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر، تمام انسان بنیادی جذبات جیسے محبت، ہمدردی، خوف، خوشی، اور دکھ کو محسوس کرتے ہیں۔ ہر شخص عزت، انصاف اور سچائی کی قدر کرتا ہے، چاہے اس کی سوچ یا پس منظر کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ اسی طرح، ہر فرد کی بنیادی ضروریات میں تعلیم، صحت، روزگار، اور امن شامل ہیں، اور یہی وہ عناصر ہیں جن پر توجہ دے کر معاشرتی بھلائی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ان مشترکہ قدروں کو مضبوط کریں تو اختلافات کے باوجود ایک ہم آہنگ معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

اس کے بر عکس، اختلافی عوامل میں زبان، ثقافت، رنگ، رسم و رواج، اور نظریاتی رجحانات شامل ہیں۔ یہ اختلافات فطری ہیں اور ان کا وجود ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم اپنی توجہ انہی اختلافات پر مرکوز رکھیں اور دوسروں کو اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں تو اس کے نتیجے میں بے چینی، عدم برداشت اور تنازعات جنم لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہر انسان کی سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے، ہر شخص کے تجربات اور نظریات الگ ہوتے ہیں، اور ہر فرد کی ترجیحات بھی مختلف ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم ان اختلافات کو تسلیم کر کے آگے بڑھیں اور اختلاف کے باوجود دوسروں کو قبول کرنے کا حوصلہ پیدا کریں، تو ہم ایک زیادہ مثبت اور پر امن ماحول بنا سکتے ہیں۔

لہٰذا، اصل حکمت یہ ہے کہ ہم اپنی توانائی اور تجربات ان خوبیوں کی اصلاح پر صرف کریں جو ہم سب میں مشترک ہیں، جیسے دیانت داری، صبر، احسان، تحمل اور عدل و انصاف۔ ہمیں دوسروں کی انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان اختلافات پر الجھنے کے بجائے ان اقدار کو مضبوط کرنا چاہیے جو سب کے لیے فائدہ مند ہیں۔ جب ہم یکساں خوبیوں کی پرورش پر توجہ دیں گے تو نہ صرف انفرادی طور پر بہتری آئے گی بلکہ معاشرتی سطح پر بھی زیادہ ہم آہنگی اور رواداری پیدا ہو گی۔

اگر کوئی انسان ان اصولوں کو اہمیت نہیں دیتا، یعنی وہ دوسروں کے ساتھ اختلافات کو قبول کرنے کے بجائے ان پر زور دیتا ہے اور مشترکہ خوبیوں پر توجہ دینے کے بجائے اختلافی پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے، تو اس کے نتیجے میں کئی منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ سب سے

پہلے، اس کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگی کیونکہ وہ دوسروں کو بدلنے کی کوشش میں وقت اور توانائی صرف کرے گا، جو نہ صرف لاحاصل ہوگا بلکہ دوسروں کو اس سے دور کر دے گا۔ جب انسان دوسروں کو ان کے اختلافات کے ساتھ قبول نہیں کرتا تو وہ مستقل بے چینی اور ذہنی دباؤ میں مبتلا رہتا ہے، کیونکہ وہ حقیقت کو بدلنے کی ایسی کوشش کر رہا ہوتا ہے جو ممکن ہی نہیں۔

اس رویے کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ وہ معاشرتی ہم آہنگی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اگر ہر فرد دوسروں کی انفرادیت کو مسترد کرنے لگے اور انہیں زبردستی اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے، تو یہ عدم برداشت اور نفرت کو جنم دے گا۔ نتیجتاً، سماج میں اختلافات تصادم میں بدل سکتے ہیں، اور جہاں برداشت اور قبولیت کی کمی ہو، وہاں انتشار اور ٹکراؤ بڑھ جاتا ہے۔ ایسے افراد جو دوسروں کو اپنی سوچ پر مجبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اکثر تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ لوگ ان سے دور ہونا شروع کر دیتے ہیں۔

اس کے برعکس، اگر کوئی انسان اختلافات کو تسلیم کر کے اپنی توجہ ان خوبیوں کی اصلاح پر مرکوز کرے جو سب میں مشترک ہیں، تو اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ وہ نہ صرف زیادہ پُرسکون اور متوازن زندگی گزارے گا بلکہ اس کے تعلقات میں بھی بہتری آئے گی۔ ایک ایسا شخص جو دوسروں کی انفرادیت کو قبول کرتا ہے اور ان کی اچھی صفات کو پروان چڑھانے کی کوشش کرتا ہے، وہ ایک خوشگوار اور مثبت ماحول پیدا کرتا ہے، جہاں لوگ اس

کی صحبت میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ یہ رویہ سماج میں بھائی چارے، رواداری اور باہمی احترام کو فروغ دیتا ہے، جس کا فائدہ نہ صرف فرد کو بلکہ پورے معاشرے کو ہوتا ہے۔

اگر ان اصولوں کو نظر انداز کیا جائے تو اس کا نتیجہ نفرت، غلط فہمیاں، ذہنی دباؤ اور سماجی بگاڑ کی صورت میں نکلتا ہے۔ لیکن اگر ان اصولوں کو اپنایا جائے تو اس کے ثمرات محبت، ہم آہنگی، ذہنی سکون اور ایک مضبوط و متوازن سماج کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ حقیقی دانش مندی اسی میں ہے کہ ہم اپنی توجہ ان پہلوؤں پر مرکوز رکھیں جو سب کے لیے فائدہ مند ہیں اور اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کو قبول کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

استعماری تعلیم کے اثرات سے بچوں کو کیسے محفوظ رکھیں

پاکستان جیسے ملک میں جہاں تعلیمی نظام استعماری طاقتوں کے زیر اثر ہے اور نصاب میں استعماری نظریات، مغربی افکار اور جدید غلامی کے اصول شامل کیے گئے ہیں، وہاں والدین کے لیے یہ چیلنج اور بھی بڑا ہو جاتا ہے کہ وہ بچوں کو رسمی تعلیم بھی دلوائیں اور انہیں ان نظریاتی زنجیروں سے بھی بچائیں جو ان کی فکری آزادی کو محدود کر سکتی ہیں۔ کیونکہ تعلیم کا حصول ایک سماجی اور معاشی ضرورت ہے، اور والدین بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے انہیں اسکول، کالج اور یونیورسٹی بھیجنے پر مجبور ہیں، اس لیے محض تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کوئی مؤثر حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بجائے، والدین کو ایک متوازی حکمت عملی اپنانی ہوگی جو بچوں کو تعلیمی نظام کے استعماری اثرات سے محفوظ رکھے اور ساتھ ہی ان کی فکری، روحانی اور تہذیبی بنیادوں کو مضبوط کرے۔

سب سے پہلا قدم والدین کی اپنی فکری اور نظریاتی بیداری ہے۔ جب تک والدین خود یہ شعور حاصل نہ کریں کہ تعلیمی نظام کے ذریعے کن تصورات کو مسلط کیا جا رہا ہے، وہ اپنے بچوں کی صحیح فکری رہنمائی نہیں کر سکتے۔ انہیں نصاب میں موجود استعماری اثرات، سیکولر بیانیے، اور عقیدے و ثقافت کے خلاف ہونے والی علمی یلغار کو سمجھنا ہوگا تاکہ وہ بچوں کو ان کے متبادل نظریات مہیا کر سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ والدین خود اسلامی، تاریخی

اور نظریاتی مطالعات کریں اور ایسے اسکالرز اور مفکرین کی تحریروں سے واقف ہوں جو مغربی استعمار کے خلاف فکری مزاحمت کر رہے ہیں۔

دوسرا اہم کام یہ ہے کہ بچوں کو باقاعدہ گھریلو فکری تربیت دی جائے۔ جب بچے اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں استعماری نظریات کا سامنا کرتے ہیں تو انہیں ان نظریات کے بارے میں پہلے سے ہی متبادل اسلامی اور فکری زاویہ فراہم کر دیا جائے۔ مثلاً، اگر تعلیمی نظام میں مغربی جمہوریت، لبرلزم اور سرمایہ داری کی برتری کو پڑھایا جارہا ہے، تو والدین بچوں کو اسلامی نظام حکومت وسیاست، عدل پر مبنی معیشت اور خود مختار معاشرتی نظام کے بارے میں سکھائیں۔ گھر میں ایسی گفتگو عام ہو جو بچوں کو سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے کی صلاحیت دے اور وہ استعماری بیانیے کو بغیر سوچے سمجھے قبول نہ کریں۔

بچوں کو مطالعے کی ایسی عادت ڈالنی چاہیے جو انہیں یک طرفہ استعماری بیانیے سے نکال کر تاریخ اور حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے کے قابل بنائے۔ انہیں وہ کتابیں اور مضامین فراہم کیے جائیں جو استعماری طاقتوں کی سازشوں، اسلامی تہذیب کی برتری، اور مسلمانوں کے علمی و سائنسی کارناموں پر روشنی ڈالیں۔ ایسے اسکالرز جیسے سید قطب، علی شریعتی، محمد باقر الصدر، مرتضیٰ مطہری، اور اقبال جیسے مفکرین کی تحریریں بچوں کو نظریاتی طور پر مضبوط کر سکتی ہیں اور وہ استعماری ذہنیت کو پہچاننے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو ایسی محافل، اجتماعات اور فکری نشستوں میں لے کر جائیں جہاں انہیں حقیقی اسلامی، ثقافتی اور تہذیبی شعور مل سکے۔ یہ محافل انہیں اپنی شناخت کے

بارے میں اعتماد دیں گی اور وہ مغربی افکار کے دباؤ میں آئے بغیر اپنی اصل روحانی و فکری جڑوں سے جُڑے رہیں گے۔ اگر ممکن ہو تو بچوں کو ایسے اساتذہ یا مصلحین کے زیر سایہ بھی تعلیم دلوانی چاہیے جو استعماری اثرات سے آزاد علمی ماحول فراہم کر سکیں۔

میڈیا کے ذریعے بچوں کی ذہن سازی بھی آج کے دور میں بہت اہم ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو استعماری بیانیے پر مبنی فلموں، ویب سیریز، اور مواد سے بچائیں اور ان کے لیے متبادل اسلامی اور تاریخی میڈیا فراہم کریں۔ بچوں کو اسلامی تاریخ پر مبنی ڈاکیومنٹریز، سیرت النبیؐ و سیرت معصومینؑ اور اسلامی زندگی کی روش پر بنے ہوئے معیاری مواد دکھایا جائے تاکہ وہ اپنی تاریخ اور شناخت پر فخر محسوس کریں اور مغربی ثقافتی یلغار سے محفوظ رہ سکیں۔

بچوں میں یہ شعور پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ تعلیمی نظام میں دی گئی ہر چیز کو بغیر سوال کیے قبول نہ کریں، بلکہ ہر چیز پر تحقیق کریں، دلیل طلب کریں اور اسے اسلامی تناظر میں پرکھنے کی عادت ڈالیں۔ جب بچے یہ سیکھ لیں گے کہ مغربی نظریات اور تعلیمی نصاب کی ہر چیز کو عقلی اور دینی اصولوں کی روشنی میں دیکھنا ہے، تو وہ خود بخود اس نظریاتی یلغار سے محفوظ ہو جائیں گے۔

ایک اور اہم پہلو اسلامی عقائد اور عبادات کی عملی تربیت ہے۔ جب بچے گھر میں دین پر مضبوطی سے کاربند ہوں، نماز، دعا، اور دیگر عبادات کو ایک روحانی طاقت کے طور پر اپنائیں، تو وہ نظریاتی حملوں سے زیادہ مؤثر طریقے سے بچ سکتے ہیں۔ مغربی استعماری نظام کا

سب سے بڑا ہتھیار یہی ہے کہ وہ بچوں کو ان کی روحانی بنیادوں سے کاٹ کر بے مقصد، مادہ پرست اور صرف دنیاوی کامیابی کے پیچھے بھاگنے والا بنادے۔ جب بچے اپنے عقائد اور دینی اصولوں پر مضبوط ہوں گے تو وہ استعماری اثرات کو جڑ سے اکھاڑنے کے قابل ہو سکیں گے۔

بیدار اسلامی ممالک جیسے ایران اور عراق میں زیارات کے سفر نہ صرف روحانی بیداری کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ ایک عملی اسلامی معاشرے کا مشاہدہ کرنے کا بہترین موقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ زیارات کے دوران بچوں اور نوجوانوں کو ایک ایسا ماحول ملتا ہے جہاں دین محض عبادات تک محدود نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کا ایک مکمل نظام ہے۔

ایران میں مشہد میں امام رضاعلیہ السلام کے حرم اور قم میں حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا کے روضے پر جانے سے زائرین کو اسلامی تعلیمات کے عملی نفاذ، دینی مراکز، حوزہ علمیہ، اور ایک نظریاتی طور پر مضبوط اسلامی حکومت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایران میں اسلامی قوانین کے تحت زندگی کس طرح ترتیب دی گئی ہے، وہاں کا عدالتی اور تعلیمی نظام کس طرح مغربی اثرات سے آزاد ہو کر اپنی شناخت قائم رکھے ہوئے ہے، یہ سب کچھ ایک فکری بیداری کا باعث بنتا ہے۔ قم میں علمی مراکز اور مشہد میں اسلامی ثقافت کے فروغ کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر بچوں میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ ایک جدید اسلامی معاشرہ کس طرح مغربی تہذیب سے مرعوب ہوئے بغیر اپنی اصل شناخت برقرار رکھ سکتا ہے۔

عراق میں نجف اور کربلا کی زیارات جہاں روحانی اعتبار سے ایمان کو تازہ کرتی ہیں، وہیں یہ مزاحمت اور استعماری سازشوں کے خلاف جدوجہد کی ایک زندہ مثال بھی پیش کرتی ہیں۔ نجف میں امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام کا حرم ایک مثالی اسلامی حکومت کے اصولوں کو سمجھنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ وہاں کے علمی مراکز، دینی قیادت کا کردار، اور معاشرتی انصاف کے اصول دیکھ کر بچوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں حکومت اور عوام کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔

کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے روضہ مبارک کی زیارت، عاشورہ کی تحریک کو تاریخ سے ہٹ کر ایک زندہ حقیقت کے طور پر سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ وہاں پر اربعین کے موقع پر لاکھوں زائرین کا اجتماع دیکھ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ آج بھی اسلامی معاشرہ ظلم اور استکبار کے خلاف مزاحمت میں کس قدر فعال ہے۔ استعماری طاقتوں نے مسلمانوں کو منتشر کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی ہیں، ان کے مقابلے میں کربلا ایک ایسی مرکزیت فراہم کرتا ہے جو مسلمانوں کو جوڑنے اور مزاحمتی شعور بیدار کرنے میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔

ایران اور عراق کے سفر کے دوران یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہاں کے معاشرتی نظام میں دینی اقدار کو کیسے شامل کیا گیا ہے۔ خواتین کا حجاب، اسلامی تعلیمات کے مطابق عدالت کا قیام، دینی مراکز کی خودمختاری، اور مغربی ثقافتی یلغار کے خلاف مضبوط حکمت عملی یہ سب ایک مکمل اسلامی طرز زندگی کی جھلک پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوانوں کے لیے یہ

ایک عملی تجربہ ہوتا ہے کہ وہ دیکھ سکیں کہ اسلامی طرز زندگی کا نفاذ کسی خیالی بات کے بجائے ایک حقیقت ہے، اور یہ مغربی ماڈلز کا محتاج نہیں ہے۔

اس لیے زیارات پر لے جانا نہ صرف روحانی تربیت کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ بچوں اور نوجوانوں کو عملی طور پر ایک اسلامی ریاست، اسلامی قوانین اور معاشرتی نظام کا تجربہ فراہم کرتا ہے۔ اس سفر کے بعد وہ استعماری اثرات کو بہتر انداز میں پہچاننے اور ان کے خلاف مزاحمت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی فکری، نظریاتی اور عملی تربیت میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہو سکتا ہے، اور انہیں مغربی فکری غلامی سے بچا کر ایک خود مختار اسلامی شناخت عطا کر سکتا ہے۔

یہ تمام اقدامات اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ بچے رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک مضبوط فکری، نظریاتی، اور تہذیبی بنیاد بھی حاصل کریں۔ والدین اگر اس تربیتی نظام کو گھر میں نافذ کریں اور تعلیمی نصاب کے استعماری اثرات کے خلاف بچوں میں مزاحمت پیدا کریں، تو وہ مستقبل میں ایسے باشعور اور خود مختار مسلمان بن سکیں گے جو نہ صرف استعماری طاقتوں کے اثرات سے بچے رہیں گے بلکہ ان کے خلاف ایک فکری اور عملی جدوجہد کا حصہ بھی بن سکیں گے۔

استعماری نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیماریاں

استعماری سرمایہ داری نظام نے کئی ایسی بیماریاں پیدا کیں یا ان کے پھیلاؤ کو تیز کیا جو براہ راست اس نظام کے استحصالی، غیر مساوی اور منافع پر مبنی ڈھانچے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان میں جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کی بیماریاں شامل ہیں، جو یا تو سرمایہ دارانہ طرزِ زندگی کی پیداوار ہیں یا پھر منافع بخش انڈسٹریز کے تسلط کے باعث مصنوعی طور پر عام کی گئیں۔

ذیابیطس اور دل کی بیماریاں سرمایہ دارانہ طرزِ زندگی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ فاسٹ فوڈ انڈسٹری، پراسیس شدہ خوراک، چینی اور چکنائی سے بھرپور مصنوعات کی تشہیر اور فروخت کے ذریعے عوام کو ایسے کھانوں کا عادی بنا دیا گیا ہے جو غذائیت سے خالی اور بیماریوں کو دعوت دینے والے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ نظام نے ایسی جسمانی مشقت سے خالی زندگی کو فروغ دیا جس میں افراد زیادہ تر بیٹھے رہنے پر مجبور ہیں، نتیجتاً موٹاپا، بلڈ پریشر اور دل کے امراض عام ہو چکے ہیں۔

ذہنی امراض کی بڑھتی ہوئی شرح بھی اسی نظام کی پیدا کردہ ہے۔ ڈپریشن، اینزائٹی، شیزوفرینیا اور دیگر ذہنی عوارض اسی مادی اور مسابقتی زندگی کی پیداوار ہیں جہاں فرد کو مسلسل مقابلے، عدم تحفظ، اور معاشی دباؤ میں رکھا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ پروپیگنڈہ لوگوں کو باور کراتا ہے کہ ان کی حیثیت، کامیابی اور خوشی صرف مادی اشیاء کے حصول سے جڑی

ہوئی ہے، مگر جب یہ چیزیں حاصل نہیں ہوتیں یا ان کی خواہش کبھی ختم نہیں ہوتی، تو انسان شدید ذہنی دباؤ اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

کینسر جیسی بیماریاں بھی سرمایہ دارانہ صنعتوں کے ہاتھوں پھیلائی گئیں۔ تمباکو انڈسٹری، آلودگی، کیمیکل سے بھرپور خوراک، اور کارپوریٹ کمپنیوں کی زہریلی مصنوعات کینسر کے واقعات میں بے پناہ اضافے کا سبب بنی ہیں۔ بڑے فارماسیوٹیکل کارپوریشنز کے لیے کینسر ایک کاروبار بن چکا ہے، جہاں مہنگے علاج، ادویات اور تھراپیز کے ذریعے مریضوں کو ایک مستقل منڈی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

آٹزم اور دیگر نیورولوجیکل عوارض بھی جدید صنعتی زندگی اور سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ مسائل میں شامل ہیں۔ کیمیکل، زہریلی ادویات، غذائی ترمیمات اور والدین کے غیر فطری طرزِ زندگی نے بچوں میں ایسی بیماریاں عام کر دی ہیں جنہیں پہلے شاذ و نادر ہی دیکھا جاتا تھا۔ ان بیماریوں کا حل بھی مہنگی تھراپی، مخصوص تعلیمی پروگراموں، اور مخصوص ادویات میں ڈھونڈا جاتا ہے، جو کارپوریٹ سیکٹر کے لیے مزید منافع کا ذریعہ بنتا ہے۔

متعدی بیماریوں کا پھیلاؤ بھی اس نظام کا شاخسانہ ہے۔ سرمایہ داری نے حیوانات کی صنعتی فارمنگ کو اس قدر غیر فطری بنا دیا کہ کئی نئی بیماریاں جنم لینے لگیں، جیسے برڈ فلو، سوائن فلو اور کووڈ جیسے وائرس۔ جنگلات کی تباہی، ماحول کی بربادی اور حیوانی زندگی کو کنٹرول کرنے کی کوششوں نے وبائی امراض کو زیادہ عام کر دیا، اور جب بیماریاں پھیلتی ہیں تو ان کا حل بھی دواساز کمپنیاں مہنگے ویکسینیشن اور مصنوعی ادویات کے ذریعے فراہم کرتی ہیں۔

یہ بیماریاں سرمایہ داری کے ان پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہیں جو عوامی صحت کے بجائے منافع کو ترجیح دیتے ہیں۔ صحت کو ایک بنیادی انسانی حق کے بجائے ایک مہنگی سہولت بنادیا گیا ہے، جہاں بیماریاں ختم کرنے کے بجائے انہیں کنٹرول میں رکھا جاتا ہے تاکہ ایک مستقل صارفین کی کلاس قائم رہے۔ اگر نظامِ معیشت اور سماجی ڈھانچے کو فطری اصولوں پر استوار کیا جائے، جہاں صحت کو کاروبار کے بجائے انسانیت کی خدمت کے طور پر دیکھا جائے، تو ان بیماریوں کے حقیقی حل ممکن ہو سکتے ہیں۔

نیز استعماری سرمایہ داری نظام نے انسان کی وہ تمام نفسانی صفات، کردار اور خصوصیات جو اس کے استحصالی مفادات کے خلاف جاتی ہیں، ایک بیماری یا عارضہ قرار دے کر سماجی، سائنسی اور نفسیاتی سطح پر ان کی نفی کی ہے۔ اس نے انسان کو ایک مشین، صارف اور محض ایک معاشی اکائی میں بدلنے کے لیے قدرتی انسانی رجحانات کو دبایا اور انہیں قابلِ علاج مسئلہ بنادیا۔

سوالات کرنے، چیزوں پر شک کرنے اور گہرائی میں جاکر سوچنے کی صلاحیت کو اکثر "اوور تھنکنگ"، "اینزائٹی ڈس آرڈر" یا "سکیپٹزم" کے نام سے بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ یہی رویہ حقیقت کی تلاش اور علمی ترقی کا اصل سبب ہے۔ اسی طرح، شدید حساسیت اور گہری فکری وابستگی رکھنے والے افراد کو "ہائی سنسیٹیو پرسنالٹی"، "ڈپریشن"، یا "سوشل انزائٹی" کا شکار قرار دے کر دوا اور تھراپی کے ذریعے عام فہم اور بے حس بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مزاحمت نہ کریں۔

سادگی، قناعت، دنیا سے بے رغبتی اور روحانی گہرائی کو "ڈپریسو پرسنالٹی"، "لو موٹیویشن"، یا "لازینیس" کہہ کر کام کرنے اور مسلسل دوڑتے رہنے کے کلچر کو فروغ دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنی فطری آزادی، بے نیازی اور غیر روایتی طرزِ زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، انہیں "اے ڈی ایچ ڈی"، "بائی پولر"، یا "اوپوزیشنل ڈیفائنٹ ڈس آرڈر" جیسے لیبل دے کر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سرمایہ داری کے اصولوں کو چیلنج کرنے، دوسروں کے درد کو شدت سے محسوس کرنے اور ناانصافی پر ردعمل دینے والے افراد کو "ایموشنل ڈس ریگولیشن"، "امیچور تھنکنگ"، یا "پیرانویا" کا شکار قرار دے کر ان کی فطری مزاحمت کو غیر مؤثر کرنے کی تدبیر کی جاتی ہے۔

سرمایہ دارانہ مفادات کے خلاف جانے والی تمام خالص انسانی خصوصیات، جیسے کم بولنا، اکیلے رہنے کا رجحان، سوچ و فکر میں گہرائی، سرمایہ داری کے استحصالی اصولوں کو رد کرنا، مصنوعی خوشیوں کے جال سے بچنا، اپنی اقدار پر سمجھوتہ نہ کرنا، روایتی ملازمتوں اور زندگی کے عام دھارے کو مسترد کرنا، دنیاوی کامیابی کو سب کچھ نہ سمجھنا، اور غیر ضروری سماجی تعلقات سے کنارہ کشی کو مختلف بیماریوں یا نفسیاتی عارضوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تاکہ انہیں جبر، دوا، اور تھراپی کے ذریعے قابو میں رکھا جا سکے۔

یہ استعماری سرمایہ داری کا سب سے بڑا حربہ ہے کہ وہ ان تمام انسانی اوصاف کو بیماری بنا کر پیش کرے جو اس کی چکی میں پسنے سے روکتی ہیں، تاکہ ہر شخص اس کے استحصالی نظام کا ایک

فرمانبر دار پرزہ بن جائے اور کوئی بھی اس کے خلاف سنجیدہ مزاحمت کرنے کے قابل نہ رہے۔

استعماری سرمایہ داری نظام نے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر کئی بیماریوں کو پیدا کیا یا ان کے پھیلاؤ کو تیز تر کیا۔ یہ بیماریاں جسمانی، ذہنی اور سماجی سطح پر انسانی صحت کو نقصان پہنچاتی ہیں اور ان کی شدت سرمایہ دارانہ مفادات کے تحت مزید بڑھائی جاتی ہے تاکہ دواساز کمپنیاں، کارپوریٹ سیکٹر اور استحصالی معاشی ڈھانچے ان سے منافع کما سکیں۔

1. **ذہنی امراض:**

ڈپریشن، اینزائٹی، بائی پولر ڈس آرڈر، شیزوفرینیا، او سی ڈی، پی ٹی ایس ڈی، برن آؤٹ سنڈروم اور دیگر ذہنی عوارض سرمایہ دارانہ زندگی کے دباؤ، مسابقت، مادی خواہشات اور سوشل میڈیا پر مسلط کردہ غیر حقیقی معیارات کی وجہ سے بڑھ چکے ہیں۔

2. **نیوروڈیولپمنٹل ڈس آرڈرز:**

آٹزم، اے ڈی ایچ ڈی، ڈسلیکسیا اور دیگر اعصابی بیماریاں صنعتی آلودگی، خوراک میں مصنوعی کیمیکلز، ویکسینیشن کے غیر متوازن طریقوں اور والدین کی غیر فطری طرزِ زندگی کے نتیجے میں عام ہو چکی ہیں۔

3. **موٹاپا اور اس سے جڑی بیماریاں:**

ذیابیطس، ہائی بلڈ پریشر، دل کے امراض، فالج، جگر کی چربی، اور دیگر میٹابولک

سنڈروم فاسٹ فوڈ، پراسیسڈ خوراک، شکر اور چکنائی کے حد سے زیادہ استعمال کی وجہ سے پھیل چکے ہیں، جسے کارپوریٹ سیکٹر نے جان بوجھ کر عوام کی خوراک میں شامل کیا ہے۔

4. **کینسر اور رسولیاں:**

بڑی کارپوریشنز کی زہریلی مصنوعات، کیمیکل زدہ خوراک، پلاسٹک کا حد سے زیادہ استعمال، تابکاری آلودگی، سگریٹ اور شراب کی صنعتیں اس بیماری کو پھیلانے میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔ دواساز کمپنیاں کینسر کے مہنگے علاج سے اربوں ڈالر کماتی ہیں، جبکہ حقیقی وجوہات پر قابو پانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جاتی۔

5. **متعدی بیماریاں:**

ایچ آئی وی / ایڈز، کووڈ-19، برڈ فلو، سوائن فلو، زیکا وائرس، ایبولا اور دیگر نئی بیماریاں استعماری طاقتوں کی بائیولوجیکل تجربہ گاہوں، فیکٹری فارمنگ، حیاتیاتی ہتھیاروں کی تیاری، اور ماحولیاتی تباہی کے نتیجے میں جنم لے رہی ہیں۔

6. **سماجی بیماریاں:**

منشیات کی لت، جوا، سوشل میڈیا کی لت، ورہولزم (workaholism)، جنسی بے راہ روی، اور اخلاقی انحطاط کو جان بوجھ کر فروغ دیا جارہا ہے تاکہ عوام کو نفسیاتی اور سماجی غلامی میں رکھا جا سکے۔

7. **خواتین سے جڑے صحت کے مسائل:**

پی سی او ایس، اینڈومیٹریوسس، ہارمونی عدم توازن، ڈپریشن، پوسٹ پارٹم

ڈپریشن، اور زچگی کے مسائل سرمایہ دارانہ نظام کے دباؤ، مصنوعی ہارمونی ادویات، غیر فطری مانع حمل تدابیر، اور خواتین کے خلاف معاشی استحصال کے نتیجے میں زیادہ عام ہو گئے ہیں۔

8. **الرجیز اور خود ایمنی بیماریاں:**

دمہ، ایکزیما، سیلیک ڈس آرڈر، لیوپس، ریمٹائیڈ آرتھرائٹس، اور دیگر خود ایمنی امراض غیر فطری خوراک، اینٹی بائیو ٹکس کے حد سے زیادہ استعمال، اور کیمیکل زدہ طرزِ زندگی کے نتیجے میں پیدا ہو رہی ہیں۔

9. **دماغی بیماریاں:**

الزائمر، ڈیمنشیا، پارکنسنز، اور نیورو جیکل ڈس آرڈرز صنعتی کیمیکلز، تابکاری، موبائل فون ٹیکنالوجی، اور دماغی دباؤ کی وجہ سے بڑھ رہے ہیں۔

10. **غذائی قلت سے جڑی بیماریاں:**

وٹامن ڈی کی کمی، آئرن ڈیفیشنسی انیمیا، کیلشیم کی کمی، اور غذائیت سے خالی خوراک استعماری سرمایہ داری کے اس نظام کی پیداوار ہیں جو مہنگی لیکن غیر غذائیت بخش خوراک کو فروغ دیتا ہے اور لوگوں کو صحت مند، قدرتی غذا سے دور کرتا ہے۔

یہ تمام بیماریاں سرمایہ دارانہ استحصال، صنعتی پیداوار کے غیر انسانی طریقوں، دواساز کمپنیوں کے منافع پر مبنی ماڈل، اور جدید زندگی کے غیر فطری ماحول کے نتیجے میں پھیلی ہیں۔ استعماری سرمایہ داری بیماریوں کو کم کرنے کے بجائے ان سے کاروبار چلاتی ہے اور انسانوں کو

ایک مستقل مریض بنا کر رکھتی ہے تاکہ ان کی ضروریات سے منافع کمایا جا سکے۔ اس کے برعکس، اسلامی، فطری اور متوازن نظامِ زندگی میں صحت کو سرمایہ کاری کا ذریعہ نہیں، بلکہ انسانیت کی خدمت سمجھا جاتا ہے۔

کم آمدنی والے افراد اپنی صحت کو بہتر بنانے کے لیے مہنگی دوائیوں اور ہسپتالوں پر انحصار کیے بغیر کئی سستے اور عملی اقدامات کر سکتے ہیں۔ خوراک میں تبدیلی لانا ایک اہم قدم ہے۔ فاسٹ فوڈ اور پراسیس شدہ خوراک کو ترک کر کے گھریلو، سادہ اور متوازن غذا اپنانا ضروری ہے۔ چینی، سفید آٹا اور بازار کے تیل کے بجائے دیسی گھی، سرسوں کا تیل اور دیسی گندم کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مصنوعی مشروبات کی جگہ نیم، ادرک، دار چینی، شہد اور لیمن سے تیار کردہ قدرتی مشروبات اپنانا فائدہ مند ہو گا۔ زیادہ پانی پینا اور کم از کم ایک وقت بغیر چائے اور چینی کے ناشتہ کرنا بھی صحت کے لیے مفید ہے۔

گھریلو اور فطری علاج کو اپنانا بیماریوں سے بچاؤ کا ایک بہترین طریقہ ہے۔ ہلدی، کلونجی، ادرک، لہسن اور شہد کا استعمال عام بیماریوں کے خلاف قدرتی دوا کے طور پر کیا جا سکتا ہے۔ معدے کی بیماریوں سے نجات کے لیے سونف، اجوائن اور دہی کا استعمال مفید ہو گا، جبکہ جلد کی بیماریوں کے لیے نیم، ملتانی مٹی اور ایلوویرا کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جوڑوں اور پٹھوں کے درد کے لیے سرسوں کے تیل میں نمک ملا کر مالش کرنا فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔

جسمانی سرگرمی اور ورزش کو روزمرہ کی زندگی کا حصہ بنانا ضروری ہے۔ روزانہ کم از کم تیس منٹ پیدل چلنا، سیڑھیاں چڑھنا اور ہلکی ورزش کرنا جسم کو صحت مند رکھنے میں مدد دے

سکتا ہے۔ فجر کے وقت سیر کرنے سے سورج کی روشنی بھی حاصل ہوتی ہے، جو ہڈیوں کی مضبوطی کے لیے ضروری ہے۔ زیادہ دیر بیٹھنے سے گریز کرنے اور گھر کے کاموں میں خود کو مصروف رکھنے سے جسمانی اور ذہنی توانائی برقرار رہتی ہے۔

دماغی سکون اور ذہنی صحت کے لیے نیند کی بہتری پر توجہ دینا ضروری ہے۔ موبائل اور سکرین کا استعمال مغرب کے بعد کم کر دینا، رات کو جلدی سونا اور شور والی جگہوں سے بچنا ذہنی سکون کے لیے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ قرآن کی تلاوت، ذکر، دعا اور تفکر کی عادت ڈالنے سے ذہنی دباؤ میں کمی آتی ہے اور روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔ دوسروں سے حسد کرنے اور غیر ضروری مقابلہ کرنے کی بجائے قناعت اور سادگی اپنانا دماغی اطمینان کے لیے مفید ہے۔

علاج کے لیے دوائیوں پر مکمل انحصار کرنے کے بجائے نیچرل اور سستے طریقے اپنانے سے بہتر نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ جڑی بوٹیوں کا استعمال دوا کے متبادل کے طور پر کیا جاسکتا ہے۔ دیسی اور روایتی طریقہ علاج جیسے یونانی، ہومیوپیتھی اور طب نبوی کے اصولوں کو اپنانے سے مہنگے علاج کی ضرورت کم ہو جاتی ہے۔ خوراک میں حکمت کے اصولوں کے مطابق جڑی بوٹیوں کا استعمال کئی بیماریوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

خواتین کو صحت کے مسائل کا سامنا زیادہ ہوتا ہے، لیکن سادہ گھریلو تدابیر سے انہیں حل کیا جاسکتا ہے۔ ہارمونی عدم توازن اور پیریڈز کی بے قاعدگی کو ٹھیک کرنے کے لیے دیسی گھی، السی کے بیج اور سونف کا استعمال فائدہ مند ہے۔ مصنوعی دوائیوں کے بجائے نیم، تلسی اور

اجوائن کے قہوے سے بہتر نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ حمل اور زچگی کے دوران قدرتی طریقوں کا اپنانا اور غیر ضروری دوائیوں سے پرہیز کرنا خواتین کی صحت کے لیے زیادہ محفوظ اور فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔

ماحولیاتی بہتری اور صحت کے تحفظ کے لیے چند بنیادی اصول اپنانا ضروری ہے۔ کیمیکل زدہ صابن اور شیمپو کے بجائے دیسی صابن، بیسن اور ملتانی مٹی کا استعمال جلد کے لیے محفوظ ہے۔ پلاسٹک کے برتنوں کے بجائے مٹی، تانبا اور اسٹیل کے برتن استعمال کیے جائیں تو صحت بہتر رہ سکتی ہے۔ گھروں میں مصنوعی خوشبو اور ایئر فریشنر کے بجائے قدرتی اجزاء جیسے لیموں، عرق گلاب اور لوبان کا استعمال صحت مند ماحول فراہم کرتا ہے۔

زندگی کو سادہ بنانا بھی صحت اور ذہنی سکون کے لیے ضروری ہے۔ غیر ضروری قرض لینا، قسطوں پر خریداری کرنا اور مہنگے شوق پالنے کے بجائے قناعت اور کفایت شعاری اپنائی جائے تو زندگی میں برکت آ سکتی ہے۔ فضول سوشل میڈیا، ٹی وی اور غیر ضروری تفریح میں وقت ضائع کرنے کی بجائے مطالعہ کرنے، محنت کرنے اور بچوں کو اچھی عادتیں سکھانے پر توجہ دی جائے تو مستقبل بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ نیچرل طرز زندگی اختیار کرنے سے بڑی بیماریوں سے بچا جا سکتا ہے اور مہنگی دوائیوں اور ہسپتال کے اخراجات کم کیے جاسکتے ہیں۔

چینی طریقہ علاج، ریکی، ریفلیکسولوجی اور دیگر متبادل طریقہ علاج کو پرکھنے کے لیے ان کے اصل اصول، پسِ منظر اور فلسفے کو سمجھنا ضروری ہے۔ استعماریت سے مراد وہ نظریات اور

نظام ہیں جو طاقتور اقوام نے کمزور اقوام پر مسلط کیے تاکہ ان کی تہذیب، سوچ، معیشت اور اقدار پر قابو پایا جا سکے۔ اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو یہ طریقے براہِ راست استعماری نہیں لگتے، کیونکہ ان کی جڑیں زیادہ تر قدیم روایات، تجربات اور مقامی حکمت پر مبنی ہیں۔

چینی طب ہزاروں سال پرانا علاج ہے جو انسانی جسم میں توانائی کے بہاؤ (Qi) کے نظریے پر مبنی ہے۔ اس میں جڑی بوٹیوں، ایکیوپنکچر، مساج اور دیگر طریقے شامل ہیں۔ چونکہ یہ طریقہ علاج فطری اصولوں اور جسمانی توازن پر زور دیتا ہے، لہٰذا اسے استعماری کہنا درست نہیں ہوگا۔ البتہ، اگر جدید مغربی کمپنیوں نے اسے تجارتی بنا کر مہنگا کر دیا ہو تو اس پہلو پر غور کرنا چاہیے۔

ریکی ایک جاپانی توانائی پر مبنی علاج ہے جس میں ہاتھوں کے ذریعے "ہیلتھ انرجی" کو جسم میں بہایا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد بدھ مت اور جاپانی روحانی نظریات پر ہے۔ اس میں کچھ ایسے تصورات شامل ہیں جو اسلامی توحیدی عقیدے سے مطابقت نہیں رکھتے، جیسے "کائناتی توانائی سے علاج" وغیرہ۔ اس لیے اس کا استعمال محتاط انداز میں کرنا چاہیے اور اس کے فلسفیانہ پہلو کو نظرانداز کر کے محض جسمانی سکون کے طور پر دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ریفلیکسولوجی ایک ایسا طریقہ علاج ہے جس میں جسم کے مختلف حصوں، خاص طور پر ہاتھوں اور پیروں پر دباؤ ڈال کر بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ یہ قدیم چینی، مصری اور یونانی طب سے ماخوذ ہے اور اس کا کوئی استعماری پس منظر نہیں ہے۔ اگرچہ سائنسی طور پر اس کے تمام فوائد ثابت نہیں ہوئے، لیکن اسے عام مساج کی طرح مفید سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ طریقہ علاج براہ راست استعماریت کا حصہ نہیں ہیں، کیونکہ ان کی بنیاد مغربی سامراجی طاقتوں کے بجائے قدیم اقوام کی روایات میں ہے۔ لیکن آج کل کے تجارتی نظام میں بعض متبادل طریقہ علاج کو ایک نئی انڈسٹری میں تبدیل کر دیا گیا ہے، جہاں یہ عام آدمی کے لیے مہنگے اور غیر ضروری ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس پہلو سے دیکھیں تو استعماریت کا بالواسطہ اثر ضرور پڑا ہے، کیونکہ مغربی کمپنیاں ان روایتی علوم کو کمرشلائز کر کے ان سے منافع کماتی ہیں۔

اگر کوئی طریقہ علاج اسلامی عقائد کے خلاف نہ ہو اور واقعی فائدہ مند ہو، تو اس کا استعمال جائز ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اسے حقیقت پسندانہ انداز میں اپنایا جائے اور خرافات سے بچا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام نے بھی قدرتی اجزاء اور روایتی طریقہ علاج کو اپنانے کی تلقین فرمائی، لہٰذا جو بھی علاج انسانی صحت کے لیے مؤثر ہو اور شرعی حدود کے اندر ہو، اسے اپنایا جا سکتا ہے۔

اسلام کیلئے زحمتیں اٹھانا

دنیا کی حقیقت یہی ہے کہ یہ دار الامتحان ہے، جہاں انسان کو قدم قدم پر آزمائشوں، مشکلات اور زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ مشکلات کبھی ظاہری ہوتی ہیں اور کبھی باطنی، کبھی جسمانی تو کبھی روحانی، کبھی مالی تو کبھی ذہنی اور جذباتی۔ کوئی شخص ایسا نہیں جو ان سے بچ سکے، کیونکہ اللہ نے اس دنیا کو ایسا ہی بنایا ہے کہ یہاں راحت اور سکون ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ عارضی ہے۔ یہاں کے حالات بدلتے رہتے ہیں، وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا، اور ہر انسان کو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی آزمائش سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان ان مشکلات کو کیوں اور کس مقصد کے تحت برداشت کر رہا ہے؟ اگر اس کی پریشانیاں صرف دنیاوی فوائد کے لیے ہیں، اگر وہ صرف دنیا کی خواہشات، مال و دولت، شہرت، عزت یا طاقت کے لیے مشکلات جھیل رہا ہے، تو یہ سب وقتی اور فانی چیزیں ہیں۔ ان کا انجام بھی فنا ہے اور ان کے لیے اٹھائی گئی زحمتوں کا صلہ بھی محدود اور مختصر ہے۔ دنیا میں کامیابی کے لیے محنت کرنا بُرا نہیں، لیکن اگر یہ محنت اور قربانی کسی بڑے اور ابدی مقصد کے بغیر ہو، تو اس کا فائدہ بھی صرف دنیا تک ہی محدود رہتا ہے۔ لیکن اگر یہی مشکلات، زحمتیں اور تکالیف کسی بلند تر مقصد، کسی برتر حقیقت اور کسی دائمی

کامیابی کے لیے برداشت کی جائیں، تو یہی آزمائشیں انسان کے لیے باعثِ عزت، رحمت اور نجات بن جاتی ہیں۔

اسلام ہمیں یہی درس دیتا ہے کہ اگر آزمائشیں آنی ہی ہیں، اگر مشکلات سے بچا نہیں جاسکتا، تو کیوں نہ انہیں اللہ کی رضا کے لیے قبول کیا جائے؟ کیوں نہ انہیں اسلام کی خدمت اور دین کی سربلندی کے لیے جھیلا جائے؟ کیوں نہ ان زحمتوں کو اللہ کی راہ میں ایثار و قربانی میں بدل دیا جائے تاکہ یہ ہماری آخرت سنوار سکیں اور ہمیں اس منزل تک پہنچا سکیں جہاں دائمی راحت اور حقیقی کامیابی ہمارا انتظار کر رہی ہے؟

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ بار بار یہ اصول واضح کرتا ہے کہ جنت، کامیابی، اور اللہ کی رضا انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو آزمائشوں میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ اللہ نے دنیا میں کبھی بھی کسی مومن کو یہ وعدہ نہیں دیا کہ وہ بغیر کسی امتحان کے جنت میں داخل ہو جائے گا، بلکہ قرآن میں صاف فرمایا گیا ہے کہ جنت ان کے لیے ہے جو مشکلات اور آزمائشوں سے گزرتے ہیں، جو تکلیفیں سہتے ہیں، جو اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ سورہ بقرہ میں اللہ فرماتا ہے:

"کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے جبکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں آئے جو تم سے پہلے گزرے ہوؤں پر آئے؟ انہیں سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ ہلا کر رکھ دیے گئے یہاں تک کہ رسول

اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ خبردار! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔ "(البقرہ2:214)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ مشکلات اور تکلیفیں ایمان کا لازمی حصہ ہیں۔ اگر دنیا میں ایمان کے ساتھ زندگی گزارنی ہے، اگر حق کے ساتھ جینا ہے، اگر سچائی پر ثابت قدم رہنا ہے، تو اس کے لیے قربانیاں دینا پڑیں گی، مشکلات جھیلنی پڑیں گی، تکالیف برداشت کرنی پڑیں گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر نبی، ہر ولی، ہر صالح انسان نے اللہ کی راہ میں قربانیاں دیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے دین کی سربلندی کے لیے زحمتیں اٹھائیں، امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں سب کچھ قربان کر دیا، صحابہ و اولیاء نے سختیوں کا سامنا کیا، مگر ان کے لیے سب سے بڑی کامیابی یہی تھی کہ وہ اللہ کی رضا کے طلبگار تھے۔

اگر مشکلات برداشت کرنی ہی ہیں، اگر پریشانیاں آنی ہی ہیں، اگر زندگی میں آزمائشیں ناگزیر ہیں، تو کیوں نہ ہم ان سب کو کسی اعلیٰ اور بامقصد راہ میں صرف کریں؟ کیوں نہ ہم اپنی زندگی کو اسلام کے اصولوں کے مطابق گزاریں اور ہر مصیبت کو اللہ کے دین کی خدمت کے لیے قبول کریں؟ اگر ہماری زحمتیں صرف دنیا کے لیے ہیں، تو ان کا فائدہ بھی صرف دنیا تک ہے۔ لیکن اگر ہماری زحمتیں اسلام کے لیے، اللہ کی رضا کے لیے، آخرت کی کامیابی کے لیے ہیں، تو یہ زحمتیں ہمارے لیے دائمی سعادت اور کامیابی کا ذریعہ بن جائیں گی۔

یہی وہ سوچ ہے جو انسان کو دنیا کی ناپائیداری سے نکال کر حقیقت کی طرف لے جاتی ہے۔ یہی وہ فکر ہے جو پریشانیوں کو رحمت میں بدل دیتی ہے، مشکلات کو قربتِ الٰہی کا ذریعہ بنا دیتی ہے، اور زحمتوں کو آخرت کی خوشخبری میں بدل دیتی ہے۔ لہٰذا، اگر مشکلات سے گزرنا مقدر ہے، تو کیوں نہ ان مشکلات کو اللہ کی رضا کے لیے برداشت کریں، تاکہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکیں؟

ہر چیز کو آزمائش کے طور پر دیکھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی مالی پریشانی یا صحت کا مسئلہ درپیش ہو، تو اسے محض اتفاق یا بدنصیبی نہ سمجھا جائے بلکہ اللہ کی طرف سے امتحان مان کر صبر اور رضا کے ساتھ اس کا سامنا کیا جائے۔ انسان جب یہ یقین کر لے کہ ہر مشکل اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے، تو وہ اس کے حل کے لیے دنیاوی اسباب کے ساتھ ساتھ اللہ کی طرف بھی رجوع کرتا ہے۔

دعا اور توکل کا اصول بھی انتہائی اہم ہے۔ مشکلات میں محض دنیاوی وسائل پر بھروسہ کرنے کے بجائے اللہ سے مدد طلب کی جائے اور اس پر مکمل بھروسہ رکھا جائے۔ دعا بندے کو اللہ سے جوڑتی ہے اور اس کے دل کو سکون بخشتی ہے۔ قرآن میں واضح کیا گیا ہے کہ جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے اور ایسے دروازے کھول دیتا ہے جہاں سے وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

دنیاوی اسباب اور اسلامی تعلیمات کا امتزاج اختیار کیا جائے۔ محض دعا کافی نہیں بلکہ عملی اقدامات بھی ضروری ہیں۔ اگر بیماری ہے تو علاج کیا جائے، اگر مالی تنگی ہے تو محنت کی

جائے، مگر ساتھ ہی اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے رزق میں برکت کے لیے صدقہ دیا جائے اور اللہ سے مدد طلب کی جائے۔

صبر اور مثبت سوچ کو اپنانا بھی لازمی ہے۔ اگر کسی مسئلے کو دنیاوی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ مایوسی اور ذہنی دباؤ کا سبب بن سکتا ہے، لیکن اگر اسی مسئلے کو دینی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ ایک موقع بن جاتا ہے کہ انسان اللہ کے قریب ہو سکے، اپنے اعمال کا محاسبہ کر سکے اور صبر کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کر سکے۔ صبر کرنے والے بندے اللہ کے چنے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے درجات بلند کیے جاتے ہیں۔

مشکلات کو اجر اور درجات میں اضافے کا ذریعہ سمجھنا چاہیے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ ہر تکلیف کے بدلے میں گناہ معاف ہوتے ہیں اور درجات بلند ہوتے ہیں۔ مومن کے لیے ہر پریشانی باعثِ رحمت بن سکتی ہے، اگر وہ اس پر صبر کرے اور اللہ کی رضا کے ساتھ اسے قبول کرے۔ یہی سوچ مشکلات کو زحمت کے بجائے رحمت میں بدل دیتی ہے اور مادی پریشانیوں کو روحانی ترقی کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔

اسلام، فطرت اور جبر

اسلام کو دینِ فطرت کہا گیا ہے، یعنی اس کی تعلیمات انسانی سرشت سے ہم آہنگ ہیں اور کسی خارجی جبر کی محتاج نہیں۔ اگر کوئی چیز واقعی فطری ہو تو اسے مسلط کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ انسان خود بخود اسے قبول کرتا ہے۔ اس کے برعکس، جہاں سختی اور جبر کی ضرورت پڑے، وہاں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ وہ چیز انسانی طبیعت کے خلاف ہے، اور اسے قبول کرانے کے لیے بیرونی دباؤ درکار ہے۔

قرآن مجید اسی اصول کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہے: "لَآ إِكْرَاهَ فِى ٱلدِّينِ" (دین میں کوئی جبر نہیں)۔ یہ اعلان اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ دین دلیل اور بصیرت کا مطالبہ کرتا ہے، نہ کہ جبر اور سختی کا۔ اگر ہدایت کا راستہ حقیقتاً روشن اور واضح ہو، تو کسی کو مجبور کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جو چیز عقل اور فطرت کے مطابق ہو، وہ انسان کے ذہن و دل میں از خود اتر جاتی ہے، جبکہ جو چیز غیر فطری ہو، اس پر سختی کرنی پڑتی ہے، اور سختی عموماً مزاحمت کو جنم دیتی ہے۔

انسانی نفسیات یہ بتاتی ہے کہ جبر سے قبول کیا گیا عقیدہ دیرپا نہیں ہوتا، بلکہ دل میں بغاوت پیدا کرتا ہے۔ بچے کی مثال لے لیجیے، اگر کسی چیز کو محبت، وضاحت اور دلیل سے سمجھایا جائے تو وہ اسے بہ آسانی قبول کر لیتا ہے، لیکن اگر کسی چیز کو سختی اور زبردستی کے ذریعے مسلط کیا جائے تو وہ ظاہری طور پر مان بھی لے، تب بھی اندرونی طور پر وہ اس کے خلاف ہوتا ہے۔ یہی اصول دین اور عقیدے پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ دین کا معاملہ فطری کشش اور اندرونی تسلیم سے جڑا ہوا ہے، اور اگر یہ کشش ختم ہو جائے یا اس پر جبر کا سایہ پڑ جائے، تو دلوں میں دین کے خلاف بے زاری پیدا ہو جاتی ہے۔

جہاد اور سختی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جہاد میں سختی ایک دفاعی نوعیت کی چیز ہے، جو فکری نہیں بلکہ عملی ہے۔ جب باطل کھلے دل و دماغ سے حق کو سننے اور سمجھنے سے انکار کر دے اور ہٹ دھرمی پر اتر آئے، جب حق کے راستے میں طاقت سے رکاوٹیں کھڑی کی جائیں، تو پھر جہاد لازم آتا ہے۔ لیکن یہ سختی، علمی مکالمے میں نہیں بلکہ ظلم اور جبر کو مٹانے کے لیے ہے۔ قرآن میں اکثر مقامات پر پہلے دلیل، حکمت اور بصیرت کی دعوت دی گئی، اور جب مخاطب اپنی ہٹ دھرمی پر اتر آیا، تب جہاد کا حکم دیا گیا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام پہلے مرحلے میں ذہنوں کو روشن کرنا چاہتا ہے، لوگوں کو قائل کرنا چاہتا ہے، اور اگر کوئی علم کی روشنی میں بھی جان بوجھ کر باطل پر اصرار کرے اور حق کو دبانے کے لیے ظلم کا سہارا لے، تو پھر عملی اقدام کیا جاتا ہے۔

علم کے معاملے میں سختی کو ہمیشہ ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے، کیونکہ علم کا تعلق تفکر اور دلیل سے ہے، نہ کہ جبر سے۔ جو علم زبردستی دیا جائے، وہ ذہن میں مستقل نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم (ص) نے ہمیشہ نرمی، حکمت اور محبت کے ذریعے دین کی تعلیم دی۔ حضرت علی (ع) کا یہ قول اس حقیقت کو مزید واضح کرتا ہے: "لَا تُكْرِهُوا أَوْلَادَكُمْ عَلَى آثَارِكُمْ فَإِنَّهُمْ مَخْلُوقُونَ لِزَمَانٍ غَيْرِ زَمَانِكُمْ" (اپنی اولاد کو اپنے طور طریقوں پر مجبور نہ کرو، کیونکہ وہ ایک الگ زمانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں)۔ اس فرمان میں نہ صرف وقت کی تبدیلی کو تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ جبر سے کوئی بھی چیز مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی۔

عملی معاملات میں سختی کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ جب کسی چیز کی حقیقت سمجھ میں آ جائے، عقل اور دلیل اسے تسلیم کر لے، تو پھر اس پر عمل کی سختی کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ سختی بھی درحقیقت خود پر قابو پانے اور نظم و ضبط کو اپنانے کی ہوتی ہے، نہ کہ کسی پر جبر کرنے کی۔ نماز، روزہ، اور دیگر اسلامی فرائض کا تقاضا یہی ہے کہ جب انسان حقیقت کو جان لے، تو اس پر استقامت بھی اختیار کرے۔ البتہ، یہاں بھی سختی کا مفہوم جبر نہیں بلکہ ذمہ داری کی سنجیدگی ہے۔

دینِ اسلام ایک ایسا نظامِ حیات پیش کرتا ہے جو فطرت کے اصولوں کے مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فکری معاملات میں نرمی، وضاحت اور حکمت کو اختیار کرتا ہے اور جب کوئی شعوری طور پر باطل پر ڈٹ جائے اور راہِ حق میں روڑے اٹکائے، تب سختی اور مزاحمت کا

مرحلہ آتا ہے۔ اس لیے اگر کسی جگہ سختی کی جا رہی ہو، تو یہ سوچنا چاہیے کہ آیا وہ سختی علم و دلیل کے بغیر کسی نظریے کو مسلط کرنے کے لیے ہے یا ظلم کے خلاف مزاحمت کے طور پر۔ یہی فرق انسان کو سمجھنا چاہیے تاکہ وہ دین کی اصل روح کو پہچان سکے اور اس کی تعلیمات کو بہتر انداز میں اپنے اور دوسروں کے لیے قابلِ قبول بنا سکے۔

انسان کی سب سے بڑی دولت اس کا علم ہے، اور سب سے بڑی محرومی جہل۔ جو شخص کسی چیز کو نہیں جانتا، وہ گویا روشنی سے محروم ہے اور راہِ عمل میں بے یقینی کا شکار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہمیشہ علم کی جستجو کو عبادت کے درجے پر رکھا ہے۔ نبی اکرم (ص) نے فرمایا: "طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة" (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے)۔ اس فرمان میں یہ واضح کیا گیا کہ علم کا حصول ایک اختیاری عمل نہیں، بلکہ ایک ذمہ داری ہے۔

محرومی دو طرح کی ہوتی ہے: ایک وہ جو قدرتی ہے، یعنی ایک شخص کسی چیز سے واقف نہیں لیکن وہ سیکھنا چاہتا ہے، وہ اس کے لیے جستجو رکھتا ہے۔ ایسے شخص کو محروم نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ ایک متلاشی ہے، ایک سیکھنے والا ہے۔ قرآن مجید نے ایسے لوگوں کے لیے ہمیشہ دروازے کھولے اور انہیں سیکھنے کے مواقع دیے، کیونکہ ہدایت اس کے نصیب میں ہوتی ہے جو اسے چاہتا ہو۔

لیکن دوسری قسم کی محرومی وہ ہے جو شیطانی فریب اور تکبر کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ خود سیکھتے ہیں اور نہ دوسروں کو سیکھنے دیتے ہیں۔ قرآن مجید ایسے لوگوں کو سخت وعید سناتا ہے :

"اِ نَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ "(البقرہ 2:174)

جو لوگ اس علم کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے نازل کیا ہے اور اس کے بدلے معمولی قیمت لے لیتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔

یہاں علم کو چھپانے اور تعلیم میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو ایک مجرم کے طور پر پیش کیا گیا ہے، کیونکہ وہ اپنی جہالت کو دوسروں پر بھی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے افراد کو قرآن ظالم اور مجرم قرار دیتا ہے، کیونکہ وہ انسانی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں۔

نفسیاتی طور پر، جو شخص خود سیکھنا نہیں چاہتا، وہ دوسروں کو بھی علم حاصل کرنے سے روکتا ہے تاکہ وہ برتری کا احساس برقرار رکھ سکے۔ یہ وہی نفسیاتی کیفیت ہے جس کا شکار شیطان تھا۔ اس نے خود حق کو تسلیم نہیں کیا اور نہ چاہا کہ کوئی اور اسے تسلیم کرے، بلکہ انسان کو بھی گمراہی میں دھکیلنا چاہا۔ یہی رویہ دنیا کے ظالم حکمرانوں، جابروں اور جہالت کو پھیلانے والوں کا ہوتا ہے کہ وہ عام لوگوں کو بھی تعلیم سے محروم رکھتے ہیں تاکہ ان پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں۔

اس لیے جو شخص علم سے محروم ہے لیکن سیکھنا چاہتا ہے، وہ مسکین اور قابلِ رحم ہے۔ اس کی مدد کی جانی چاہیے، اس پر سختی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اسے راستہ دکھانا چاہیے۔ لیکن جو شخص جان بوجھ کر تعلیم میں رکاوٹ بنے، دوسروں کو گمراہی میں ڈالے، یا حق کو چھپائے، وہ مجرم ہے اور ایسے شخص کی گوشمالی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور سنت میں جاہلوں کو تعلیم دینے کی تلقین کی گئی، مگر متکبر اور علم کے دشمنوں کے ساتھ سختی کا رویہ اپنانے کا حکم دیا گیا۔

یہ اصول نہ صرف دینی تعلیم بلکہ دنیاوی تعلیم پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ آج کے دور میں وہ قوتیں جو تعلیمی وسائل پر قبضہ جمائے بیٹھی ہیں، جو حقیقی علم کو عام لوگوں تک پہنچنے نہیں دیتیں، یا جو تعلیم کو مخصوص نظریات تک محدود رکھنا چاہتی ہیں، وہ سب اسی مجرمانہ رویے میں شامل ہیں۔ علم کو محدود کرنا، معلومات کو چھپانا، اور سچائی تک رسائی میں رکاوٹ ڈالنا ایک ایسا جرم ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کو پستی میں دھکیل دیتا ہے۔

نتیجہ یہی ہے کہ جو محروم ہے، مگر سیکھنے کی خواہش رکھتا ہے، وہ تعاون اور شفقت کا مستحق ہے۔ لیکن جو علم کو دبانے والا اور تعلیم کا دشمن ہے، وہ مجرم ہے اور اسے اس جرم کا حساب دینا ہوگا۔

تعلیم و تربیت انسان کی شخصیت سازی کا بنیادی ذریعہ ہے، اور اگر یہ صحیح انداز میں انجام دی جائے تو کسی بھی معاشرے میں سختی، جبر اور حتیٰ کہ جنگ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسی

لیے اسلامی تعلیمات میں تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اسے انسانی فطرت کے مطابق قرار دیا گیا ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے، اور فطرت ہمیشہ نرمی، تدریج اور حکمت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ کوئی بھی فطری عمل زبردستی کے ساتھ مسلط نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جو چیز انسان کے اندر پہلے سے موجود ہو، وہ خود بخود ابھر کر سامنے آتی ہے اگر اسے صحیح مواقع اور ماحول ملے۔ یہی وجہ ہے کہ سیکھنے اور حق کی دعوت دینے کے مرحلے میں جبر و سختی غیر فطری ہے۔

رسول اکرم (ص) اور آئمہ معصومین (ع) نے ہمیشہ حکمت، شفقت اور بصیرت کے ذریعے تعلیم و تربیت کو فروغ دیا۔ ان کی مجالس میں آنے والا جاہل، دانا بن کر اٹھتا تھا، اور جو شخص ہدایت سے دور تھا، وہ خود اپنی طلب کے ذریعے راہِ راست پر آتا تھا۔ یہی تعلیم و تربیت کا اثر ہے کہ جب ایک شخص حقیقی طور پر سیکھ لیتا ہے، تو وہ اپنی شخصیت اور کردار کو خدائی نظام کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ "اگر تعلیم و تربیت درست انجام دی جائے تو جہاد کی ضرورت ہی نہیں رہتی"۔ اس فرمان کا گہرا مفہوم یہ ہے کہ جنگ اور سختی دراصل اس وقت ضروری ہوتی ہے جب معاشرے میں جہالت، ناانصافی اور غیر منصفانہ رویے پنپنے لگیں۔ لیکن اگر ابتدا ہی سے انسان کی شخصیت کو حکمت، اخلاق اور ذمہ داری کے ساتھ سنوار دیا جائے، تو وہ

خود بخود ایک صالح شہری بن جاتا ہے اور معاشرے میں کسی قسم کی سختی یا جبر کی ضرورت نہیں پڑتی۔

نفسیاتی لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ انسان جو تربیت کے بغیر بڑا ہوتا ہے، اکثر اپنی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے، اور جب اسے کسی ضابطے یا قانون کے تحت لانے کی کوشش کی جاتی ہے، تو وہ مزاحمت کرتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر بچپن سے ہی اسے محبت، دلیل اور سمجھ بوجھ کے ساتھ تعلیم و تربیت دی جائے، تو وہ فطری طور پر ایک ذمہ دار اور معاشرے کا فائدہ مند فرد بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہمیشہ اصلاحِ نفس، تربیتِ کردار اور تعلیم کو ترجیح دی، اور جنگ کو ایک آخری حل کے طور پر رکھا۔ قرآن ہمیں انبیاء کے قصے سناتا ہے، جہاں انہوں نے اپنی قوموں کو صبر، حکمت اور نرمی کے ساتھ حق کی دعوت دی۔ جب تک قوموں میں سیکھنے اور اصلاح کی گنجائش موجود رہی، تب تک انہیں موقع دیا گیا، لیکن جب وہ ہٹ دھرمی اور سرکشی پر اتر آئیں اور سچ کو دبانے لگیں، تب ان کے خلاف سخت اقدامات کیے گئے۔

یہ اصول ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اگر کسی فرد یا معاشرے میں اصلاح کرنی ہے، تو سب سے پہلا اور مؤثر راستہ تعلیم اور تربیت ہے۔ اگر ہم کسی بھی قوم یا فرد میں حقیقی تبدیلی چاہتے ہیں، تو اسے جبر سے نہیں بلکہ فطری طور پر اس سمت میں لے جانا ہوگا جسے وہ اپنی عقل اور

دل سے قبول کرے۔ یہی تعلیم و تربیت کی طاقت ہے، جو کسی بھی سختی سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے اور حقیقی تبدیلی پیدا کرتی ہے۔

امپورٹڈ اور لوکل کا تنازعہ

ہمارے معاشرے میں امپورٹڈ اشیاء کی غیر معمولی پذیرائی اور مقامی مصنوعات کی عدم مقبولیت ایک گہرا سماجی مسئلہ ہے جو نہ صرف ہماری اقتصادی پالیسیوں بلکہ فکری و نظریاتی ترجیحات کو بھی متاثر کرتا ہے۔ ہم جب کسی خریداری کے مرکز میں داخل ہوتے ہیں تو ہماری اولین ترجیح بین الاقوامی برانڈز ہوتی ہے۔Puma ، Reebok، Skechers، Ralph Lauren، Tommy Hilfiger، Armani، Versace اور Gucci جیسے نام ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں، جبکہ مقامی سطح پر تیار کردہ مصنوعات کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ رجحان صرف ملبوسات اور جوتوں تک محدود نہیں بلکہ خوراک سے لے کر زندگی کے دیگر معاملات تک پھیلا ہوا ہے۔

ہماری روزمرہ زندگی میں درآمد شدہ مصنوعات کی اہمیت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ ہم نے مقامی اشیاء کو نظر انداز کرنے کی عادت بنالی ہے۔مارکیٹ میں اگر دو یکساں معیار کی چیزیں موجود ہوں، ایک مقامی اور دوسری غیر ملکی، تو زیادہ تر لوگ بلا جھجک غیر ملکی مصنوعات کو فوقیت دیں گے۔ یہ رویہ نہ صرف ہماری معیشت کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ ہماری قومی شناخت اور خود انحصاری کے خلاف بھی ہے۔ اگر ہم اپنے وسائل اور ہنر کو ترقی دینے کے بجائے دوسروں پر انحصار کرتے رہیں گے تو ہماری مقامی صنعت کبھی مستحکم نہیں ہو سکے گی۔

یہ رجحان محض تجارتی مصنوعات تک محدود نہیں، بلکہ ہمارے فکری اور نظریاتی دائرے میں بھی سرایت کر چکا ہے۔ ہم نہ صرف غیر ملکی اشیاء بلکہ غیر ملکی افکار، قیادت اور علمی شخصیات کو بھی مقامی ماہرین اور رہنماؤں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں مقامی علماء، دانشوروں اور سیاسی و سماجی رہنماؤں کی قدر کم کی جاتی ہے، جبکہ غیر ملکی مفکرین، سیاستدانوں اور مذہبی رہنماؤں کی تقلید کو قابل فخر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مقامی شخصیت بین الاقوامی سطح پر پہچان حاصل کر لے تبھی ہم اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں، ورنہ ہماری نظر میں اس کی حیثیت ثانوی رہتی ہے۔

یہ صورت حال ہماری فکری غلامی اور احساسِ کمتری کی عکاسی کرتی ہے۔ ہمیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ ترقی اور کامیابی کا راز غیر ملکی افکار اور قیادت میں ہے، حالانکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہر قوم نے اپنی روایات، تہذیب اور مقامی وسائل کو بروئے کار لا کر ترقی کی ہے۔ جاپان، چین، کوریا اور دیگر کئی ممالک نے اپنی زبان، ثقافت اور مقامی صنعتوں کو فروغ دے کر خود کفالت حاصل کی، جبکہ ہم اب تک دوسروں پر انحصار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

یہ طرز فکر ہمیں اس نہج پر لے آیا ہے کہ ہم نہ صرف امپورٹڈ مصنوعات کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ اپنی ثقافت اور اقدار کو بھی ثانوی حیثیت دینے لگے ہیں۔ غیر ملکی طرزِ زندگی کو اپنانا، ان کی زبان کو معیار سمجھنا، ان کے رہن سہن کو مثالی تصور کرنا اور اپنے مذہبی و ثقافتی اصولوں کو دقیانوسی قرار دینا اسی ذہنیت کی پیداوار ہے۔ دین کے معاملے میں بھی ہم نے یہی طرزِ فکر اپنایا ہے۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا ہے جو دین کی قدیم تعلیمات کو مانتا ہے

لیکن جدید روحانی اور فکری تشریحات، جو ایران، عراق یا لبنان میں ہوتی ہیں، کو قبول نہیں کرتا۔ جبکہ دوسرا طبقہ وہ ہے جو قدیم تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان جدید تشریحات کو بھی تسلیم کرتا ہے مگر وہ مقامی علماء و مجتہدین کو نظر انداز کرتا ہے اور غیر ملکی قیادت کو ہی واحد معیار مانتا ہے۔

دین تو آفاقی ہے، ہمارے لیے رسول و ائمہ (ع) کا تعلق کسی مخصوص سرزمین سے نہیں بلکہ ان کی تعلیمات کی جامعیت اور حقانیت ہمیں انہیں ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن اگر ہم دینی تفہیم میں ایک خاص قوم یا خطے کی تشریح کو ہی واحد معیار مان لیں اور اپنی فکری و علمی ترقی کو پس پشت ڈال دیں تو یہ بھی فکری غلامی کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ ترقی کا صحیح راستہ وہ ہے جہاں ہم عالمی فکری مثبتات سے سیکھیں مگر مقامی علماء و مجتہدین کی علمی کاوشوں کو بھی نظر انداز نہ کریں۔ اگر کسی دوسری قوم میں زیادہ فکری یا سائنسی ٹیلنٹ ہے تو ہمیں احساس کمتری میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنی صفوں میں بھی ایسا ٹیلنٹ پیدا کرنا چاہیے تاکہ ہم فکری خود مختاری حاصل کر سکیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی سوچ کو بدلے اور مقامی سطح پر پیدا ہونے والی اشیاء، افکار اور دینی و ثقافتی روایات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔ اگر ہم واقعی ترقی چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی صنعتوں، اپنے مفکرین، اپنے قائدین، اپنے علماء اور اپنی روایات کی قدر کرنی ہو گی۔ جب ہم خود پر بھروسہ کرنا سیکھ لیں گے اور عالمی علوم سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی مقامی فکری قیادت کو مستحکم کریں گے، تبھی حقیقی ترقی ممکن ہو سکے گی۔

امپورٹڈ اور لوکل کے انتخاب میں سمجھوتے کی سرحد وہ توازن ہے جہاں ہم بین الاقوامی معیار سے فائدہ تو اٹھائیں، لیکن اپنی مقامی شناخت، خود انحصاری اور اقتصادی استحکام کو نقصان نہ پہنچنے دیں۔ اگر مقامی مصنوعات کا معیار کمزور ہے تو اسے بہتر بنانے کی کوشش ہونی چاہیے، نہ کہ فوری طور پر غیر ملکی اشیاء پر انحصار کیا جائے۔ کسی بھی صنعت یا شعبے میں غیر ملکی اشیاء اور افکار کو اسی وقت اپنانا چاہیے جب وہ واقعی ہماری ترقی میں مددگار ہوں، نہ کہ محض فیشن، برتری کے احساس، یا نفسیاتی غلامی کے تحت۔

معاشی طور پر ہمیں مقامی وسائل اور ہنر کی قدر کرنی چاہیے۔ اگر کسی چیز کا مقامی متبادل موجود ہو اور وہ معیاری ہو، تو اسے ترجیح دینی چاہیے تاکہ ملکی معیشت اور صنعت ترقی کرے۔ اگر مقامی متبادل ابھی کمزور ہے تو اس کی بہتری پر کام کیا جائے، بجائے اس کے کہ ہمیشہ امپورٹڈ اشیاء کو ہی واحد حل سمجھا جائے۔ فکری اور ثقافتی سطح پر ہمیں بین الاقوامی مکاتبِ فکر سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے، لیکن اپنی دینی و ثقافتی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے۔ اگر کسی نظریے یا فکر کو محض اس لیے اپنایا جا رہا ہے کہ وہ کسی غیر ملکی ماہر، اسکالر یا ادارے سے آیا ہے، تو یہ فکری غلامی ہے۔ البتہ اگر کسی غیر ملکی یا غیر مقامی فکر میں واقعی کوئی مثبت پہلو موجود ہے تو اسے اسلامی اصولوں اور مقامی ضروریات کے مطابق اپنانا چاہیے۔

اقتصادی خود انحصاری کے لیے ضروری ہے کہ اگر کوئی غیر ملکی برانڈ یا کمپنی مقامی صنعت کو نقصان پہنچا رہی ہے اور ہمارے ملک میں بھی وہی چیز تیار ہو سکتی ہے تو ہمیں مقامی صنعت کی

سرپرستی کرنی چاہیے۔ اگر کسی شعبے میں ابھی مقامی سطح پر مقابلہ نہیں ہے تو غیر ملکی مصنوعات عارضی طور پر استعمال کی جا سکتی ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ مقامی متبادل پیدا کرنے کی کوشش بھی جاری رہنی چاہیے۔ اس کے ساتھ احساسِ کمتری سے نجات بھی ضروری ہے۔ محض اس بنیاد پر کہ کوئی چیز یا نظریہ مغرب یا کسی ترقی یافتہ ملک سے آیا ہے، اسے بلا سوچے سمجھے قبول کرنا غلامی کی علامت ہے۔ اپنی شناخت پر فخر کرنا اور مقامی ٹیلنٹ کو فروغ دینا ہی ہمیں حقیقی معنوں میں خود مختار بنا سکتا ہے تاکہ ہم ہر معاملے میں دوسروں کے محتاج نہ رہیں۔

سمجھوتے کی سرحد یہی ہے کہ ہم بہترین چیز کا انتخاب کریں لیکن اپنی شناخت، خود انحصاری اور ترقی کی راہ کو قربان نہ کریں۔ ہمیں عالمی ترقی سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے مگر اپنی جڑوں اور بنیادی اقدار کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

انسانی زندگی میں ہدف کی اہمیت

انسانی زندگی کی معنویت اور اس کی ترقی کا سب سے بنیادی اصول یہی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو پہچانے اور پھر اس کے حصول کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لائے۔ جو لوگ زندگی میں کسی واضح مقصد کے بغیر جیتے ہیں، وہ اکثر بے سمتی، مایوسی اور ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں، کیونکہ انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کس سمت میں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ بر عکس اس کے، جن لوگوں کو اپنے مقصدِ زندگی کا شعور حاصل ہو جاتا ہے، وہ ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں اور کسی بھی رکاوٹ کو اپنی منزل کی طرف بڑھنے سے نہیں روک پاتی۔ یہی مقصد ان کے لیے توانائی، عزم اور استقامت کا ذریعہ بنتا ہے اور انہیں ایک ناقابلِ شکست شخصیت میں ڈھال دیتا ہے۔

مقصدِ حیات کی تلاش کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ یہ وہ نقطۂ آغاز ہے جو انسان کو معمولی سے غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر وہ شخصیت جس نے دنیا میں کوئی نمایاں مقام حاصل کیا، وہ کسی نہ کسی بلند مقصد سے جڑی ہوئی تھی۔ چاہے وہ انبیاء کرام ہوں، آئمہ علیہم السلام ہوں، یا دنیاوی میدان کے عظیم رہنما اور سائنسدان، سب کے پیچھے ایک ایسا مقصد تھا جس نے ان کی صلاحیتوں کو جِلا بخشی اور انہیں مشکلات کے باوجود آگے بڑھنے کی ہمت دی۔

قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے انسان کو عبث پیدا نہیں کیا، بلکہ ہر انسان کی تخلیق کا ایک مقصد ہے، جسے اسے خود تلاش کرنا اور پورا کرنا ہے۔

جب کوئی انسان اپنے مقصد کو پہچان لیتا ہے اور اس کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو عبور کرنے کے لیے اپنے اندر استقامت اور جذبہ پیدا کر لیتا ہے، تو وہ ناقابلِ تسخیر بن جاتا ہے۔ دنیا کی مشکلات، ناکامیاں اور وقتی پریشانیاں اس کے قدموں کی زنجیر نہیں بن سکتیں بلکہ وہ انہیں اپنی طاقت میں بدل لیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان محض ایک عام فرد نہیں رہتا بلکہ اپنی سوچ، عمل اور جدوجہد سے دنیا میں ایک نئی تاریخ رقم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ بصیرت ہمیشہ زندگی کو بے مقصد گزارنے کے بجائے کسی اعلیٰ ہدف کے حصول کے لیے خود کو وقف کر دیتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حقیقی کامیابی اور اطمینان اسی میں ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے مقصد کو سمجھے اور اسے حاصل کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کرے۔

زندگی کا حسن اسی میں ہے کہ انسان اپنی موجودگی کا شعور رکھتے ہوئے اس مقصد کو پہچانے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ جو لوگ مقصد کے بغیر جیتے ہیں، وہ وقت کی موجوں میں بہتے رہتے ہیں، کبھی کسی سمت اور کبھی کسی اور سمت نکل جاتے ہیں، مگر جنہیں اپنی راہ اور منزل کا علم ہو، وہ زمانے کے تھپیڑوں کے باوجود اپنی سمت برقرار رکھتے ہیں۔ یہ مقصد ہی ہے جو انسان کو جمود سے نکال کر حرکت میں لاتا ہے، اس کے وجود میں ایک نئی روح پھونکتا ہے اور اسے محض زندگی گزارنے کے بجائے کچھ کر گزرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں رکاوٹیں اور آزمائشیں ہر کسی کے حصے میں آتی ہیں، مگر جس کے پاس واضح مقصد ہوتا ہے، وہ ان مشکلات کو اپنے حوصلے کی طاقت سے مٹا دیتا ہے۔ دنیا کے عظیم افراد نے اسی حقیقت کو اپنی زندگی کا اصول بنایا اور اپنے مقصد کی راہ میں ہر مشکل کو قدموں تلے روندتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ مقصد انسان کو مضبوط بناتا ہے، اسے زندگی کی سطحیت سے نکال کر ایک گہرے شعور اور اعلیٰ نصب العین کی طرف لے جاتا ہے، جہاں مشکلات کا وجود بھی اس کے عزم و ہمت کو کمزور نہیں کر سکتا بلکہ مزید جلا بخشتا ہے۔

ایک انسان کے لیے سب سے بڑی محرومی یہ نہیں کہ وہ مال و دولت سے خالی ہو بلکہ اصل محرومی یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد سے خالی ہو۔ جب انسان اپنے مقصد کو نہیں جانتا تو وہ ایک کشتی کی مانند ہو جاتا ہے جو بغیر پتوار کے کسی بھی سمت میں بہک جاتی ہے۔ مگر جیسے ہی وہ اپنے مقصد سے جڑتا ہے، اس کی زندگی میں ایک نیا ولولہ، ایک نیا جوش اور ایک ناقابلِ شکست قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح زمانے کے بدلتے حالات کے مطابق نہیں چلتا بلکہ خود اپنے ارادے سے راہیں متعین کرتا ہے، اپنے خوابوں کو حقیقت میں ڈھالتا ہے اور ناممکنات کو ممکنات میں بدل دیتا ہے۔

مقصد انسان کی شناخت کا تعین کرتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ وہ کس سمت جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ جب کسی شخص کو اپنے مقصد کا شعور حاصل ہو جاتا ہے تو وہ بکھری ہوئی توانائیوں کو یکجا کر کے ایک مرکز کی طرف لے آتا ہے۔ اسی کے ذریعے اس کی ترجیحات متعین ہوتی ہیں، اس کے فیصلے مضبوط ہوتے ہیں اور اس کی جدوجہد ایک نئی معنویت اختیار کر لیتی ہے۔

ایسے لوگ تاریخ میں اپنے نشانات چھوڑ جاتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کامیابی کا اصل راز اپنی زندگی کے مقصد کو پہچان کر اس کی طرف پوری یکسوئی سے بڑھنا ہے، اور جو اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے، وہ کبھی رکنے والا نہیں ہوتا۔

انفرادی و سماجی شناخت میں اعتدال

ہر انسان اپنی ذات میں ایک منفرد تخلیق ہے۔ اس کی شخصیت، خیالات، احساسات اور صلاحیتیں کسی دوسرے انسان سے مکمل طور پر مشابہ نہیں ہوتیں۔ قدرت نے ہر فرد کو مخصوص خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور یہی انفرادیت انسان کی اصل پہچان ہے۔ اگر کوئی شخص دوسروں کی تقلید میں اپنی ذات کو کھودے یا اپنی انفرادیت کو پسِ پشت ڈال کر کسی اور کی طرح بننے کی کوشش کرے، تو وہ اپنے حقیقی وجود سے محروم ہو جاتا ہے۔ خود کو پہچاننا، اپنی خوبیوں کو سمجھنا اور اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ایک ایسی روشنی ہے جو انسان کو اندرونی سکون اور خود اعتمادی عطا کرتی ہے۔

خود کو عزت دینا، اپنی انفرادیت کو تسلیم کرنا اور اپنی شخصیت کو نکھارنے کی کوشش کرنا وہ بنیادی اصول ہیں جو کامیابی اور خوشی کے دروازے کھولتے ہیں۔ جب انسان خود کو کمتر محسوس کرنے لگتا ہے اور دوسروں کی طرح بننے کی خواہش میں اپنی اصل پہچان کو مٹا دیتا ہے، تو وہ درحقیقت اپنی ذات کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔ یہ رویہ نہ صرف اس کے اعتماد کو مجروح کرتا ہے بلکہ اس کی ترقی کی راہ میں بھی رکاوٹ بنتا ہے۔ عزتِ نفس اور خودی کی پہچان ہی وہ چیز ہے جو انسان کو دوسروں کے سائے سے نکال کر ایک نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔

امام علیؑ کا قول ہے " :جو اپنے آپ کو پہچان لے، وہ اپنے رب کو پہچان لے گا۔ "یہ قول واضح کرتا ہے کہ انسان کی اصل پہچان اسی وقت ممکن ہے جب وہ خود کو سمجھے، اپنی قدر کرے اور اپنی صلاحیتوں کا ادراک کرے۔ جب انسان اپنی منفرد خصوصیات کو تسلیم کر لیتا ہے تو وہ اپنی زندگی میں ایک مضبوط بنیاد قائم کر لیتا ہے جو اسے دوسروں کے مقابلے میں خود کو بہتر بنانے کی ترغیب دیتی ہے، نہ کہ دوسروں جیسا بننے کی غیر ضروری خواہش میں اپنی اصل شناخت کھو دینے پر مجبور کرتی ہے۔

زندگی کا حسن اسی میں ہے کہ انسان اپنی ذات پر فخر کرے، اپنی صلاحیتوں کو پہچانے اور خود کو ایسے راستے پر ڈالے جہاں وہ اپنی شخصیت کی مکمل نشوونما کر سکے۔ خود کو عزت دینا صرف ایک نفسیاتی ضرورت نہیں بلکہ ایک روحانی اور اخلاقی فریضہ بھی ہے۔ جب کوئی شخص خود کو عزت دینا سیکھ لیتا ہے، تو وہ دوسروں کی عزت کرنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے، اور یوں ایک بہتر، مثبت اور پُر سکون زندگی گزار سکتا ہے۔

ذاتی زندگی کے ساتھ انسان اجتماعی زندگی بھی اہم ہے اور ان دونوں کے درمیان توازن و اعتدال ضروری ہے انفرادی شناخت تو وہ ہے جو ایک انسان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، جو اس کی ذات، خیالات، احساسات، صلاحیتوں اور کردار کی عکاسی کرتی ہے۔ ہر انسان اپنی مخصوص خوبیوں اور رجحانات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، جو اسے دوسروں سے مختلف بناتے ہیں۔ اگر کوئی فرد اپنی انفرادیت کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے کی کوشش نہیں کرتا تو وہ اپنی اصل پہچان کھو بیٹھتا ہے

انسان کی زندگی کا دوسرا پہلو اجتماعی شناخت ہے، جو اس کے معاشرتی تعلقات، قومی وابستگی، مذہبی پس منظر اور ثقافتی ورثے سے جُڑی ہوتی ہے۔ کوئی بھی فرد سماج سے الگ تھلگ زندگی نہیں گزار سکتا، بلکہ وہ ایک بڑے معاشرتی ڈھانچے کا حصہ ہوتا ہے۔ اجتماعی شناخت انسان کو دوسروں سے جوڑتی ہے، اسے ایک وسیع تر مقصد اور احساسِ وابستگی عطا کرتی ہے۔ ایک فرد کا کسی قوم، مذہب، زبان یا تہذیب سے تعلق ہونا نہ صرف اس کی اجتماعی شناخت کا اظہار ہے بلکہ یہ اس کی شخصیت کی تکمیل کے لیے بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم میں اجتماعی وحدت پر زور دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ نہ ڈالو۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجتماعی اتحاد انسان کی بقا اور ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔

انفرادی اور اجتماعی شناخت کے تقاضے ایک متوازن زندگی کے لیے نہایت اہم ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی انفرادیت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دے اور صرف اجتماعی شناخت کے تابع ہو جائے، تو وہ اپنی فکری آزادی اور خودی کی پہچان کھو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی فرد محض اپنی ذاتی شناخت پر زور دے اور اجتماعی شناخت کو نظر انداز کرے، تو وہ معاشرتی بے ربطی اور انانیت کا شکار ہو سکتا ہے۔ اسلام نے ایک ایسا معتدل راستہ پیش کیا ہے جہاں فرد کی انفرادیت بھی محفوظ رہے اور وہ ایک مضبوط اجتماعی ڈھانچے کا بھی حصہ رہے۔

اجتماعی عبادات جیسے نمازِ جماعت، حج، زکات اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے اعمال اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ اسلام میں اجتماعی شعور کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔ مگر اسی

کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث میں بارہا فرد کی ذاتی اصلاح، خودی کی پہچان اور اپنی قابلیتوں کو نکھارنے کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔" یعنی ہر فرد کی اصل پہچان اس کی سوچ، الفاظ اور کردار میں پنہاں ہوتی ہے، جو اس کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک کامیاب اور متوازن زندگی تب ہی ممکن ہے جب انسان اپنی انفرادی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے اجتماعی شناخت کے تقاضوں کو بھی پورا کرے۔ اسے اپنی منفرد صلاحیتوں کو پہچان کر انہیں پروان چڑھانا چاہیے، لیکن ساتھ ہی اپنے سماج، مذہب اور ثقافتی اقدار کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ انفرادی اور اجتماعی شناخت کے اس توازن کے بغیر، نہ کوئی فرد حقیقی معنوں میں ترقی کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی معاشرہ استحکام حاصل کر سکتا ہے۔

انقلابی جدوجہد میں تھکن کا سامنا اور اس کا حل

ہر انقلابی جدوجہد میں ایک ایسا مرحلہ ضرور آتا ہے جب لوگ تھکن محسوس کرنے لگتے ہیں اور اہداف کا حصول دشوار دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب کسی راہ میں مسلسل رکاوٹیں آتی ہیں اور کامیابی فوری نظر نہیں آتی، تو مایوسی اور پژمردگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایسے وقت میں سب سے ضروری امر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو ان کے اصل مقصد کی یاد دہانی کرائی جائے۔ جب ایک نظریہ انسان کے دل میں جاگزین ہو جاتا ہے تو اس کی راہ میں حائل مشکلات اس کے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتیں، لیکن بعض اوقات خارجی حالات اور مسلسل دباؤ کے باعث انسان وقتی طور پر اپنی جدوجہد کی روح سے غافل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، قیادت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ جدوجہد میں شریک افراد کو ان کے بنیادی نظریاتی اصولوں کی طرف دوبارہ متوجہ کرے اور انہیں اس راہ میں پیش آنے والی آزمائشوں کی حقیقت سے آگاہ رکھے۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہر بڑی تبدیلی قربانی، صبر اور استقامت کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ اسی لیے قرآن و احادیث میں صبر و استقامت کی بارہا تلقین کی گئی ہے۔ انقلابی تحریکوں کے کارکنان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اہلِ بیتؑ اور دیگر عظیم ہستیوں کی زندگیاں پڑھنے اور ان سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ جان سکیں کہ ہر کامیاب

تحریک نے مشکلات اور آزمائشوں کا سامنا کیا ہے۔ اگر ہم اسلامی تاریخ کو دیکھیں تو ہمیں امام حسینؑ کی قربانی سب سے بڑی مثال کے طور پر نظر آتی ہے، جنہوں نے کربلا میں اپنے ساتھیوں کے حوصلے کو گرنے نہیں دیا، بلکہ انہیں مسلسل اپنے ہدف کی یاد دہانی کراتے رہے۔ یہی اصول کسی بھی انقلابی تحریک کے لیے مشعلِ راہ ہے کہ جب تھکن محسوس ہونے لگے تو مقصد پر نظر جمانا ضروری ہو جاتا ہے۔

تاہم، نظریاتی تربیت کے ساتھ ساتھ عملی حکمتِ عملی بھی ضروری ہے۔ مسلسل جدوجہد جسمانی اور ذہنی تھکن کا باعث بنتی ہے، اور اگر کارکنان کو آرام اور فکری تجدید کا موقع نہ دیا جائے تو ان کی کارکردگی متاثر ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جدوجہد میں شریک افراد کو مکمل آرام دیا جائے تاکہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تازہ دم ہو سکیں۔ بعض اوقات تحریک میں شامل افراد کی ذمہ داریوں میں تنوع پیدا کرنے سے بھی ان کے اندر نیا جوش پیدا ہو سکتا ہے۔ قیادت کو چاہیے کہ وہ کارکنان کے درمیان ذمہ داریوں کی تقسیمِ نو کرے تاکہ وہ یکسانیت اور ذہنی بوجھ سے نکل سکیں۔

روحانی پہلو بھی انقلابی تحریکوں میں انتہائی اہم ہوتا ہے۔ اجتماعی طور پر دعا و مناجات، ذکرِ الٰہی اور روحانی محافل کا انعقاد کارکنان کے دلوں کو قوت عطا کرتا ہے اور جذبہ قربانی کو تازہ کرتا ہے۔ جب انسان اللہ کی رضا کے لیے کوئی کام کر رہا ہو اور اسے مسلسل الٰہی مدد کی امید ہو، تو اس کا حوصلہ کبھی پست نہیں ہوتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اجتماعی طور پر ایسے مواقع

پیدا کیے جائیں جہاں کارکنان کو روحانی بالیدگی حاصل ہو اور وہ اللہ کے قرب کو محسوس کریں۔

ان سب اقدامات کے ساتھ جب یقین دہانی اور حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رکھا جائے، تو تھکن وقتی ثابت ہوتی ہے اور انقلابی قافلہ تازہ عزم کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو سکتا ہے۔ تحریکوں کی کامیابی صرف مادی وسائل یا وقتی جذبات پر منحصر نہیں ہوتی، بلکہ اس کا اصل دار و مدار نظریاتی پختگی، مسلسل محاسبے، اور جدوجہد کے تسلسل پر ہوتا ہے۔ اگر تھکن کے ان لمحات میں حکمت، تدبر، اور صحیح حکمتِ عملی اختیار کی جائے، تو یہی تھکن ایک نئے جذبے میں تبدیل ہو سکتی ہے، جو جدوجہد کو مزید قوت اور استحکام عطا کرے گی۔

اہل وعیال اور دین کے درمیان اعتدال

انسانی فطرت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی اہل وعیال سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور ان کی فکر میں لگا رہتا ہے، لیکن اسلام ہمیں اس محبت میں توازن اور اعتدال کا درس دیتا ہے۔ محبت اگر انسان کو اللہ کی یاد اور اس کے راستے سے غافل کر دے تو وہ آزمائش بن جاتی ہے، اور اگر وہ اللہ کی رضا کے تابع ہو تو باعثِ سعادت ہے۔ اس تحریر میں اسی نکتے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں ایک متوازن راہ اختیار کرنی چاہیے، جہاں اہل و عیال سے محبت اور ان کے حقوق کی ادائیگی اپنی جگہ، مگر اللہ کی یاد، دین کی ذمہ داریاں اور اعلیٰ مقاصد فراموش نہ ہوں۔

قرآنِ کریم میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے: *"إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ"* (التغابن: 15) یعنی "تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہیں، اور اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔" اس آیت میں واضح کیا گیا کہ مال و اولاد ایک امتحان ہیں، جو بعض اوقات انسان کو دین کی راہ سے ہٹانے کا سبب بن سکتے ہیں۔ جب انسان اپنے اہل وعیال میں ایسا منہمک ہو جائے کہ دین کی ذمہ داریاں پس پشت چلی جائیں، تو یہی محبت گمراہی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

مولا علیؑ کا ارشاد کہ "اگر وہ اللہ کے دوست ہیں تو اللہ اپنے دوستوں کا خیال رکھتا ہے" ایک عظیم توکل اور فکری آزادی کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے معاملات خود سنوارنے والا ہے، وہ ان کا نگہبان اور سرپرست ہے۔ اس لیے مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کی بنیادی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے، اصل توجہ اللہ اور اس کے دین پر مرکوز رکھے۔ یہ وہی مفہوم ہے جو امام جعفر صادقؑ کے اس قول میں پایا جاتا ہے: * "مَنْ كَانَ هَمُّهُ اللهَ كَفَاهُ اللهُ هَمَّهُ مِنَ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ" * یعنی "جو شخص اپنا تمام تر دھیان اللہ پر رکھے، اللہ دنیا اور آخرت کے تمام معاملات میں اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔"

حدیث کے دوسرے حصے کی جانب، اگر کسی کے اہل و عیال اللہ کے دشمن ہیں، یعنی وہ ایسے رویے اختیار کرتے ہیں جو دین کے خلاف ہیں، تو مومن کو ان میں اس حد تک الجھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ خود بھی دینی راستے سے ہٹ جائے۔ قرآن میں اسی بارے میں فرمایا گیا: * "لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللهَ وَرَسُولَهُ" * (المجادلہ: 22) یعنی "تم ایسی قوم نہ پاؤ گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو اور پھر بھی اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت رکھتی ہو۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اہل و عیال انسان کو دین سے دور کرنے والے بن جائیں، تو ان کے ساتھ تعلق میں ایسی شدت نہیں ہونی چاہیے جو انسان کے عقیدے اور عمل کو کمزور کر دے۔

ماضی میں کئی انبیاء اور اولیاء کے اہل و عیال ان کے راستے کے مخالف تھے، لیکن انبیاء نے اپنے مشن کو ترجیح دی۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا، حضرت لوطؑ کی بیوی، اور فرعون کی بیوی آسیہ کے مقابلے میں فرعون خود، اس بات کے روشن مثالیں ہیں کہ رشتہ داری کا تعلق ایمان و عقیدے پر مقدم نہیں ہوتا۔ مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے اہل و عیال کی اصلاح کی کوشش کرے، مگر اگر وہ راہِ حق پر نہیں آتے تو ان کی محبت میں اس قدر گرفتار نہ ہو کہ خود بھی خسارے میں پڑ جائے۔

یہ تعلیم در حقیقت روحانی آزادی کا سبق دیتی ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کسی بھی چیز کا اسیر نہ بنے، حتیٰ کہ اپنی محبتوں کا بھی۔ وہ اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرے، ان کی تربیت کرے، ان کے لیے دعائیں کرے، مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی روحانی ترقی، دینی ذمہ داریوں، اور اللہ سے اپنے تعلق کو ہر چیز پر مقدم رکھے۔ یہی حقیقی کامیابی کی راہ ہے اور اسی میں دین و دنیا کی فلاح مضمر ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل و عیال کی حقیقی محبت یہی ہے کہ ہم ان کے دین کی فکر کریں اور انہیں اس راستے پر چلانے کی کوشش کریں جو انہیں دنیا و آخرت میں کامیابی کی طرف لے جائے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر مومنین کو خبردار کیا ہے :

"*يَا أَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ"* (التحریم: 6)

یعنی * "اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں" *۔

یہ آیت ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ جس محبت کے سبب ہم اپنے گھر والوں کی دنیاوی آسائشوں اور ضروریات کو پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں، وہی محبت ہم سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم ان کی آخرت کی بھی فکر کریں۔ دنیا کی فانی خوشیاں اور سہولتیں عارضی ہیں، لیکن اگر ہم نے اپنے اہل و عیال کو دین کی بنیادوں پر استوار نہ کیا، تو وہ ایک ایسی ہلاکت میں مبتلا ہو سکتے ہیں جس کی تلافی ممکن نہیں۔

مولا علیؑ نے فرمایا: * "بچوں کے ساتھ بچپن میں کھیلنا اور ان سے محبت کرنا اچھی بات ہے، لیکن جب وہ بڑے ہو جائیں تو ان کی دینی تربیت اور ان کے کردار کی اصلاح میں سنجیدہ ہونا ضروری ہے، کیونکہ وہ تمہارے بعد اس امت کے وارث ہوں گے" *۔ یعنی حقیقی محبت یہ نہیں کہ ہم اپنی اولاد اور اہل و عیال کو صرف دنیاوی فائدے پہنچائیں، بلکہ اصل محبت یہ ہے کہ ہم انہیں ایسا شعور دیں جو انہیں گناہوں اور گمراہی سے بچائے اور اللہ کے قریب کرے۔

اگر کوئی شخص اپنی اولاد کو دنیاوی تعلیم، معاشی استحکام، اور زندگی کے دیگر سہولتوں میں اعلیٰ مقام دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، مگر ان کے عقیدے، عبادات، اور اخلاقیات کی فکر نہیں کرتا، تو وہ حقیقت میں ان کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی کر رہا ہے۔ کیونکہ دنیا

کی تکالیف وقتی ہیں، مگر آخرت کا عذاب دائمی ہے۔ حضرت امام زین العابدینؑ نے فرمایا:
* "تمہارا سب سے بڑا حق اپنے بچوں پر یہ ہے کہ انہیں ایسا علم اور ایسا ادب سکھاؤ جو انہیں دنیا اور آخرت میں فائدہ دے" *۔

یہ حقیقت ہمیں اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ ہم اپنے گھروں میں دین کو زندہ کریں، اہل و عیال کو نماز، روزہ، قرآن فہمی، اور نیکیوں کی تلقین کریں، اور برے اخلاق، بے دینی، اور دنیاوی غفلت سے بچنے کی ترغیب دیں۔ یہ کام محض نصیحتوں سے نہیں، بلکہ ہمارے اپنے عمل سے ہو گا۔ کیونکہ اگر ہم دین پر چلنے والے ہوں گے تو ہماری اولاد اور اہل خانہ بھی اس راستے کو اپنانے میں زیادہ آمادہ ہوں گے۔ اس لیے، حقیقی محبت اور شفقت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اہل و عیال کی آخرت کی فکر کریں اور انہیں اس آگ سے بچانے کی سعی کریں جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی بنیادی ضروریات، یعنی رزق، رہائش، اور لباس کی کفالت کا وعدہ کیا ہے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا :

" * وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ" * (الذاریات:22)

یعنی * "اور تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، وہ آسمان میں ہے" *۔

یہ حقیقت ہمیں اس اطمینان کی طرف لے جاتی ہے کہ دنیاوی ضروریات کا بندوبست اللہ کے ذمے ہے، اور ہمیں اس کے لیے حد سے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ البتہ،

جہاں تک اعمال کے نتائج کا تعلق ہے، وہ ہمارے اختیار میں دیے گئے ہیں اور ہمیں ان کے بارے میں مکمل شعور رکھنے کی ضرورت ہے۔

اللہ نے دنیا میں ہر کام کے لیے ایک نظام مقرر کیا ہے: نیک اعمال نیک نتائج پیدا کرتے ہیں، اور برے اعمال کے برے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ قرآن میں فرمایا گیا :

"* مَن يَعۡمَلۡ سُوٓءٗا يُجۡزَ بِهِ "* (النساء:123)

یعنی* "جو کوئی برا عمل کرے گا، اس کا بدلہ اسے دیا جائے گا"*۔

یہی اصول دنیا کے ہر پہلو میں کارفرما ہے۔ اگر ہم علم حاصل کریں گے، تو فہم و شعور ملے گا۔ اگر محنت کریں گے، تو ترقی ہوگی۔ اگر ہم نیکیوں کی راہ اختیار کریں گے، تو دنیا اور آخرت میں کامیابی نصیب ہوگی۔ اسی طرح، اگر ہم ظلم، بے راہ روی، اور گناہوں میں مبتلا ہوں گے، تو اس کے تلخ نتائج بھی ہمیں بھگتنا ہوں گے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: * "دنیا میں جو کچھ تمہیں ملتا ہے، وہ تمہاری قسمت سے ہے، لیکن جو کچھ تم کھوتے ہو، وہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے"*۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے بنیادی رزق کا وعدہ تو کر رکھا ہے، لیکن اگر ہم غلط راستے اختیار کریں گے، بے عملی، سستی، یا نافرمانی میں مبتلا ہوں گے، تو اس کے نتائج کا سامنا بھی ہمیں ہی کرنا ہوگا۔

اسی لیے عقل مند وہی ہے جو دنیاوی ضروریات کی فکر کو اللہ پر چھوڑ کر اپنی فکری اور عملی اصلاح پر توجہ دے، کیونکہ یہی وہ پہلو ہے جس پر اس کا اختیار بھی ہے اور جس پر اس کی آخرت کا دارومدار بھی ہے۔

باہدف زندگی میں ہی مشکلات شعور وہمت دیتی ہیں

زندگی کے نشیب و فراز انسان کی شخصیت، اس کے فکری ارتقا اور نفسیاتی مضبوطی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ دن جو انسان کو آزمائشوں میں مبتلا کرتے ہیں، اس کی ہمت کا امتحان لیتے ہیں اور اسے تکلیف و اضطراب میں مبتلا کر دیتے ہیں، وہی دن اس کی اصل تعمیر کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ جس طرح سونا بھٹی میں تپ کر کھرا اور خالص بن جاتا ہے، اسی طرح مشکلات اور آزمائشیں انسان کے باطن کو جِلا بخشتی ہیں اور اسے پہلے سے زیادہ مضبوط بنا دیتی ہیں۔ علم نفسیات کے مطابق، زندگی کے سخت لمحات انسان کے ذہنی و جذباتی رجحانات کو پرکھنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایک مضبوط شخصیت کے حامل افراد آزمائشوں سے سبق حاصل کرتے ہیں، ان میں صبر و استقامت پیدا ہوتی ہے اور وہ خود کو حالات کے مطابق بہتر طریقے سے ڈھالنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

نفسیاتی تحقیق اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ تکالیف کا سامنا کرنے والے افراد میں زیادہ جذباتی لچک (Emotional Resilience) پیدا ہوتی ہے۔ آزمائشوں کے نتیجے میں انسان کے اندر یہ صلاحیت بڑھ جاتی ہے کہ وہ مستقبل کے چیلنجز کو زیادہ صبر، تدبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کرے۔ جدید نفسیات میں "Post-Traumatic Growth" یعنی "سانحات کے بعد ذہنی و روحانی ترقی" کے نظریے کو بھی اسی تناظر میں

بیان کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ شدید مشکلات سے گزرنے والے افراد اگر صحیح طرزِ فکر اپنائیں تو وہ زیادہ باشعور، باہمت اور حقیقت پسند بن جاتے ہیں۔ گویا وہی لمحے جو انہیں توڑنے آتے ہیں، انہیں ایک نئے انداز میں تعمیر بھی کر دیتے ہیں۔

مکتبِ محمد و آلِ محمدؑ میں بھی اس حقیقت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے " :فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا "یعنی" بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔" اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ آزمائشیں وقتی ہوتی ہیں اور ان کے نتیجے میں انسان کی شخصیت مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔ رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں بے شمار مشکلات آئیں، مگر انہی آزمائشوں نے آپؐ کو وہ قوت اور صبر عطا کیا کہ آپؐ پوری انسانیت کے لیے ہدایت کا سرچشمہ بن گئے۔ اسی طرح، امام حسینؑ کی کربلا میں عظیم قربانی کو دیکھیں تو ظاہری طور پر وہ دن ان کے اہلِ بیتؑ اور اصحابؓ کے لیے سخت ترین دن تھا، لیکن یہی دن رہتی دنیا تک عزت، استقامت اور سچائی کا استعارہ بن گیا۔

امام علیؑ فرماتے ہیں " :مصیبت میں صبر مصیبت کو ختم کر دیتا ہے اور بے صبری مصیبت کو دوگنا کر دیتی ہے۔ " یہ قول اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ انسان اگر مشکلات کا سامنا حکمت، صبر اور استقامت کے ساتھ کرے تو وہی مشکلات اس کے لیے ترقی اور خود شناسی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں " :اگر مومن کو معلوم ہو جائے کہ مشکلات اس کے درجات کو کتنا بلند کرتی ہیں، تو وہ مشکلات کی دعا کرے۔ "اس فرمان سے

ظاہر ہوتا ہے کہ آزمائشیں انسان کی ترقی کا ذریعہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزما کر انہیں مزید بلندی عطا فرماتا ہے۔

زندگی کے مشکل دن، جہاں ایک طرف انسان کو عارضی طور پر توڑنے کا سبب بنتے ہیں، وہیں دوسری طرف وہی دن اس کے اندر ایک نئی قوت، شعور اور برداشت کو بیدار کرتے ہیں۔ جو لوگ مشکلات کو شکست تسلیم کر لیتے ہیں، وہ اندر سے ٹوٹ جاتے ہیں، مگر جو لوگ ان کا سامنا حوصلے اور صبر کے ساتھ کرتے ہیں، وہی تاریخ میں عظمت اور استقامت کی علامت بن جاتے ہیں۔ لہٰذا، آزمائشوں سے گھبرانے کے بجائے انہیں خود کی تعمیر اور بہتری کے ایک موقع کے طور پر دیکھنا چاہیے، کیونکہ جو دن توڑتے ہیں، وہی دن بناتے بھی ہیں۔

یہ نکتہ نہایت اہم ہے کہ مشکلات سے انسان کی تعمیر تبھی ہوتی ہے جب وہ کسی بامقصد اور اعلیٰ ہدف کے تحت ان مشکلات سے گزر رہا ہو۔ جو افراد لاابالی زندگی گزارتے ہیں، کسی مقصد کے بغیر وقت ضائع کرتے ہیں، اور اپنی کاہلی و سستی کی وجہ سے پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کے لیے مشکلات اصلاح اور ترقی کا ذریعہ کم اور تنزلی اور بربادی کا سبب زیادہ بنتی ہیں۔ لہٰذا، یہ اصول ہر ایک پر یکساں لاگو نہیں ہوتا بلکہ اس کا اطلاق اس انسان پر ہوتا ہے جو آزمائشوں کو ایک تربیتی عمل سمجھتا ہے اور ان سے سیکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

علمِ نفسیات میں "Growth Mindset" اور "Fixed Mindset" کے نظریات یہی وضاحت کرتے ہیں کہ جو لوگ مشکلات کو سیکھنے اور بڑھنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، وہی ان

سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جبکہ جو لوگ مشکلات کو اپنے حالات کا فطری انجام مان کر بے عملی اور یاسیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ مزید زوال پذیر ہوتے ہیں۔ جو شخص کسی ہدف کے بغیر جیتا ہے، اس کی مشکلات اسے مزید گمراہی اور بے بسی کی طرف دھکیلتی ہیں کیونکہ وہ ان سے سبق لینے کے بجائے اپنی عادات میں مزید جمود اور بے حسی پیدا کر لیتا ہے۔

مکتبِ محمد و آلِ محمدؑ میں بھی اس فرق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا:
"وَمَن يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ"
جسے اللہ ذلیل کر دے، اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔
یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے اعمال سے ذلت کو خود پر مسلط کر لیتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ اس کے برعکس، جو لوگ راہِ حق میں مشکلات برداشت کرتے ہیں، ان کے لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں مزید قوت اور ہدایت عطا کرے گا۔

امام علیؑ فرماتے ہیں" :ہدف کے بغیر زندگی، موت سے بدتر ہے۔"
یہ قول واضح کرتا ہے کہ وہی مشکلات انسان کو بناتی ہیں جو کسی بڑے مقصد کے راستے میں آتی ہیں۔ اگر کوئی بغیر مقصد کے زندگی گزار رہا ہے اور اپنی ہی غفلت سے مشکلات میں پھنسا ہوا ہے، تو یہ مشکلات اسے بنانے کے بجائے مزید توڑ دیتی ہیں، کیونکہ وہ ان سے نکلنے کے لیے کوئی تدبیر نہیں کرتا۔

چنانچہ، اصل فرق نیت اور رویے میں ہے۔ مشکلات بذاتِ خود انسان کو نہیں بناتیں، بلکہ ان کا سامنا کرنے کا انداز اور نیت انسان کو بناتی یا بگاڑتی ہے۔ جو مشکلات کسی مثبت اور

تعمیری مقصد کے تحت آتی ہیں، وہ ترقی کا ذریعہ بنتی ہیں، جبکہ جو مشکلات انسان کی اپنی کاہلی، نافرمانی اور غیر سنجیدگی کا نتیجہ ہوتی ہیں، وہ اسے مزید زوال کی طرف لے جاتی ہیں۔

یہ نکتہ بھی نہایت اہم ہے کہ مشکلات سے انسان کی تعمیر تبھی ہوتی ہے جب وہ کسی بامقصد اور اعلیٰ ہدف کے تحت ان مشکلات سے گزر رہا ہو۔ جو افراد لاابالی زندگی گزارتے ہیں، کسی مقصد کے بغیر وقت ضائع کرتے ہیں، اور اپنی کاہلی و سستی کی وجہ سے پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کے لیے مشکلات اصلاح اور ترقی کا ذریعہ کم اور تنزلی اور بربادی کا سبب زیادہ بنتی ہیں۔ لہٰذا، یہ اصول ہر ایک پر یکساں لاگو نہیں ہوتا بلکہ اس کا اطلاق اس انسان پر ہوتا ہے جو آزمائشوں کو ایک تربیتی عمل سمجھتا ہے اور ان سے سیکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

علمِ نفسیات میں "Growth Mindset" اور "Fixed Mindset" کے نظریات یہی وضاحت کرتے ہیں کہ جو لوگ مشکلات کو سیکھنے اور بڑھنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، وہی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جبکہ جو لوگ مشکلات کو اپنے حالات کا فطری انجام مان کر بے عملی اور یاسیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ مزید زوال پذیر ہوتے ہیں۔ جو شخص کسی ہدف کے بغیر جیتا ہے، اس کی مشکلات اسے مزید گمراہی اور بے بسی کی طرف دھکیلتی ہیں کیونکہ وہ ان سے سبق لینے کے بجائے اپنی عادات میں مزید جمود اور بے حسی پیدا کر لیتا ہے۔

مکتبِ محمدؐ و آلِ محمدؑ میں بھی اس فرق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا:

"وَمَن يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ"

جسے اللہ ذلیل کر دے، اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔

یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے اعمال سے ذلت کو خود پر مسلط کر لیتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ اس کے برعکس، جو لوگ راہِ حق میں مشکلات برداشت کرتے ہیں، ان کے لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں مزید قوت اور ہدایت عطا کرے گا۔

امام علیؑ فرماتے ہیں" :ہدف کے بغیر زندگی، موت سے بدتر ہے۔" یہ قول واضح کرتا ہے کہ وہی مشکلات انسان کو بناتی ہیں جو کسی بڑے مقصد کے راستے میں آتی ہیں۔ اگر کوئی بغیر مقصد کے زندگی گزار رہا ہے اور اپنی ہی غفلت سے مشکلات میں پھنسا ہوا ہے، تو یہ مشکلات اسے بنانے کے بجائے مزید توڑ دیتی ہیں، کیونکہ وہ ان سے نکلنے کے لیے کوئی تدبیر نہیں کرتا۔

زندگی میں بامقصد ہونا انسان کی بقا اور ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جب کوئی شخص کسی واضح اور بلند ہدف کے تحت زندگی گزارتا ہے، تو راستے میں آنے والی مشکلات اسے کمزور کرنے کے بجائے مزید مضبوط اور باہمت بناتی ہیں۔ مشکلات کا سامنا کرنے میں صبر اور استقامت کی قوت بھی اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب انسان کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد موجود ہو، جس کے لیے وہ ہر رکاوٹ کو چیلنج سمجھ کر عبور کرے۔

اگر زندگی میں کوئی ہدف ہی نہ ہو، تو سستی، کاہلی اور بے عملی انسان کی فطرت کا حصہ بن جاتی ہے۔ ایسی زندگی میں جو پریشانیاں آتی ہیں، وہ درحقیقت خود انسان کی پیدا کردہ ہوتی ہیں، کیونکہ بغیر کسی مقصد کے جینے والا شخص اپنی ہی غفلت اور کمزوریوں کا شکار ہو کر مشکلات میں گھِر جاتا ہے۔ یہ مشکلات کسی ترقی یا تعمیر کا پیش خیمہ نہیں بنتیں بلکہ مزید زوال

اور تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہیں، کیونکہ ان سے نکلنے کے لیے کوئی محرک یا جواز موجود نہیں ہوتا۔

لہٰذا، اگر کوئی شخص ان مشکلات سے باہر نکلنا چاہے، تو سب سے پہلے اسے اپنی زندگی میں ایک واضح مقصد کا تعین کرنا ہوگا۔ بغیر کسی ہدف کے جینے والا شخص اپنی مشکلات کا حل کبھی نہیں پا سکتا، کیونکہ مشکلات سے نکلنے کا راستہ ہمیشہ ایک مضبوط مقصد کے ذریعے ہی نکلتا ہے۔ ہدف کے بغیر زندگی ایک بھٹکتی ہوئی کشتی کی مانند ہے جسے ہر آنے والا طوفان مزید بے سمت کر دیتا ہے، جبکہ ایک بامقصد انسان کے لیے مشکلات راستے کے سنگِ میل کی مانند ہوتی ہیں جو اسے اس کے اصل مقام تک پہنچانے میں مدد دیتی ہیں۔

بنیادی ضروریات کا فقدان اور سائنس و ٹیکنالوجی کو ترجیح دینا

جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے کئی ایسے شعبے ہیں جنہیں استعماری سرمایہ داری نے ذہانت، ترقی اور انسانی مستقبل کی ضامن قرار دے دیا ہے، مگر حقیقت میں یہ انسانیت کی اجتماعی فلاح کے بجائے مخصوص طاقتور طبقات کے مفادات کے لیے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان شعبوں کو غیر ضروری طور پر عالمی ترجیح بنا دیا گیا ہے جبکہ دنیا کی ایک بڑی آبادی بنیادی ضروریات سے محروم ہے۔ انسان بھوک، ننگ، بیماری اور تعلیم کی کمی کا شکار ہے، مگر سرمایہ دارانہ سائنس ایسے شعبوں میں اپنی محنت اور سرمائے کو جھونک رہی ہے جو عام انسان کے کسی بنیادی مسئلے کو حل نہیں کرتے بلکہ اسے مزید ذہنی، اخلاقی اور تہذیبی زوال میں دھکیل دیتے ہیں۔

مصنوعی ذہانت، روبوٹکس اور خودکار نظاموں پر بے پناہ سرمایہ خرچ کیا جارہا ہے تاکہ دنیا کو زیادہ "سہولت بخش" بنایا جا سکے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ٹیکنالوجی محض چند بڑی کمپنیوں اور مخصوص طاقتور اقوام کے مفاد میں استعمال ہو رہی ہے۔ لاکھوں لوگ بھوک، بیماری اور پانی کی قلت کا شکار ہیں، مگر سرمایہ دارانہ ذہنیت نے تحقیق کے وسائل کا رخ ایسے روبوٹس اور ڈیجیٹل سسٹمز کی طرف موڑ دیا ہے جو انسانوں کی جگہ لے رہے ہیں، بیروزگاری بڑھا رہے ہیں اور معاشرتی ناہمواریوں میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ ایک عام انسان کے لیے ان

ٹیکنالوجیز کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس کا روزگار چھن رہا ہے، اور وہ مزید استحصال کا شکار ہو رہا ہے۔

ڈیجیٹل گیجٹس، اسمارٹ فونز اور ورچوئل رئیلٹی جیسے شعبے بھی جدید سائنس کی اولین ترجیحات میں شامل ہو چکے ہیں، حالانکہ دنیا کی اکثریت صحت، خوراک اور بنیادی سہولتوں کے لیے ترس رہی ہے۔ بڑی کمپنیاں اور حکومتیں مل کر ایسے آلات اور سافٹ ویئر بنا رہی ہیں جو انسانوں کی حقیقی زندگی سے ان کا رشتہ کمزور کر رہے ہیں اور انہیں مصنوعی دنیا میں محصور کر رہے ہیں۔ غریب ممالک میں لوگ بھوک اور افلاس کا شکار ہیں، مگر ان کے ہاتھوں میں مہنگے فون اور جدید ٹیکنالوجی کے آلات موجود ہیں، جو صرف ان کی ذہنی الجھنوں اور اخلاقی زوال میں اضافے کا باعث بن رہے ہیں۔ یوٹیوب، ٹک ٹاک، انسٹاگرام اور دیگر ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے لوگوں کو اخلاقی، عقیدتی اور تہذیبی لحاظ سے کمزور کر دیا ہے، اور وہ اپنی اصل زندگی کی بہتری پر توجہ دینے کے بجائے مصنوعی شہرت اور عارضی تفریح میں گم ہو چکے ہیں۔

کاسمیٹک اور جمالیاتی سرجری جیسے سائنس کے شعبے بھی استعماری سرمایہ داری کے لیے انتہائی منافع بخش ثابت ہو رہے ہیں، حالانکہ یہ کسی حقیقی انسانی مسئلے کو حل نہیں کرتے۔ بڑی بڑی کمپنیاں اور میڈیکل انڈسٹری خوبصورتی کے نئے معیارات طے کر رہی ہیں، تاکہ لوگوں کو اپنے قدرتی وجود سے غیر مطمئن کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمایا جا سکے۔ یہ سارا نظام انسان کی فطری خوبصورتی کو غیر اہم بنا کر اس پر غیر ضروری دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ

اپنی شکل وصورت کو سرمایہ دارانہ معیار کے مطابق ڈھالنے کے لیے بھاری سرمایہ خرچ کرے، جبکہ وہی سرمایہ بھوک، صحت اور تعلیم پر خرچ کیا جاسکتا تھا۔

اسلحہ سازی اور جدید جنگی ٹیکنالوجی کے میدان میں سائنس کی بے تحاشا ترقی بھی ایک واضح مثال ہے کہ کیسے سرمایہ دارانہ طاقتوں نے اپنی مرضی کی ترجیحات متعین کی ہیں۔ کروڑوں لوگ جنگوں کے نتیجے میں بے گھر ہو رہے ہیں، لاکھوں افراد بھوک اور غذائی قلت کا شکار ہیں، مگر سائنس کا پیسہ اور محنت مہلک ہتھیاروں، ڈرونز اور جنگی مشینری بنانے میں لگائی جا رہی ہے، جو انسانوں کو تحفظ دینے کے بجائے انہیں مزید خطرات میں ڈال رہی ہے۔ استعماری قوتیں جدید سائنس کے ذریعے ایسے ہتھیار بنارہی ہیں جو پوری پوری آبادیوں کو مٹانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جبکہ انہی وسائل سے دنیا بھر کے غریبوں کے مسائل حل کیے جاسکتے تھے۔

بائیو ٹیکنالوجی اور جینیٹک انجینئرنگ کو بھی جدید ترین سائنسی ترقی میں شمار کیا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی زیادہ تر استحصالی قوتوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ اس ٹیکنالوجی کو عام انسان کی صحت بہتر بنانے کے بجائے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ بڑی دواساز کمپنیاں ایسی دوائیں اور ویکسین بنارہی ہیں جن کا اصل مقصد بیماریوں کو جڑ سے ختم کرنا نہیں بلکہ مریضوں کو مستقل صارف بنانا ہے تاکہ وہ ساری زندگی ان دوائیوں پر انحصار کرتے رہیں اور کمپنیوں کو مسلسل منافع ملتا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صحت عامہ کی

صورتحال بگڑ رہی ہے، اور بیماریاں ختم ہونے کے بجائے مزید پیچیدہ شکل اختیار کر رہی ہیں۔

جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے تحت ایسے شعبے بھی پیدا کیے جا رہے ہیں جو انسان کی حقیقی ضرورت سے زیادہ نفسیاتی اور جذباتی کمزوریوں کو بڑھانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ سوشل میڈیا الگورتھمز اور نیورو مارکیٹنگ کے ذریعے صارفین کی نفسیات پر کنٹرول حاصل کرنے کا عمل سرمایہ دارانہ دنیا میں ایک اعلیٰ سائنسی مہارت کے طور پر دیکھا جاتا ہے، حالانکہ یہ لوگوں کی آزادی، خودمختاری اور شعوری فیصلوں کو محدود کرنے کی ایک استحصالی حکمتِ عملی ہے۔ ایسی تکنیکیں تیار کی جا رہی ہیں جو لوگوں کی توجہ کو مستقل طور پر اپنی جانب مرکوز رکھیں، ان کی سوچنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت کو محدود کر دیں اور انہیں غیر محسوس طریقے سے سرمایہ دارانہ مصنوعات اور ثقافت کے دائرے میں قید کر دیں۔

تفریح اور کھیل کود کے میدان میں بھی سائنسی ترقی کو ایک بڑی کامیابی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، لیکن حقیقت میں یہ زیادہ تر استعماری مقاصد کو تقویت دینے کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ کھیلوں کی صنعت کو اتنا زیادہ تجارتی رنگ دے دیا گیا ہے کہ اب یہ جسمانی صحت اور تفریح کا ذریعہ کم اور مالی منفعت کا ایک بڑا میدان زیادہ بن چکی ہے۔ عالمی کھیلوں کے بڑے ایونٹس، جیسے اولمپکس اور فیفا ورلڈ کپ، حقیقی معنوں میں عوامی فلاح سے زیادہ مخصوص طاقتور طبقات کے لیے منافع بخش کاروبار بن چکے ہیں۔ دوسری طرف، کھیلوں کو اس قدر حد سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ نوجوان اپنی تعلیم اور عملی زندگی کو چھوڑ کر

صرف ان مصنوعی مقابلوں میں مشغول ہو جاتے ہیں جو در حقیقت ان کے مستقبل کے لیے کوئی ٹھوس فائدہ نہیں رکھتے، بلکہ ان کی صلاحیتوں کو ضائع کرنے کا ایک طریقہ بن چکے ہیں۔

ورچوئل اور آگمینٹڈ ریئلٹی جیسی ٹیکنالوجیز کو بھی انسانی ترقی کے لیے ایک بڑی کامیابی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، حالانکہ یہ حقیقت سے فرار اور مصنوعی دنیا میں پناہ لینے کا ایک خطرناک ذریعہ بن چکی ہیں۔ ان ٹیکنالوجیز کے ذریعے نوجوان نسل کو حقیقت کے میدان میں جدوجہد کرنے کے بجائے مصنوعی اور خیالی دنیا میں قید کر دیا گیا ہے، جہاں وہ غیر حقیقی تجربات کو اصل زندگی سے زیادہ ترجیح دینے لگتے ہیں۔ اس سے ایک ایسی نسل تیار ہو رہی ہے جو عملی میدان میں ناکام، جذباتی طور پر ناپختہ، اور حقیقی دنیا کی مشکلات سے نمٹنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہے۔ سرمایہ دارانہ مفادات کے تحت اس ٹیکنالوجی کو عام کیا جا رہا ہے تاکہ انسانوں کو حقیقت سے بے خبر رکھ کر ان کا ذہنی اور فکری استحصال کیا جا سکے۔

خلائی تحقیق اور بین الاقوامی اسپیس پروگرامز کو بھی ترقی کی معراج سمجھا جاتا ہے، حالانکہ زمین پر رہنے والے اربوں انسان ابھی تک بنیادی ضروریات کے لیے ترس رہے ہیں۔ مہنگے ترین خلائی منصوبوں پر کھربوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں جبکہ انہی وسائل سے دنیا میں بھوک، غربت اور بیماری کے خلاف جنگ لڑی جا سکتی تھی۔ سرمایہ دارانہ اقوام کے لیے چاند اور مریخ پر بستیاں بسانا زیادہ ضروری ہو چکا ہے، جبکہ زمین پر بسنے والے بے شمار انسان پینے کے صاف پانی سے بھی محروم ہیں۔ یہ ترقی در حقیقت انسانی ضروریات کے برعکس محض

ایک طاقت کی دوڑ اور وسائل پر قبضے کی حکمتِ عملی کا حصہ ہے، جہاں اصل مقصد انسانیت کی فلاح نہیں بلکہ مخصوص طاقتوں کے مستقبل کو محفوظ بنانا ہے۔

جدید ذہنی صحت کے نظریات اور سائیکوتھراپی کو بھی اس انداز میں فروغ دیا جارہا ہے کہ اس سے انسانوں کو اصل مسائل کی جڑ تک پہنچنے کی ترغیب دینے کے بجائے انہیں وقتی سکون اور مصنوعی طریقوں میں الجھا دیا گیا ہے۔ انسانوں کے ذہنی دباؤ اور نفسیاتی مسائل کی اصل وجوہات کو ختم کرنے کے بجائے ایسی دوائیں اور تکنیکیں عام کر دی گئی ہیں جو وقتی سکون تو دیتی ہیں، مگر اصل مسائل کا کوئی دیرپا حل فراہم نہیں کرتیں۔ سرمایہ دارانہ نفسیات کا مقصد انسان کو ذہنی طور پر مضبوط اور باوقار بنانا نہیں، بلکہ اسے ایک ایسا صارف بنانا ہے جو ہمیشہ کسی نہ کسی مصنوعی علاج یا سہولت پر انحصار کرتا رہے۔

موسمیاتی تبدیلیوں کے خلاف سائنس اور ٹیکنالوجی کو ایک نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے، لیکن حقیقت میں ماحولیاتی بحران کا اصل سبب یہی سرمایہ دارانہ صنعتی نظام ہے، جو زیادہ سے زیادہ منافع کے لیے زمین کے وسائل کا بے دریغ استحصال کر رہا ہے۔ کاربن کریڈٹس، گرین انرجی اور دیگر نام نہاد ماحولیاتی منصوبے درحقیقت بڑی کارپوریشنز کے لیے مزید سرمایہ کاری کے مواقع پیدا کر رہے ہیں، جبکہ اصل ماحولیاتی مسائل جوں کے توں موجود ہیں۔ دینِ فطرت کی تعلیمات کے مطابق، اگر انسان سادہ طرزِ زندگی اختیار کرے اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگی میں رہے تو کسی پیچیدہ سائنسی حل کی ضرورت ہی نہ پڑے، مگر سرمایہ داری نے اس مسئلے کو بھی کاروباری موقع میں تبدیل کر دیا ہے۔

جدید سائنس و ٹیکنالوجی میں ایسے نئے رجحانات متعارف کرائے جارہے ہیں جو بظاہر ترقی کے نام پر آگے بڑھ رہے ہیں لیکن در حقیقت انسانی فطرت اور سماجی توازن کو بگاڑنے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ مصنوعی ذہانت (AI) اور خودکار نظاموں کو اس قدر فروغ دیا جارہا ہے کہ انسان کی سوچنے، فیصلہ کرنے اور عملی میدان میں محنت کرنے کی صلاحیت ہی ماند پڑ رہی ہے۔ مشینوں اور سافٹ ویئرز کو انسانی ذہانت پر فوقیت دے کر ایسا ماحول بنایا جارہا ہے کہ لوگ خود انحصاری اور مہارت کے بجائے صرف ان مشینی نظاموں پر انحصار کرنے لگیں جو چند مخصوص طاقتور اداروں کے کنٹرول میں ہیں۔ اس کے نتیجے میں لاکھوں افراد اپنی ملازمتوں سے محروم ہو رہے ہیں، ذہنی طور پر سست اور غیر ذمہ دار ہو رہے ہیں، اور فیصلہ سازی کی صلاحیت کھو رہے ہیں، کیونکہ ہر مسئلے کا حل محض ایک بٹن دبانے تک محدود کر دیا گیا ہے۔

جینیاتی انجینئرنگ اور بایو ٹیکنالوجی کے میدان میں بھی ایسی ایجادات اور تجربات کیے جا رہے ہیں جو انسان کی حیاتیاتی اور اخلاقی ساخت کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ مصنوعی طور پر انسانی جینز میں تبدیلیاں کرکے ایسے افراد پیدا کیے جارہے ہیں جن کی فطرت، شناخت اور صلاحیتیں کسی مخصوص طاقت کے کنٹرول میں ہوں۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے اس شعبے کو ایسے تجرباتی میدان میں بدل دیا ہے جہاں اخلاقیات اور قدرتی اصولوں کو پس پشت ڈال کر ایک ایسی مصنوعی نسل تخلیق کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو مخصوص قوتوں کے مفادات کے مطابق کام کرے۔ یہ رجحان معاشرتی تقسیم اور عدم توازن میں مزید اضافہ

کرے گا، جہاں ایک طبقہ "اعلیٰ" جینیاتی صلاحیتوں کا مالک ہو گا اور دوسرا طبقہ عام انسانوں کی طرح کمتر تصور کیا جائے گا۔

ڈیجیٹل کرنسیوں اور مالیاتی ٹیکنالوجیز کو ترقی کا ایک نیا زینہ قرار دیا جارہا ہے، حالانکہ ان کا اصل مقصد عالمی مالیاتی نظام کو چند بڑی طاقتوں کے کنٹرول میں دینا ہے۔ کرپٹو کرنسی اور مرکزی بینکوں کے ڈیجیٹل کرنسی منصوبے درحقیقت ایسی مالیاتی غلامی کو فروغ دے رہے ہیں جہاں فرد کی ہر خرید و فروخت اور مالی سرگرمی پر گہری نگرانی رکھی جا سکے اور اسے کسی بھی وقت نظام سے نکال کر بے بس کیا جا سکے۔ نقدی کے خاتمے کی مہم کے پیچھے یہ مقصد کارفرما ہے کہ ہر شخص ایک ڈیجیٹل شناخت کا محتاج ہو، جو حکومتوں اور کارپوریٹ طاقتوں کے مکمل کنٹرول میں ہو۔

تعلیمی نظام میں بھی جدید ٹیکنالوجی کو اس انداز میں متعارف کرایا جارہا ہے کہ طلبہ اور اساتذہ کے درمیان اصل علمی تعلق کمزور ہو جائے۔ ای لرننگ پلیٹ فارمز اور آن لائن تعلیمی ماڈلز کو فروغ دے کر کتابی مطالعہ، گہرے غور و فکر اور استاد شاگرد کے براہ راست علمی ربط کو کمزور کیا جارہا ہے۔ نتیجتاً، ایک ایسی نسل تیار ہو رہی ہے جو محض معلومات جمع کرنے پر توجہ دے رہی ہے لیکن حکمت، تجزیہ اور تنقیدی سوچ سے محروم ہو رہی ہے۔ تعلیم، جو ایک سماجی اور اخلاقی ذمہ داری تھی، اسے ایک تجارتی صنعت میں بدل دیا گیا ہے، جہاں معیار اور حقیقی علم سے زیادہ ڈیجیٹل سہولیات کو اہمیت دی جارہی ہے۔

تفریحی صنعت میں ورچوئل اور ڈیجیٹل کلچر کو اس حد تک غالب کر دیا گیا ہے کہ لوگ حقیقی زندگی کے سماجی، خاندانی اور اخلاقی معاملات سے کٹتے جا رہے ہیں۔ میٹاورس جیسی ٹیکنالوجیز کے ذریعے لوگوں کو ایک ایسی مصنوعی دنیا میں دھکیلا جا رہا ہے جہاں وہ حقیقت سے کٹ کر محض ایک ڈیجیٹل شناخت میں گم ہو جائیں۔ حقیقی انسانی تعلقات، خاندانی اقدار اور سماجی رشتے کمزور ہو رہے ہیں، کیونکہ سرمایہ داری کا ہدف یہ ہے کہ ہر شخص ایک ورچوئل دنیا میں مشغول رہے اور حقیقی دنیا کے مسائل اور ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند نہ کرے۔

حیاتیاتی اور ڈیجیٹل نگرانی کے نظام کو ترقی کا سنگ میل قرار دیا جا رہا ہے، لیکن حقیقت میں یہ افراد کی نجی زندگی پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کی ایک سازش ہے۔ اسمارٹ شہروں اور بائیو میٹرک شناخت کے نام پر ایک ایسا ماحول بنایا جا رہا ہے جہاں ہر فرد کی نقل و حرکت، طرزِ زندگی، گفتگو، مالی لین دین، اور حتیٰ کہ جسمانی سرگرمیوں تک کی نگرانی ممکن ہو سکے۔ یہ نظام آزادی کے بجائے مکمل غلامی اور کنٹرول کا ایک ایسا طریقہ ہے جہاں کسی بھی شخص کو محض ایک ڈیٹا پوائنٹ کے طور پر دیکھا جائے اور اس کے جذبات، خیالات اور نظریات کو مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔

یہ تمام مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ جدید سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے پیچھے جو ذہنیت کام کر رہی ہے، وہ دراصل حقیقی انسانی فلاح کے بجائے مخصوص مفادات کے گرد گھومتی ہے۔ انسانیت کے اصل مسائل، جیسے بھوک، غربت، جہالت، صحت، اور سماجی انصاف، کو حل کرنے کے بجائے غیر ضروری اور مصنوعی ترجیحات کو ترقی کا معیار بنا دیا گیا ہے۔ سرمایہ

دارانہ سائنس کا ہدف انسان کو زیادہ خود مختار اور باشعور بنانے کے بجائے اسے ایک ایسی مشین میں تبدیل کرنا ہے جو ہر وقت کسی نہ کسی نظام کی محتاج بنی رہے اور اپنی اصل فطری زندگی سے دور ہو جائے۔

یہ تمام سائنسی شعبے استعماری سرمایہ داری کی مسلط کردہ ترجیحات ہیں، جنہیں انتہائی ضروری اور ناگزیر قرار دے دیا گیا ہے، حالانکہ یہ عام انسانوں کے بنیادی مسائل حل کرنے میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کرتے۔ اس کے برعکس دینِ فطرت انسانیت کی حقیقی فلاح کی طرف توجہ دلاتا ہے، جو بھوک مٹانے، صحت عامہ کو بہتر بنانے، سادگی اور فطری طرزِ زندگی اپنانے، اور سماجی انصاف کے قیام میں مضمر ہے۔ سرمایہ دارانہ سائنس نے انسان کو اس کے اصل مسائل سے غافل کر کے اسے ان غیر ضروری ترجیحات میں الجھا دیا ہے، جہاں وہ اپنی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو بھول کر ایک ایسی دوڑ میں شامل ہو گیا ہے جس کا انجام مزید انتشار، ظلم اور اخلاقی زوال کے سوا کچھ نہیں۔ یہ تمام شعبے ظاہر کرتے ہیں کہ جدید سائنسی ترقی کی سمت درحقیقت انسانی فلاح و بہبود کے بجائے مخصوص طاقتوں کے مفادات کے تابع ہو چکی ہے۔ ان نام نہاد ترقیوں کے نتیجے میں عام انسان کی زندگی آسان ہونے کے بجائے مزید پیچیدہ اور غلامی کے شکنجے میں جکڑی جا رہی ہے۔ دینِ فطرت کی تعلیمات کے مطابق، اصل ترقی وہ ہے جو انسان کی اخلاقی، روحانی اور سماجی بہتری کے لیے ہو، نہ کہ وہ جو چند مخصوص افراد کو طاقتور اور باقی دنیا کو کمزور بنانے کے لیے کی جائے۔

پریشانی نہ ہونا نعمت ہے

زندگی میں فکر ایک نعمت بھی ہے اور بسا اوقات آزمائش بھی۔ جو لوگ زیادہ سوچتے ہیں، وہ اکثر اپنی ہی سوچوں کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ہر معاملے پر اتنا غور کرتے ہیں کہ اکثر منفی پہلوؤں میں الجھ جاتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں، حالات اور رشتوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اپنے اندر یہ یقین پیدا کریں کہ وہ تنہا نہیں ہیں۔ دنیا میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو ان سے محبت کرتے ہیں، چاہے وہ اسے براہ راست محسوس نہ کر پائیں، مگر یہ محبت بہر حال ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ انسان بعض اوقات اپنی پریشانیوں میں اتنا گم ہو جاتا ہے کہ وہ ان تعلقات اور احساسات کو دیکھنے سے قاصر ہو جاتا ہے جو اس کے گرد موجود ہوتے ہیں۔

ہر مشکل جو انسان پر آتی ہے، وہ اسے مضبوط بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ جس سے گزر کر انسان آج یہاں تک پہنچا ہے، کبھی وہ بھی ناممکن لگتا تھا، مگر پھر بھی اس نے اس کا سامنا کیا اور اسے عبور کیا۔ یہی حقیقت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ موجودہ حالات اور آنے والی مشکلات کا بھی سامنا کر سکتا ہے اور کامیابی سے ان سے نکل سکتا ہے۔ کبھی کبھی دل کا بے چین ہونا اور پریشانی میں مبتلا ہونا بھی فطری ہے، مگر اسے خود پر حاوی کر لینا نقصان دہ

ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جب بھی کوئی تکلیف یا الجھن ہو، اسے کسی اپنے کے ساتھ باٹنا جائے، کیونکہ خاموش رہنے سے مسئلہ بڑھتا ہے، حل نہیں ہوتا۔

انسان اکثر سوچتا ہے کہ شاید وہ دوسروں کے لیے غیر اہم ہے یا اس کی موجودگی کی کوئی خاص قدر نہیں، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جو لوگ اس کے قریب ہوتے ہیں، وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی پرواہ کرتے ہیں، چاہے وہ الفاظ میں اس کا اظہار نہ بھی کریں۔ ہر انسان کسی نہ کسی کے لیے بہت اہم ہوتا ہے اور یہ احساس ہی اسے مضبوطی عطا کرتا ہے۔ جو لوگ زیادہ سوچتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی توجہ مثبت خیالات اور تعمیری سرگرمیوں کی طرف رکھیں تاکہ ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت متوازن رہے۔

انسان کی سب سے بڑی آزمائش اس کی اپنی ہی سوچیں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات، اس کا ذہن خوف، خدشات اور بدترین امکانات کو حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے، جبکہ درحقیقت ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ذہن کے پیدا کردہ وسوسے ہوتے ہیں جو حقیقت سے بہت دور ہوتے ہیں، اس لیے ان پر یقین کرنا خود کو بلاوجہ پریشانی میں مبتلا کرنا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ انسان اپنے ذہن پر قابو پائے اور ان خیالات کو تسلیم کرنے کے بجائے ان کا تجزیہ کرے کہ کیا یہ واقعی حقیقت پر مبنی ہیں یا صرف ایک بے بنیاد وسوسہ؟

یہ سوچنا کہ دوسروں کو ہماری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں، ایک بے بنیاد خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہمیں چاہتے ہیں، وہ ہماری باتیں سننے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے اپنے خیالات کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا اور اپنی پریشانیوں کو دل میں رکھنے کے

بجائے ان پر بات کرنا نہ صرف دل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے بلکہ اس کا ایک عملی حل بھی نکالنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

زندگی کی مشکلات کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہوں، ان سے نکلنے کا واحد راستہ صبر، حوصلہ اور مستقل مزاجی ہے۔ ہر آزمائش کا ایک وقت ہوتا ہے اور ہر اندھیرے کے بعد روشنی ضرور آتی ہے۔ ضروری یہ ہے کہ انسان خود پر بھروسہ رکھے اور ہر چیز کو ایک وقت اور ترتیب کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرے۔ جو بھی مشکل آج ہے، وہ ہمیشہ نہیں رہے گی، اور جو آج ناممکن لگتا ہے، وہ کل ممکن بن سکتا ہے، بس ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان ہمت نہ ہارے اور ایک ایک قدم آگے بڑھتا رہے۔

زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کسی نہ کسی آزمائش سے گزر رہا ہوتا ہے۔ بظاہر جو لوگ خوشحال اور مطمئن دکھائی دیتے ہیں، وہ بھی اپنے دل میں کوئی نہ کوئی پریشانی، خوف یا درد رکھتے ہیں۔ مگر زیادہ سوچنے والے افراد دوسروں کی زندگیوں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاید وہی سب سے زیادہ مشکلات میں ہیں اور باقی سب مکمل طور پر خوش ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کسی نہ کسی مرحلے پر اپنی پریشانیوں، خدشات اور الجھنوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی زندگی کا موازنہ دوسروں سے کرنے کے بجائے اپنے اندر موجود نعمتوں کو پہچاننا اور ان پر شکر ادا کرنا ہی اصل سکون کا راستہ ہے۔

ہر پریشانی کا ایک حل ہوتا ہے اور ہر مشکل وقت کے ساتھ گزر جاتا ہے، مگر جب انسان ضرورت سے زیادہ سوچنے لگے تو وہ اپنے مسائل کو حقیقت سے زیادہ بڑا محسوس کرنے لگتا

ہے۔ بعض اوقات ایک چھوٹا سا مسئلہ بھی انسان کے دماغ میں بار بار دہرانے کی وجہ سے اتنا بڑا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ اس کے قابو سے باہر نظر آتا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ انسان اپنی سوچوں کو قابو میں رکھے اور ان خیالات کو جگہ نہ دے جو بے بنیاد ہوں یا حقیقت سے دور ہوں۔ اگر کسی چیز پر قابو نہیں پایا جا سکتا تو اسے اللہ کے سپرد کر دینا اور اس پر بھروسہ رکھنا ہی سب سے بہترین حل ہوتا ہے۔

انسانی جذبات کا اتار چڑھاؤ زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ بعض دن اچھے گزرتے ہیں، بعض برے، مگر یہ وقت کا پہیہ ہے جو کبھی ایک حال پر نہیں رہتا۔ اسی طرح، جو پریشانیاں آج بے حد بڑی لگ رہی ہیں، چند سال بعد وہ معمولی لگیں گی، کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان سیکھتا اور آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی لمحہ مشکل محسوس ہو رہا ہے تو اسے حتمی نہ سمجھا جائے، بلکہ یہ یقین رکھا جائے کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔

جو لوگ زیادہ سوچتے ہیں، ان کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ وہ اپنے جذبات اور خیالات کو تنہا اپنے ذہن میں قید نہ کریں بلکہ انہیں کسی ایسے فرد کے ساتھ بانٹیں جو ان کی بات کو سمجھ سکے۔ بعض اوقات محض بات کرنے سے ہی انسان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور اسے ایسے زاویے نظر آتے ہیں جو تنہا سوچنے کے دوران اس کے ذہن میں نہیں آتے۔ اپنی پریشانیوں کو اندر رکھنا اور خود کو تنہا محسوس کرنا انسان کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے، اس لیے اپنے جذبات کا اظہار کرنا اور مدد لینا حکمت اور عقلمندی کی نشانی ہے۔

بہت زیادہ سوچنے والے افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی توانائی کو مثبت سمت میں لگائیں۔ کسی مفید مشغلے میں وقت گزارنا، عبادات میں دل لگانا، کسی کے ساتھ اپنی خوشیاں بانٹنا یا فطرت کے قریب جانا، یہ سب چیزیں ذہنی دباؤ کو کم کرنے اور غیر ضروری سوچوں سے نجات حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ جب انسان خود کو کسی مثبت سرگرمی میں مشغول رکھتا ہے تو اس کے ذہن میں بے جا خیالات کے لیے جگہ کم ہو جاتی ہے اور وہ خود کو ہلکا اور بہتر محسوس کرتا ہے۔

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ دنیا میں کوئی بھی مکمل طور پر آزاد اور بے فکر نہیں ہوتا۔ ہر ایک کو اپنی زندگی میں کسی نہ کسی چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر اصل بات یہ ہے کہ کون کس انداز میں ان چیلنجز کا سامنا کرتا ہے۔ جو لوگ اپنی زندگی میں مثبت سوچ کو اپناتے ہیں اور ہر مسئلے کو ایک نئے سبق کے طور پر لیتے ہیں، وہی زندگی میں آگے بڑھتے ہیں اور خوش رہنے کا ہنر سیکھ جاتے ہیں۔ اس لیے زیادہ سوچنے والے افراد کو خود کو اس وہم میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اکیلے ہیں یا ان کی زندگی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے، بلکہ انہیں اپنی زندگی کو قبول کرتے ہوئے اس کے مثبت پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

توحید کا وسیلہ اور شرک سے کیا مراد ہے؟

انسانی تاریخ میں خدا کے ساتھ تعلق اور اس کی بندگی کے اظہار کے مختلف طریقے سامنے آئے ہیں۔ ان میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ خدا نے بعض ہستیوں، مقامات، یا اشیاء کو اپنے قرب اور عظمت کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ ان کے ذریعے خدا کی تعظیم اور بندگی کا اظہار کیا جاتا ہے، اور یہ تصور قرآن، حدیث، اور مستند تاریخ میں واضح طور پر موجود ہے۔

قرآن مجید میں خدا نے کئی مرتبہ اپنی نشانیوں (آیات) کا ذکر کیا ہے، جن کے ذریعے انسان کو اس کی ذات اور عظمت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، خانہ کعبہ کو "بیت اللہ" کہا گیا ہے، جو خدا کے لیے مخصوص گھر ہے۔ اس کی تعظیم درحقیقت خدا کی تعظیم ہے، اور اس کا طواف، نماز، اور عبادت انسان کو خدا کے قریب لے جاتی ہے۔ سورۃ الحج میں فرمایا گیا: "اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مقرر کی تا کہ وہ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں دیے ہیں" (22:34)۔ یہ قربانی بھی خدا کی یاد اور اس کے قرب کے حصول کا ذریعہ ہے۔

انبیاء، اولیاء، اور اماموں کو بھی خدا نے اپنی ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ بنایا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے خدا کے حکم پر خانہ کعبہ کو پاک کیا تا کہ وہاں آنے والے لوگ عبادت کر سکیں (البقرہ:125)۔ انبیاء کو

خدا کی جانب سے مخصوص حیثیت دی گئی، اور ان کی اطاعت دراصل خدا کی اطاعت ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: "جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، وہ درحقیقت اللہ کی اطاعت کرتا ہے" (4:80)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنی اطاعت کو اپنے نمائندوں کی اطاعت سے مربوط کیا ہے۔

تاریخی روایات میں بھی ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں خدا کی تعظیم کے لیے بعض ہستیوں یا مقامات کو مخصوص کیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کو تابوت سکینہ کی تعظیم کا حکم دیا گیا، جس میں خدا کی طرف سے سکون اور برکت موجود تھی (البقرہ:248)۔ اسی طرح، حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کی قمیص کو آنکھوں پر رکھ کر بینائی پائی، جو خدا کی جانب سے ایک معجزہ اور نشانی تھی (یوسف:93)۔

احادیث میں بھی یہ تصور واضح ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اہل بیتؑ خدا کی جانب سے ہدایت کے چراغ ہیں اور ان کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔ یہ محبت محض جذباتی تعلق نہیں بلکہ خدا کی قربت کا ذریعہ ہے۔ حضرت علیؑ کے بارے میں نبی کریمؐ کا ارشاد ہے: "جس کا میں مولا ہوں، علی اس کا مولا ہے"۔ یہ حدیث اس بات کی غماز ہے کہ علیؑ کی ولایت خدا کی ولایت کا تسلسل ہے۔

اسلامی تاریخ میں بھی یہ روایت موجود ہے کہ صحابہ کرام نبی کریمؐ کی ذات سے برکت حاصل کرتے تھے۔ وہ آپؐ کے وضو کے پانی کو متبرک سمجھتے، آپؐ کے بالوں کو محفوظ

رکھتے، اور آپؐ کے وجود کو خدا کی رحمت کا مظہر مانتے تھے۔ یہ سب کچھ اس عقیدے کی بنیاد پر تھا کہ نبیؐ خدا کی نشانی ہیں، اور ان کی تعظیم درحقیقت خدا کی تعظیم ہے۔

یہ تمام شواہد اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ خدا نے بعض ہستیوں، مقامات، اور اشیاء کو اپنے قرب اور عظمت کے اظہار کے لیے مخصوص کیا ہے۔ ان کی تعظیم اور ان کے ذریعے مانگنا دراصل خدا ہی کی تعظیم اور اس سے تعلق کا اظہار ہے۔ ان تمام اعمال کا مقصد خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرنا اور اس کے حکم کے مطابق زندگی گزارنا ہے، نہ کہ کسی ہستی کو خدا کے مقام پر لے جانا۔ جو لوگ ان ہستیوں کی تعظیم کو شرک سمجھتے ہیں، وہ دراصل خدا کی جانب سے مقرر کردہ اصولوں اور نشانیوں کو صحیح معنوں میں سمجھنے سے قاصر ہیں۔

اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ خدا واحد و یکتا ہے، اور اس کی ذات، صفات، اور افعال میں کوئی شریک نہیں۔ "غیر اللہ" سے مراد وہ تمام ہستیاں، اشیاء، یا تصورات ہیں جنہیں خدا کی ذات کے مقابلے میں رکھا جائے یا ان کے بارے میں وہ اعتقادات رکھے جائیں جو صرف خدا کے لیے مخصوص ہیں۔ شرک سے مراد یہی ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور کو وہ مقام دیا جائے جو خدا کا حق ہے، خواہ یہ عقیدہ کسی ہستی کے بارے میں ہو، کسی تصور یا نظام کے بارے میں ہو، یا کسی عمل کے ذریعے ظاہر کیا جائے۔

شرک کی کئی صورتیں ہیں جنہیں قرآن اور حدیث میں واضح کیا گیا ہے۔ ایک بنیادی شکل "شرک فی الذات" ہے، یعنی خدا کے ساتھ کسی اور کو ذات میں شریک کرنا، جیسے یہ عقیدہ رکھنا کہ خدا کے علاوہ کوئی اور بھی مستقل طور پر خودمختار اور خالق ہے۔ مشرکین مکہ کے

متعلق قرآن کہتا ہے: "اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے" (لقمان: 25)۔ اس کے باوجود وہ بتوں کو خدا کے شریک ٹھہراتے تھے۔

دوسری شکل "شرک فی الصفات" ہے، یعنی خدا کی صفات جیسے علم، قدرت، حاکمیت، یا رزق دینے کو کسی اور کے لیے مخصوص کرنا۔ یہ بھی شرک ہے کہ کسی مخلوق کو خدا کی صفات میں شریک کیا جائے یا یہ مانا جائے کہ خدا کے علاوہ کوئی اور ان صفات میں خود مختار ہے۔

تیسری شکل "شرک فی العبادت" ہے، یعنی عبادت کو کسی اور کے لیے خاص کرنا یا خدا کی عبادت کے ساتھ کسی اور کو شامل کرنا۔ قرآن نے واضح طور پر حکم دیا: "اور صرف اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ" (نساء: 36)۔ مشرکین عبادت کے اعمال، جیسے دعا، قربانی، یا طواف، کو اپنے بتوں یا دیگر مخلوقات کے لیے مختص کرتے تھے، جو شرک کی ایک واضح شکل ہے۔

اسلام میں "غیر اللہ" کا مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم وسیلہ اور شریک کے درمیان واضح فرق کریں۔ قرآن اور سنت رسولؐ ہمیں سکھاتے ہیں کہ اللہ نے اپنی رحمت اور ہدایت کے لیے کچھ برگزیدہ ہستیوں کو ذریعہ بنایا ہے، تاکہ لوگ ان کے وسیلے سے راہِ ہدایت حاصل کر سکیں۔ یہ ہستیاں، جیسے انبیاء، ائمہ اہل بیتؑ اور قرآن، اللہ کے مقرر کردہ ذرائع ہیں جو انسان کو حق تک پہنچاتے ہیں۔ ان کا وسیلہ اختیار کرنا کوئی نیا عمل نہیں بلکہ خود

قرآن میں اس کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ فرماتا ہے " :وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ "(المائدہ: 35)، یعنی" اللہ تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو۔"

رسول اللہؐ کی سیرت ہمیں یہی درس دیتی ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندے خود اللہ کے اذن سے ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جب ایک نابینا شخص رسول اکرمؐ کے پاس بینائی کے لیے آیا تو رسولؐ نے اسے دعا سکھائی کہ وہ اللہ سے مانگے اور آپؐ کو وسیلہ بنائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وسیلہ اختیار کرنا وہ طریقہ ہے جو خود رسول اللہؐ نے سکھایا۔ اسی طرح، جب صحابہ کرام کسی مشکل میں ہوتے تو نبی کریمؐ کے وسیلے سے دعا کرتے اور اللہ ان کی مشکلات کو حل فرما دیتا۔

ائمہ اہل بیتؑ نے بھی ہمیشہ اس بات کو واضح کیا کہ وسیلہ شرک تب بنتا ہے جب کسی ہستی کو اللہ کی طرح خود مختار سمجھا جائے، یعنی یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ ہستی بغیر اللہ کے اذن کے کوئی اختیار رکھتی ہے۔ لیکن اگر کوئی اللہ کی دی ہوئی قدرت اور اس کے اذن کے تحت کسی برگزیدہ ہستی سے مدد مانگے تو یہ عین توحید ہے، کیونکہ اللہ ہی نے ان ہستیوں کو ذریعہ بنایا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا" : ہم اللہ کے بندے ہیں اور اس کے اذن سے اس کے بندوں کی ہدایت کرتے ہیں"، جو اس حقیقت کو مزید واضح کرتا ہے کہ اہل بیتؑ کا وسیلہ اللہ کی مرضی اور نظام کا حصہ ہے، نہ کہ کوئی مستقل اختیار رکھنے والا عمل۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر وسیلہ لینا شرک ہوتا تو خود رسول اللہؐ اور ائمہ معصومینؑ لوگوں کو اس سے منع کرتے، لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ صحابہ اور اہل ایمان ہمیشہ نبی اکرمؐ اور ان کے

اہلبیتؑ سے مدد کے طالب رہے اور وہ اللہ کی مرضی کے تحت ان کی حاجات روا کرتے رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وسیلہ اختیار کرنا ایک قرآنی اور نبوی عمل ہے، جبکہ شرک تب ہوتا ہے جب کسی کو اللہ کے برابر سمجھ لیا جائے، جو کہ سراسر گمراہی ہے۔

شرک کی ایک اور شکل "شرک فی الحاکمیت" ہے، یعنی خدا کی حاکمیت اور قانون سازی کو چھوڑ کر کسی اور نظام کو اختیار کرنا۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: "کیا وہ اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم بناتے ہیں، حالانکہ اس نے تم پر تفصیل سے حکم نازل کیا ہے" (انعام:114)۔ جب انسان اپنی خواہشات، سماجی روایات، یا غیر الٰہی قوانین کو خدا کے قانون کے برابر یا اس سے بالاتر رکھتا ہے، تو یہ شرک کی ایک قسم بن جاتی ہے۔

لہٰذا، "غیر اللہ" وہ ہستیاں یا تصورات ہیں جنہیں خدا کے برابر یا اس کے مقابلے میں کھڑا کیا جائے۔ شرک اس وقت ہوتا ہے جب خدا کے مخصوص حقوق یا صفات کو کسی اور کے لیے مختص کر دیا جائے، یا کسی مخلوق کو خدا کے برابر سمجھا جائے۔ شرک ایک روحانی، فکری، اور عملی بیماری ہے، جس سے بچنے کے لیے قرآن بار بار توحید کی حقیقت اور خدا کی صفات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

جدید علم ابلاغیات اور تہذیب و ثقافت، استعمار اور اسلام

جدید علم ابلاغیات اور تہذیب و ثقافت میں کئی ایسی مہارتیں اور رسوم کو رواج دیا گیا ہے جو استعماری سرمایہ داری کے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے ڈیزائن کی گئی ہیں۔ ان کو مہارت یا تہذیب کا نام دے کر مقبول بنایا جاتا ہے، جبکہ حقیقت میں دین فطرت کے مطابق یہ فریب، گمراہی اور برائی کے زمرے میں آتی ہیں۔

ابلاغیات میں ایک بڑی چال "رائے عامہ کی تشکیل میں جذباتی استحصال" ہے۔ آج میڈیا، اشتہارات اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کو اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ عوام کی سوچ کو غیر محسوس طریقے سے قابو میں رکھا جائے۔ سرمایہ دارانہ ابلاغیات میں یہ ایک اعلیٰ مہارت سمجھی جاتی ہے کہ کس طرح الفاظ، تصاویر، ویڈیوز اور بیانیے کے ذریعے عوام کے جذبات کو بھڑکایا جائے اور انہیں مخصوص ایجنڈے کے مطابق سوچنے پر مجبور کیا جائے۔ خبریں، تفریحی مواد اور تجزیے سب ایک مخصوص سمت میں ڈھالے جاتے ہیں تاکہ لوگ غیر محسوس انداز میں کسی مصنوع، نظریے یا پالیسی کی حمایت کرنے لگیں۔ دین فطرت ہمیں عقل و شعور کے استعمال کی تلقین کرتا ہے اور بغیر تحقیق کسی بات پر یقین کرنے یا جذبات میں بہکنے کو گمراہی قرار دیتا ہے۔

ابلاغی چالاکیوں میں ایک اور بڑا حربہ "جھوٹ کو آدھے سچ میں لپیٹ کر پیش کرنا" ہے۔ خبروں، تجزیوں اور ڈاکیومینٹریز میں ایسا مواد شامل کیا جاتا ہے جو کسی سچائی کا جزوی حصہ تو ہوتا ہے، لیکن اصل حقیقت کو چھپانے کے لیے مخصوص انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ کسی بھی واقعے یا مسئلے کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ سچائی کو مکمل طور پر جاننے کے بجائے مخصوص رخ سے دیکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ مہارت آج کے میڈیا ہاؤسز، فلم انڈسٹری اور سوشل میڈیا انفلوئنسرز کی بنیاد ہے، جو سرمایہ دارانہ طاقتوں کے مفاد میں بیانیہ تشکیل دیتے ہیں۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ حق اور باطل کو خلط ملط کرنا فریب ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو گمراہ قرار دیتا ہے جو سچ کو چھپاتے اور جھوٹ کو فروغ دیتے ہیں۔

تہذیب و ثقافت کے میدان میں ایک اہم حربہ "بے مقصد تفریح کو مہذب طرز زندگی کا حصہ بنانا" ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ایسی تفریح کو ترقی دی جاتی ہے جو انسانی فکری و روحانی ارتقا کے بجائے اسے مزید غفلت میں مبتلا کر دے۔ سینما، موسیقی، ویڈیو گیمز، سوشل میڈیا چیلنجز، اور فیشن شوز جیسے رجحانات کو کامیاب زندگی کا لازمی حصہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے، تاکہ لوگ ان سرگرمیوں میں کھو کر حقیقت پسندانہ اور بامقصد زندگی سے دور ہو جائیں۔ دین فطرت زندگی کو ایک سنجیدہ امتحان سمجھنے کی دعوت دیتا ہے، جہاں ہر لمحہ ایک امانت ہے اور فضول چیزوں میں ضائع کرنے کے بجائے نیکی اور اصلاح میں صرف کیا جانا چاہیے۔

ایک اور استعماری ہتھکنڈہ "فحاشی اور بے حیائی کو آزادی کے نام پر فروغ دینا" ہے۔ جدید تہذیب میں لباس، فیشن، فلموں، سوشل میڈیا اور عوامی رویوں میں عفت و حیا کو دقیانوسی تصور کر کے ترک کیا جا رہا ہے۔ اس بات کو "ذاتی آزادی" کا نام دیا جاتا ہے کہ انسان کو کسی بھی طرز کا لباس پہننے، کسی بھی طرح کا اظہار کرنے اور کسی بھی قسم کی تفریح میں ملوث ہونے کا مکمل اختیار ہونا چاہیے، چاہے وہ سماجی اخلاقیات اور روحانی ترقی کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچائے۔ دین فطرت کے مطابق حیا اور پاکیزگی انسان کے روحانی مقام کو بلند کرنے کا ذریعہ ہیں، اور بے حیائی کو شیطانی راستہ قرار دیا گیا ہے جو معاشرتی فساد اور تباہی کا باعث بنتا ہے۔

ابلاغیات اور ثقافت میں ایک اور سازش "روایتی خاندانی نظام کو دقیانوسی بنا کر پیش کرنا" ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے مفاد میں یہ ہے کہ افراد کو خاندان اور مذہبی اقدار سے آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ مارکیٹ کے صارفین بن کر صرف اپنی انفرادیت اور خواہشات کے پیچھے دوڑیں۔ اس کے لیے گھریلو ذمہ داریوں کو جبر، والدین کی فرمانبرداری کو غلامی، اور خاندانی وابستگی کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔ میڈیا اور تعلیمی نصاب میں ایسا مواد شامل کیا جاتا ہے جو نوجوان نسل کو والدین اور روایتی اخلاقی اقدار سے بغاوت کی ترغیب دے۔ جبکہ دین فطرت میں والدین کا احترام، خاندانی یکجہتی، اور نسلوں کی اخلاقی تربیت کو اولین حیثیت دی گئی ہے۔

ان تمام چالاکیوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان دین فطرت کے اصولوں سے دور ہو کر استعماری سرمایہ داری کے ایک بے شعور پرزے میں تبدیل ہو جائے، جو صرف نظام کے

فائدے کے لیے کام کرے اور کبھی اس استحصالی نظام کو چیلنج نہ کرے۔ دین فطرت ہمیں خود آگاہی، حق کی تلاش اور شعوری زندگی گزارنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ ہم کسی کے ذہنی غلام نہ بنیں بلکہ اللہ کی بندگی میں ہی حقیقی آزادی پائیں۔

آج کے دور میں "عوامی ذہن سازی کے لیے سوشل انجینئرنگ" کو ایک مؤثر حکمت عملی قرار دیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اس کو ایک سائنسی مہارت کے طور پر سکھایا جاتا ہے کہ کس طرح لوگوں کی سوچ، ترجیحات اور رویوں کو غیر محسوس انداز میں تبدیل کیا جائے۔ یہ تبدیلی نہ صرف میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے بلکہ تعلیم، ثقافتی پروگراموں اور پالیسی سازی کے ذریعے بھی نافذ کی جاتی ہے۔ ایک ایسا ماحول پیدا کیا جاتا ہے جس میں مخصوص نظریات، عادات اور ترجیحات کو "نارمل" اور "معیاری" بنا دیا جائے، جبکہ روایتی اور دینی اقدار کو پسماندہ اور دقیانوسی قرار دیا جائے۔ دین فطرت کے مطابق انسان کی فطری ساخت اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر ہے، اور شعوری دھوکہ دہی یا عوام کی سوچ کو زبردستی بدلنے کی کوشش گناہ اور ظلم کے زمرے میں آتی ہے۔

ایک اور بڑی چال "سوشل میڈیا پر مصنوعی شہرت اور مقبولیت کا کاروبار" ہے۔ آج کے دور میں فالوورز، لائکس، وائرل ویڈیوز، اور ڈیجیٹل انفلوئنس کو کامیابی اور مہارت کا معیار بنا دیا گیا ہے۔ لوگ اپنی حقیقت سے زیادہ، اپنی ڈیجیٹل شناخت کو بنانے میں مصروف ہیں، اور سوشل میڈیا پر جھوٹے تصورات اور مصنوعی طرزِ زندگی کو پیش کرنے میں مہارت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ عمل نہ صرف فریب اور خود نمائی کا باعث بنتا ہے بلکہ دوسروں کو حسد،

مایوسی اور ناپسندیدگی کے جذبات میں مبتلا کرتا ہے۔ دین فطرت کے مطابق ریاکاری، خود پسندی اور جھوٹ پر مبنی زندگی اختیار کرنا اخلاقی اور روحانی زوال کا سبب ہے، جبکہ حقیقت، سادگی اور اخلاص کو پسند کیا گیا ہے۔

"من پسند سچائی تخلیق کرنے" کو بھی آج کی جدید مہارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ علمی و فکری دنیا میں ایک ایسا رجحان پیدا کیا گیا ہے جس میں حقیقت کو مسخ کر کے مخصوص نظریات کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔ تاریخ، سماجی حقائق اور سائنسی تحقیقات کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ مخصوص مفادات کی حمایت کریں۔ تعلیمی نصاب میں سے وہ تمام عناصر نکال دیے جاتے ہیں جو استعماری نظام پر تنقید یا دین فطرت کی سچائی کو نمایاں کریں۔ یوں، ایک ایسی نسل تیار کی جا رہی ہے جو حقیقت سے بے خبر اور مخصوص بیانیوں کی غلام ہو۔ دین فطرت ہمیں تحقیق، تدبر اور سچائی کی تلاش کا حکم دیتا ہے اور علم کی تحریف کرنے والوں کے بارے میں سخت وعید بیان کرتا ہے۔

"چکاچوند اور برانڈ کلچر" کو کامیابی اور سوشل اسٹیٹس کی علامت بنا دیا گیا ہے۔ ایک ایسی سوچ عام کی جا رہی ہے کہ مہنگے برانڈز کا استعمال، مہنگی تقریبات اور پر تعیش زندگی گزارنا ہی حقیقی کامیابی ہے۔ لوگ اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنے اور دوسروں کو متاثر کرنے کی دوڑ میں لگ چکے ہیں، جبکہ اسراف اور فضول خرچی دین فطرت میں سختی سے منع کی گئی ہے۔ سرمایہ داری نے اس مہارت کو "مارکیٹنگ اور سیلز اسکلز" کا حصہ بنا کر رائج کر دیا ہے تاکہ صارفین ہمیشہ غیر ضروری چیزوں کے پیچھے دوڑتے رہیں۔

"منافقت کو حکمت عملی کے طور پر اپنانا" بھی جدید دنیا میں ایک مہارت سمجھی جاتی ہے۔ آج کی سیاست، سفارت کاری اور کاروباری دنیا میں لوگ دوہری زبان اور دوہرے معیار کو کامیابی کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ ایک مخصوص محفل میں ایک نظریہ پیش کرنا اور دوسری جگہ اس کے برعکس مؤقف اختیار کرنا ایک "سوشل اسکل" کے طور پر سکھایا جارہا ہے۔ دین فطرت میں نفاق اور دھوکہ دہی کو سختی سے منع کیا گیا ہے، اور دوغلے پن کو بدترین گناہ شمار کیا گیا ہے۔

"بچوں کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کو مارکیٹ کے حوالے کر دینا" آج کے سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے خطرناک پالیسیوں میں شامل ہے۔ والدین کو یہ باور کرایا جارہا ہے کہ بچوں کی پرورش اور تربیت اسکولز، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور تفریحی صنعت کی ذمہ داری ہے۔ بچوں کو میڈیا، کارٹونز، ویڈیو گیمز، اور ڈیجیٹل کانٹینٹ کے حوالے کرکے مطمئن ہونے کی روش نے ایک ایسی نسل پیدا کر دی ہے جو روحانی و اخلاقی اقدار سے ناواقف اور صرف مارکیٹ کے تقاضوں کے مطابق پروان چڑھ رہی ہے۔ دین فطرت بچوں کی اخلاقی تربیت کو والدین کی اولین ذمہ داری قرار دیتا ہے اور انہیں ایسے ماحول میں پروان چڑھانے کا حکم دیتا ہے جو ان کے کردار کو مضبوط اور متوازن بنائے۔

"مصنوعی تنازعات اور تفریق پیدا کرنا" ایک ایسی مہارت بن چکی ہے جسے جدید میڈیا اور سیاست میں بخوبی استعمال کیا جاتا ہے۔ سرمایہ داری کے مفادات کے تحت لوگوں کو مسلکی، نسلی، لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ ان کی اجتماعی طاقت کمزور ہو جائے۔

میڈیا اور سوشل میڈیا پر جھوٹی خبریں، متنازع بیانات اور اشتعال انگیز مواد پھیلایا جاتا ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہیں۔ دین فطرت ہمیں وحدت، بھائی چارے اور صلح جوئی کی تلقین کرتا ہے اور فتنے وفساد پھیلانے والوں کے لیے سخت وعید سناتا ہے۔

"ذہنوں کو کنٹرول کرنے کے لیے تفریحی صنعت کا استعمال" آج کے دور میں ایک کامیاب ہنر سمجھا جاتا ہے۔ فلموں، ڈراموں، موسیقی، اور سوشل میڈیا مواد کے ذریعے لوگوں کے خیالات، ترجیحات اور طرزِ زندگی کو مخصوص سمت میں موڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی کہانیاں اور کردار تخلیق کیے جاتے ہیں جو دین، اخلاق اور روحانی اقدار کو غیر اہم بنا کر مادہ پرستی، خود غرضی اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ زندگی کو فروغ دیتے ہیں۔ دین فطرت ہمیں تفریح میں اعتدال، مقصدیت اور حلال ذرائع کو اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے جبکہ بے مقصد اور اخلاق سوز مشغولیات کو گمراہی قرار دیتا ہے۔

"احساسِ شرمندگی اور جرم سے نجات کے لیے نظریاتی جواز پیدا کرنا" ایک اور چالاکی ہے جو آج کی فکری دنیا میں مہارت سمجھی جاتی ہے۔ ایسے فلسفے اور نظریات تشکیل دیے جاتے ہیں جو انسان کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہر طرح کی خواہش کی تکمیل فطری ہے اور کسی بھی عمل کو گناہ یا برائی سمجھنا دقیانوسی سوچ ہے۔ "اپنی سچائی خود تخلیق کرو"، "جو دل چاہے وہی صحیح ہے" جیسے نعروں کے ذریعے لوگوں کو مذہب اور اخلاقی اصولوں سے بیزار کیا جاتا ہے۔ دین فطرت ہمیں حق اور باطل کے واضح اصول عطا کرتا ہے اور ایسی گمراہ کن تاویلات کو رد کرتا ہے جو برائی کو نیکی کے طور پر پیش کریں۔

"بد کرداری اور فحاشی کو تخلیقی اظہار قرار دینا" آج کے فنونِ لطیفہ میں عام ہو چکا ہے۔ سرمایہ داری کے تحت ایسی فلمیں، اشتہارات اور مواد تخلیق کیے جا رہے ہیں جن میں بے حیائی، اخلاقی پستی اور جنسی بے راہ روی کو آزادی اور تخلیقی صلاحیت کے اظہار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ اگر وہ ان روایات کی مخالفت کریں تو وہ پسماندہ اور جاہل سمجھے جائیں گے۔ دینِ فطرت نے حیا اور پاکدامنی کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے اور فحاشی کو انسانیت کے زوال کی بڑی علامت کہا ہے۔

"انسان کی قیمت صرف اس کی معاشی حیثیت سے جوڑ دینا" سرمایہ داری کی ایک خطرناک سازش ہے۔ لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ عزت، مقام اور رتبہ صرف مال و دولت اور بیرونی کامیابی سے وابستہ ہے۔ ایسا ماحول پیدا کیا جاتا ہے جس میں اخلاق، علم، تقویٰ اور نیکی کی کوئی وقعت نہیں رہتی بلکہ صرف وہی فرد قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے جو معاشی طور پر کامیاب ہو۔ یہ سوچ غریبوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر کے سرمایہ داری کے شکنجے میں جکڑنے کا ایک حربہ ہے۔ دینِ فطرت کے مطابق عزت اور قدر کا معیار صرف تقویٰ اور اخلاقی بلندی پر مبنی ہے نہ کہ دولت اور مادی کامیابی پر۔

"زندگی کے تمام پہلوؤں کو ایک پرفارمنس میں بدل دینا" جدید سوشل میڈیا اور پروفیشنل دنیا میں ایک لازمی مہارت بنا دی گئی ہے۔ لوگوں کو ہر وقت خود کو پیش کرنے، اپنی زندگی کو دکھاوے کی شکل میں ڈھالنے، اور حقیقت کی بجائے ایک مخصوص "برانڈڈ" شخصیت بنانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عبادات اور خیرات جیسے اعمال بھی دکھاوے کے لیے

کی جانے لگتے ہیں تا کہ زیادہ سے زیادہ تعریف اور توجہ حاصل ہو۔ دین فطرت ہمیں اخلاص، سادگی اور عاجزی کا درس دیتا ہے اور ریاکاری کو ایک خطرناک بیماری قرار دیتا ہے جو نیکیوں کو برباد کر دیتی ہے۔

"مفاد پرستی اور تعلقات کو صرف مواقع کے طور پر دیکھنا" آج کے کارپوریٹ کلچر اور جدید معاشرتی زندگی میں ایک اہم مہارت شمار کی جاتی ہے۔ لوگوں کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ ہر تعلق، چاہے وہ دوستی ہو، شادی ہو یا کسی بھی سطح پر انسانی تعلق ہو، اسے صرف ذاتی فائدے کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اگر کوئی رشتہ یا تعلق مالی یا سماجی فائدہ نہ دے رہا ہو تو اسے ختم کر دینا ہی عقلمندی ہے۔ یہ سوچ لوگوں کے درمیان خلوص، ایثار اور وفاداری کے جذبات کو ختم کر کے انہیں محض خود غرض افراد میں بدل دیتی ہے۔ دین فطرت ہمیں بے لوث محبت، صلہ رحمی اور تعلقات میں اخلاص کی تعلیم دیتا ہے اور مفاد پرستی کو ایک اخلاقی بیماری قرار دیتا ہے جو انسان کو روحانی طور پر تباہ کر دیتی ہے۔

"خوف اور عدم تحفظ کے جذبات کو معاشی و سماجی کنٹرول کے لیے استعمال کرنا" آج کے سرمایہ دارانہ نظام میں ایک بنیادی اصول بن چکا ہے۔ میڈیا، مارکیٹنگ اور سیاست کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خوف پیدا کیا جاتا ہے کہ اگر وہ مخصوص طرزِ زندگی اختیار نہیں کریں گے، مخصوص برانڈز نہیں خریدیں گے، یا جدید سماجی رجحانات کے مطابق خود کو ڈھالیں گے تو وہ معاشرے میں پیچھے رہ جائیں گے اور بے وقعت ہو جائیں گے۔ اس خوف کو بڑھا کر کنزیومر کلچر اور غیر ضروری اخراجات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے تا کہ لوگ ہمیشہ

عدم اطمینان کا شکار رہیں اور نظام کے تابع رہیں۔ دین فطرت خوف سے نجات کا ذریعہ توکل علی اللہ اور قناعت کو قرار دیتا ہے اور ظاہری چمک دمک کی بجائے باطنی سکون اور تقویٰ کو انسان کی اصل دولت بتاتا ہے۔

"غیر ضروری قانونی پیچیدگیوں اور ضابطوں کے ذریعے انصاف کو مہنگا اور ناقابلِ حصول بنانا" ایک ایسا استعماری حربہ ہے جسے آج کی جدید دنیا میں مہارت کا نام دیا جاتا ہے۔ قانون اور عدالتی نظام کو اتنا پیچیدہ اور مہنگا بنا دیا جاتا ہے کہ ایک عام آدمی کے لیے انصاف کا حصول تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے، جبکہ دولت مند اور طاقتور افراد اپنے وسائل کے ذریعے ان قوانین کا فائدہ اٹھا کر خود کو ہر سزا سے بچا لیتے ہیں۔ اس کو قانونی مہارت اور وکالتی چالاکی کہا جاتا ہے جبکہ درحقیقت یہ ظلم اور ناانصافی کو ایک باقاعدہ نظام کے تحت فروغ دینے کا طریقہ ہے۔ دین فطرت انصاف کو ہر فرد کا بنیادی حق قرار دیتا ہے اور ایسے نظام کی شدید مذمت کرتا ہے جو امیر اور غریب کے لیے الگ الگ اصول بنائے۔

"تعلیم کو کاروبار بنا کر علم کو صرف مالی مفاد کا ذریعہ بنانا" جدید دنیا میں سب سے بڑی نام نہاد مہارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ استعماری سرمایہ داری نے تعلیمی اداروں کو علم کی روشنی پھیلانے کے بجائے صرف منافع کمانے کے مراکز میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں تعلیم ایک مقدس فریضہ نہیں بلکہ ایک پروڈکٹ بن چکی ہے جو صرف مخصوص مالی حیثیت رکھنے والے لوگ حاصل کر سکتے ہیں۔ یونیورسٹیوں اور اسکولوں میں طالب علموں کی فکری اور اخلاقی تربیت کی بجائے انہیں مارکیٹ کے لیے "پیشہ ورانہ مصنوعات" کے طور پر تیار کیا جاتا ہے تاکہ وہ

سرمایہ دارانہ نظام کی مشینری میں ایک موثر پرزہ ثابت ہو سکیں۔ دین فطرت میں علم کو عبادت کا درجہ حاصل ہے اور اسے ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے جو سب کے لیے برابر ہونا چاہیے، نہ کہ امیر اور غریب کے درمیان فرق ڈالنے کا ایک ہتھیار۔

"عوامی رائے کو ہموار کرنے کے لیے پروپیگنڈا تکنیکوں کا استعمال" آج کی جدید دنیا میں میڈیا اور سیاست کا ایک لازمی ہنر بن چکا ہے۔ جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنا، مخصوص نظریات کو جذباتی انداز میں مسلط کرنا، غلط کاموں کو درست ثابت کرنے کے لیے سوشل سائنسز اور میڈیا کے حربے استعمال کرنا، یہ سب جدید ابلاغی مہارتوں میں شامل ہے۔ عوام کو مسلسل پروپیگنڈا کا شکار بنا کر انہیں اس حد تک ذہنی غلامی میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ وہ استعماری طاقتوں کے خلاف سوچنے کے قابل بھی نہ رہیں۔ دین فطرت میں سچائی کو اولین درجہ دیا گیا ہے اور جھوٹ اور دھوکہ دہی کو کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے، چاہے وہ کسی بھی مقصد کے تحت ہو۔

" معاشرتی قبولیت کے لیے مصنوعی شخصیت اپنانا" جدید سوشل میڈیا اور پروفیشنل دنیامیں کامیابی کی علامت بن چکا ہے۔ لوگوں کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ اصل شخصیت سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آپ خود کو کس طرح پیش کرتے ہیں۔ اس کے لیے جعلی رویے، مصنوعی مسکراہٹیں، جھوٹے دعوے اور غیر حقیقی طرزِ زندگی اپنانے کی ترغیب دی جاتی ہے تاکہ لوگ زیادہ مقبول ہو سکیں یا زیادہ مواقع حاصل کر سکیں۔ اس عمل کو سوشل ڈائنامکس اور

امیج مینجمنٹ کی مہارت قرار دیا جاتا ہے، جبکہ درحقیقت یہ نفاق اور ریاکاری کے زمرے میں آتا ہے، جسے دین فطرت سختی سے منع کرتا ہے۔

یہ تمام اور دیگر مہارتیں، رسوم استعماری سرمایہ داری کے تحت اس لیے عام کی جارہی ہیں تاکہ انسان کو اس کی فطرت، سچائی اور روحانی ترقی سے کاٹ کر اپنے مقاصد کے لیے ایک مہرہ بنایا جاسکے۔ دین فطرت ان تمام دھوکہ دہی پر مبنی ہتھکنڈوں کو رد کرتا ہے اور انسان کو حقیقی آزادی، عدل، سچائی اور اخلاقیات پر مبنی زندگی گزارنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ یہ تمام چالاکیاں سرمایہ دارانہ نظام کی وہ مہارتیں اور رسوم ہیں جو درحقیقت انسان کو اس کی فطرت اور دینی شناخت سے دور کرنے کے لیے استعمال کی جارہی ہیں۔ دین فطرت ہمیں ان چالاکیوں کو پہچاننے، ان کے خلاف شعور بیدار کرنے اور اپنی زندگی کو اللہ کی ہدایت کے مطابق ترتیب دینے کی دعوت دیتا ہے۔ استعماری سرمایہ داری نے ابلاغیات اور تہذیب و ثقافت میں مزید ایسی مہارتوں اور رسوم کو فروغ دیا ہے جو بظاہر ترقی، آزادی اور کامیابی کی علامت سمجھی جاتی ہیں، لیکن درحقیقت وہ انسان کی فطرت، اخلاق اور روحانی ترقی کے برخلاف گمراہی اور تباہی کا سبب بنتی ہیں۔

جدید علم سیاسیات، استعمار اور اسلام

جدید علمِ سیاسیات میں کئی ایسی مہارتیں (Skills) کو فروغ دیا جاتا ہے جو استعماری سرمایہ داری کے تحت کامیابی اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں، لیکن دینِ فطرت کے مطابق یہ گناہ اور برائی شمار ہوتی ہیں۔

سیاست میں چالاکی اور دھوکہ دہی کو ایک ضروری مہارت سمجھا جاتا ہے، جہاں حکمران اور سیاستدان عوام کو گمراہ کرنے، وعدے کر کے مکر جانے، اور جھوٹے بیانیے بنا کر اقتدار حاصل کرنے کو کامیابی کی کنجی قرار دیتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اسے "سفارتی مہارت" یا "پولیٹیکل اسٹریٹیجی" کہا جاتا ہے، جبکہ قرآن مجید میں واضح طور پر جھوٹ اور دھوکہ دہی کی مذمت کی گئی ہے" :إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ "(غافر:28) یعنی بے شک، اللہ اس کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا اور جھوٹا ہو۔ امام علیؑ نے بھی فرمایا" :الصِّدْقُ يُنْجِي وَالْكَذِبُ يُرْدِي "یعنی سچائی نجات دیتی ہے اور جھوٹ ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

طاقت اور اقتدار کے لیے منافقت اور دوغلا پن کو سیاست میں ایک ضروری مہارت سمجھا جاتا ہے، جہاں حکمران اور سفارت کار ایک چہرہ عوام کو دکھاتے ہیں اور دوسرا اپنے اصل عزائم کی تکمیل کے لیے رکھتے ہیں۔ اسے "ریئل پالیٹک" یا "ڈپلومیٹک چالاکی" کہا جاتا ہے،

جبکہ قرآن مجید میں منافقین کے بارے میں ارشاد ہے " :إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ) " النساء: 145) یعنی منافقین جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، اور جب امانت دی جائے تو خیانت کرے۔

جدید سیاسیات میں عوامی رائے کو قابو میں رکھنے اور پروپیگنڈا کرنے کو ایک بہترین مہارت سمجھا جاتا ہے، تاکہ عوام کو اصل حقائق سے دور رکھا جائے اور انہیں حکمرانوں کے مفادات کے مطابق سوچنے پر مجبور کیا جائے۔ میڈیا اور سوشل نیٹ ورکس کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اور اس مہارت کو "ماس کمیونیکیشن کنٹرول" یا "پبلک ریلیشنز مینجمنٹ" کہا جاتا ہے۔ دینِ فطرت کے مطابق حق کو چھپانا ایک بڑا گناہ ہے، اور قرآن میں فرمایا گیا ہے " :وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ "(البقرہ:42) یعنی حق کو باطل میں نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر اسے مت چھپاؤ۔

اقتدار کو بچانے کے لیے ظلم، جبر اور سازش کو جدید سیاسی مہارتوں میں شامل کیا جاتا ہے، تاکہ طاقتور گروہ کمزوروں پر حکومت کرتے رہیں۔ سرمایہ داری نظام میں اسے "پاور پولیٹکس" اور "اسٹیٹ کرافٹ" کہا جاتا ہے، جبکہ دینِ فطرت میں ظلم کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " :لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ "(البقرہ:279) یعنی نہ تم ظلم کرو اور نہ

تم پر ظلم کیا جائے۔ امام حسینؑ کا قیام اس بات کی بہترین مثال ہے کہ ظلم کے خلاف کھڑا ہونا ضروری ہے، چاہے اس کے لیے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

سیاست میں مفادات کے تحت فیصلے اور موقع پرستی کو عقل مندی اور دانشمندی سمجھا جاتا ہے، جہاں کوئی مستقل اصول نہیں ہوتے، بلکہ حالات کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں تاکہ اقتدار اور دولت محفوظ رہے۔ اسے "پولیٹیکل فلیکسیبیلیٹی" اور "اپورچونزم" کہا جاتا ہے، جبکہ قرآن مجید میں واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو عدل و انصاف پر ثابت قدم رہنا چاہیے، حتیٰ کہ اگر وہ خود یا ان کے قریبی عزیز ہی خلاف جا رہے ہوں " :يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ "(النساء:135) یعنی اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو اور اللہ کے لیے گواہی دو، چاہے وہ خود تمہارے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف۔

ایک نمایاں مہارت جو سیاسیات میں پروان چڑھائی جاتی ہے وہ "خوف اور عدم تحفظ کی سیاست " ہے۔ استعماری طاقتیں عوام کو مسلسل ایک تصوراتی دشمن سے خوفزدہ رکھتی ہیں تاکہ وہ اپنے مفادات کے مطابق پالیسیوں کو جائز قرار دے سکیں۔ دہشت گردی، بیرونی حملے، معیشت کی تباہی، یا ثقافتی خطرے جیسے تصورات کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ عوام لاشعوری طور پر انہی قوتوں کی طرف تحفظ کے لیے دیکھنے لگیں جو حقیقت میں ان کا استحصال کر رہی ہوتی ہیں۔ اس عمل کو "کرائسز مینجمنٹ" یا "فیئر پولیٹکس" کہا جاتا ہے، جبکہ دین فطرت میں خوف کو ایک ذہنی قید قرار دیا گیا ہے اور صرف اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا

ہے " :إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَٰنُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهُۥ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ "(آل عمران: 175) یعنی یہ شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے، پس ان سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

ایک اور جدید سیاسی مہارت "معاشی استحصال اور قرضوں کی سیاست " ہے، جہاں کمزور اقوام کو ایسے معاہدوں اور مالیاتی پالیسیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ طاقتور اقوام کے محتاج رہیں۔ عالمی مالیاتی ادارے، بینکنگ سسٹم، اور استعماری معاہدے درحقیقت ایک ایسا جال ہیں جو غریب ممالک کو کبھی بھی معاشی خودمختاری حاصل کرنے نہیں دیتے۔ یہ حکمت عملی "ڈیٹ ڈپلومیسی" یا "اکنامک ٹریپنگ" کہلاتی ہے، جبکہ اسلام میں سودی نظام کو کھلم کھلا اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ قرار دیا گیا ہے " :فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ فَأْذَنُوا۟ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ "ۖ (البقرہ:279) یعنی اگر تم (سود سے) باز نہ آئے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔

سیاست میں "ثقافتی تسلط اور فکری غلامی "کو ایک انتہائی موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، جہاں مغربی نظریات، زبان، اور طرزِ زندگی کو دنیا کے دیگر خطوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ تعلیمی نصاب، میڈیا، اور سوشل نیٹ ورکس کے ذریعے افراد کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ترقی یافتہ بننے کے لیے انہیں اپنی مذہبی، ثقافتی اور روایتی اقدار کو ترک کرنا ہوگا۔یہ مہارت "کلچرل ہیجمونی" یا "سافٹ پاور" کے نام سے جانی جاتی ہے، جبکہ قرآن ہمیں دوسروں کی اندھی تقلید سے روکتا ہے " :وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱتَّبِعُوا۟ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُوا۟ بَلْ نَتَّبِعُ

مَآ أَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ ءَابَآءَنَا "(البقرہ:170)یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کی پیروی کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو وہی طریقہ اختیار کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباءواجداد کو پایا۔

ایک اور گہری سازش "افراتفری اور انارکی کو بطور ہتھیار استعمال کرنا "ہے، جہاں ریاستی ادارے اور خفیہ ایجنسیاں خود ہی ایسے بحران پیدا کرتی ہیں جن کے نتیجے میں عوام اضطراب اور خوف کا شکار ہو کر اسی نظام کی مزید محتاج ہو جاتی ہے۔ مصنوعی جنگیں، اندرونی فسادات، اور تقسیم کے بیج بو کر ایک ایسا ماحول بنایا جاتا ہے جہاں لوگ خود سوچنے کی بجائے طاقتور حلقوں پر انحصار کرنے لگیں۔ اس طریقہ کار کو "کنٹرولڈ کیاس "یا "کریئیٹنگ نیڈ فار آڈر" کہا جاتا ہے، جبکہ دینِ فطرت میں امن کو سب سے بڑی نعمت قرار دیا گیا ہے " :وَاللّٰهُ يَدۡعُوٓاْ إِلَىٰ السَّلَٰمِ "(یونس:25)یعنی اللہ امن وسلامتی کی طرف بلاتا ہے۔

جدید سیاست میں "سچ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا "ایک انتہائی اہم مہارت سمجھی جاتی ہے۔ بیانیہ سازی (Narrative Building) کے ذریعے کسی بھی حقیقت کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ طاقتور حلقوں کے حق میں جاتی دکھائی دے۔ میڈیا، لابیز، اور تھنک ٹینکس ایسے الفاظ، جملے، اور اصطلاحات تراشتے ہیں جن کے ذریعے ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو باغی بنا کر پیش کیا جا سکے۔ اس مہارت کو "ڈس انفارمیشن مینجمنٹ" کہا جاتا ہے، جبکہ قرآن میں فرمایا گیا ہے " :وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهِۦ عِلۡمٌۚ إِنَّ ٱلسَّمۡعَ وَٱلۡبَصَرَ وَٱلۡفُؤَادَ كُلُّ

أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔولًا "(الاسراء:36)یعنی جس چیز کا تمہیں علم نہیں، اس کے پیچھے نہ چلو، بے شک کان، آنکھ اور دل، سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

ایک اور اہم سیاسی ہنر جو استعماری طاقتوں نے اپنا رکھا ہے وہ "مصنوعی ہیروز اور دشمن تراشی" ہے۔ یہ تکنیک اس نظریے پر مبنی ہے کہ عوام کو ہمیشہ کسی عظیم نجات دہندہ یا خطرناک دشمن کے تصور میں الجھائے رکھا جائے تاکہ وہ اپنے حقیقی مسائل پر غور نہ کر سکیں۔ کبھی میڈیا کے ذریعے کسی عام سیاستدان یا شخصیت کو مسیحا کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور کبھی غیر ضروری دشمن تخلیق کر کے پوری قوم کو ایک جذباتی جنگ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح عوام کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹا کر بے معنی ایجنڈوں پر مرکوز کر دی جاتی ہے۔ قرآن بارہا ہمیں خبردار کرتا ہے کہ ظالم حکمران عوام کو فریب دینے کے لیے جھوٹے خواب دکھاتے ہیں اور حقیقت سے غافل رکھتے ہیں۔

دھوکہ دہی اور مکاری کی سیاست میں ایک اور نمایاں ہنر "جذباتی بلیک میلنگ کے ذریعے عوام کو قابو میں رکھنا" ہے۔ سیاسی رہنما خود کو قوم کے والدین، مذہبی محافظ یا قومی وقار کا امین ظاہر کر کے عوام کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ہر بحران میں ایسے بیانات دیے جاتے ہیں کہ گویا ان کی مخالفت پورے ملک یا مذہب کی مخالفت کے مترادف ہے، حالانکہ ان کا اصل مقصد صرف اقتدار اور ذاتی مفادات کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس طرزِ سیاست میں معاشرے کے کمزور اور محروم طبقوں کا استحصال کیا جاتا ہے، جبکہ قرآن صاف کہتا ہے کہ قیامت کے دن یہی بڑے لوگ اپنے پیروکاروں سے برأت کا اظہار کریں گے، جیسا کہ فرمایا" :وَإِذْ تَبَرَّأَ

الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا "(البقرہ:166) یعنی جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان سے اظہارِ براءت کریں گے جو ان کے پیروکار تھے۔

ایک اور مہارت جو آج کے سیاستدانوں اور حکمرانوں میں عام ہو چکی ہے وہ "قانونی موشگافیوں کے ذریعے ظلم کو جائز قرار دینا "ہے۔سیاسی اور معاشی ظلم کو قانونی شکل دینے کے لیے ایسے قوانین اور پالیسیز بنائی جاتی ہیں جو ظاہری طور پر انصاف اور ترقی کی علامت دکھائی دیں، مگر حقیقت میں وہ طاقتور طبقے کے مفاد میں ہوتی ہیں۔ سودی نظام کو "بینکاری سہولت"، غریب ممالک کے استحصال کو "عالمی تجارت"، اور سامراجی جنگوں کو "انسانی حقوق کے تحفظ کی مہم" قرار دینا اسی چالاکی کا حصہ ہے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کی شدید مذمت کی گئی ہے جو حق و باطل کو آپس میں خلط ملط کر کے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں اور گمراہی پھیلاتے ہیں۔

ایک انتہائی خطرناک حکمت عملی جو جدید سیاست میں مہارت سمجھی جاتی ہے وہ "فکری انتشار اور کنفیوژن پیدا کرنا "ہے۔عوام کو سچ اور جھوٹ کے درمیان اس قدر الجھا دیا جاتا ہے کہ وہ کسی ایک مؤقف پر قائم نہ رہ سکیں۔ ایک ہی واقعے کے بارے میں متضاد بیانیے گھڑے جاتے ہیں، تعلیمی اداروں میں ایسی تاریخ پڑھائی جاتی ہے جو حقیقی واقعات کو مسخ کر کے پیش کرتی ہے، اور میڈیا پر ایسے مفکرین اور تجزیہ کار بٹھائے جاتے ہیں جو عوام کی فکری رہنمائی کے بجائے انہیں مزید الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ اس حکمت عملی کا مقصد یہ ہے کہ لوگ حقیقت تک پہنچ ہی نہ سکیں اور بالآخر طاقتور حلقوں کی دی گئی معلومات پر ہی بھروسہ

کریں۔ قرآن ایسے لوگوں کو گمراہی پھیلانے والے قرار دیتا ہے جو جھوٹ کو سچ میں ملا کر پیش کرتے ہیں تاکہ عوام دھوکے میں رہیں۔

انسانی نفسیات کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک اور جدید سیاسی ہتھکنڈہ "امید اور خوف کی مصنوعی کشمکش" ہے۔ عوام کو بار بار یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر وہ صبر کریں اور مزید قربانیاں دیں تو جلد ایک روشن مستقبل ان کا منتظر ہو گا، جبکہ دوسری طرف یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ اگر وہ اس نظام کے خلاف آواز اٹھائیں گے تو تباہی اور انتشار کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ یہ تکنیک سرمایہ دارانہ استعمار کے لیے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے وہ عوام کو نہ صرف خاموش رکھتا ہے بلکہ ان سے وہ سب کچھ چھین لیتا ہے جو وہ اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں۔ قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ ظالموں کے وعدے ہمیشہ فریب پر مبنی ہوتے ہیں اور وہ صرف اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے عوام کو دھوکے میں رکھتے ہیں۔

ایک اہم حربہ "سماجی فلاح کے نام پر عوام کو کنٹرول کرنا" ہے۔ سیاست میں یہ مہارت سمجھی جاتی ہے کہ کس طرح عوام کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ حکومت ان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہی ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ صرف مخصوص طبقے کو فائدہ پہنچانے کے لیے منصوبے بناتی ہے۔ عوامی فلاحی منصوبے، سبسڈیز اور امدادی پروگرام درحقیقت سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں تاکہ عوام کو حکمرانوں کا محتاج بنا کر رکھا جائے۔ اس طرح، لوگ حکمرانوں کے ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کے بجائے ان ہی کے

شکر گزار بنے رہتے ہیں۔ قرآن ایسے لوگوں کو خبردار کرتا ہے جو خیرات اور فلاح کے نام پر ریاکاری اور دھوکہ دہی کرتے ہیں اور درحقیقت کمزوروں کے حقوق غصب کرتے ہیں۔

دوسرا حربہ "مسئلہ پیدا کرنا اور پھر اسی کا حل بیچنا" ہے۔ سرمایہ دارانہ سیاست میں یہ ایک اعلیٰ مہارت مانی جاتی ہے کہ پہلے خود مصنوعی بحران پیدا کیے جائیں اور پھر ان کے حل کے طور پر ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے طاقتور طبقات کو مزید فائدہ پہنچے۔ مہنگائی، بے روزگاری، معاشی بحران، سیکیورٹی خدشات، حتیٰ کہ عالمی جنگیں تک اسی حکمت عملی کے تحت پیدا کی جاتی ہیں تاکہ حکومتیں ان کے حل کے نام پر مزید اختیارات اور وسائل حاصل کر سکیں۔ عوام کو بار بار غیر یقینی صورتحال میں مبتلا رکھا جاتا ہے تاکہ وہ ہمیشہ حکومت کی طرف ہی دیکھیں اور ان کے خلاف مزاحمت کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ قرآن میں فرعون کے اس ہتھکنڈے کا ذکر ہے کہ وہ بنی اسرائیل پر ظلم کرتا تھا اور پھر خود کو ان کا محافظ ظاہر کرکے انہیں اپنا محتاج بنا دیتا تھا۔

ایک اور چالاکی "عوامی رجحانات کو قابو میں رکھنے کے لیے مصنوعی مباحث کھڑے کرنا" ہے۔ سیاست میں یہ مہارت سمجھی جاتی ہے کہ لوگوں کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹا کر ایسے غیر ضروری یا غیر حقیقی معاملات میں الجھا دیا جائے جو اصل میں ان کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے ایسے موضوعات پر بحث کروائی جاتی ہے جو محض عوام کو تقسیم کرنے اور ان کی فکری توانائی ضائع کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ان مباحث کا مقصد عوام کو ایسے تنازعات میں الجھانا ہوتا ہے جن کا کوئی عملی فائدہ نہ ہو، جبکہ

پس پردہ حکمران طبقہ اپنے مفادات کے فیصلے کرتا رہتا ہے۔ قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ باطل کے پیروکار ہمیشہ لوگوں کو غیر ضروری بحثوں میں الجھاتے ہیں تاکہ حق کے راستے کو دھندلا دیا جائے۔

سیاسی چالاکیوں میں ایک اور نمایاں مہارت "تشدد کو ایک قابل قبول حکمت عملی کے طور پر پیش کرنا" ہے۔ استعمار ہمیشہ اپنے ایجنڈے کے حق میں یہ جواز پیدا کرتا ہے کہ اگر کسی سیاسی یا معاشی مفاد کے لیے تشدد یا جنگ ضروری ہو تو وہ جائز ہے۔ بغاوتوں، دہشت گردی، اور عسکری کارروائیوں کو قومی سلامتی، امن، اور آزادی کے نام پر جائز بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں لاکھوں بے گناہ مارے جاتے ہیں، لیکن عوام کو یہ یقین دلا دیا جاتا ہے کہ یہ سب "بہتر مستقبل" کے لیے ضروری ہے۔ قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ جو لوگ زمین میں فساد اور خونریزی پھیلاتے ہیں وہ حقیقت میں ظالم ہیں، چاہے وہ اپنے اعمال کے کتنے ہی جواز پیش کریں۔

ایک اور خطرناک حربہ "تعلیمی اور علمی میدان کو مخصوص نظریات کے تابع کر دینا" ہے۔ جدید سیاست میں یہ مہارت سمجھی جاتی ہے کہ تعلیمی نصاب، تحقیق، اور علمی ادارے ایسے طریقے سے کنٹرول کیے جائیں کہ عوام صرف وہی سوچیں جو حکمران چاہتے ہیں۔ تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے، سچائی کو دبایا جاتا ہے، اور ایسی تحقیق کو فروغ دیا جاتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے مفاد میں ہو۔ طلبہ اور اساتذہ کو شعوری طور پر ایسے فکری سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے جن سے وہ خود سرمایہ دارانہ نظام کے مددگار بن جائیں۔ قرآن علم کو حق کی

پہچان کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور ایسی تعلیم کو گمراہی سمجھتا ہے جو انسان کو اللہ کے نور سے دور کر دے۔

یہ تمام نام نہاد مہارتیں درحقیقت وہی چالاکیاں اور فریب ہیں جو استعمار نے اپنی طاقت کو قائم رکھنے کے لیے اپنائے ہیں۔ دینِ فطرت ہمیں ان سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور حق، دیانت داری، اور عدل کو حقیقی قیادت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

یہ تمام مہارتیں جدید سیاست میں کامیابی کی کنجی سمجھی جاتی ہیں، لیکن درحقیقت یہ ظلم، دھوکہ، اور استحصال کے اوزار ہیں جو سرمایہ دارانہ استعمار نے ایجاد کیے ہیں تاکہ اپنے تسلط کو قائم رکھا جا سکے۔ دینِ فطرت ان تمام چالاکیوں کو جھوٹ، دغا اور فریب کے زمرے میں شمار کرتا ہے اور ہمیں حقیقت کی روشنی میں فیصلہ کرنے اور سچائی کا ساتھ دینے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ تمام نام نہاد مہارتیں درحقیقت ظلم، فریب، اور استحصال کے ایسے ہتھیار ہیں جو سرمایہ دارانہ استعمار نے اپنے تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے تشکیل دی ہیں۔ جبکہ دینِ فطرت سچائی، انصاف، دیانت اور حقیقی آزادی کا درس دیتا ہے۔ یہ تمام مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ استعماری سرمایہ داری نے اقتدار، دولت اور دنیاوی مفادات کے تحفظ کے لیے ایسی مہارتوں کو فروغ دیا ہے جو حقیقت میں گناہ اور برائیاں ہیں۔ جبکہ دینِ فطرت ہمیں صداقت، دیانت، عدل، امانت داری، اور ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کا درس دیتا ہے۔

جدید علم نفسیات، استعمار بمقابلہ اسلام

جدید علم نفسیات میں کئی ایسی ذہنی حالتوں اور رویوں کو بیماری یا نفسیاتی مسئلہ قرار دیا گیا ہے جو در حقیقت دینِ فطرت کے مطابق بیماری نہیں بلکہ انسانی فطرت کے تقاضے یا مخصوص ذہنی و روحانی کیفیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ استعماری سرمایہ داری نے اپنے نظام کو مستحکم رکھنے کے لیے بعض نفسیاتی کیفیات کو بیماری کے زمرے میں ڈال دیا ہے تاکہ افراد کو کنٹرول کیا جا سکے اور انہیں مخصوص معیارات کے مطابق ڈھالا جا سکے۔

مثال کے طور پر، جدید نفسیات میں "اوپوزیشنل ڈیفینٹ ڈس آرڈر (ODD) "یعنی نافرمانی یا مزاحمت کو ایک نفسیاتی بیماری سمجھا جاتا ہے، جس میں بچہ یا بالغ فرد حکم نہ ماننے یا اتھارٹی کو چیلنج کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔ جبکہ دینِ فطرت کے مطابق، کسی بھی چیز کو بلا تحقیق قبول نہ کرنا، ظلم کے خلاف کھڑا ہونا اور حق کے لیے آواز بلند کرنا ایک مثبت عمل ہے، نہ کہ کوئی بیماری۔ استعماری سرمایہ داری چونکہ مکمل اطاعت چاہتی ہے، اس لیے ایسے رجحانات کو بیماری کے طور پر پیش کر کے انہیں دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسی طرح "اٹینشن ڈیفیسٹ ہائپر ایکٹیویٹی ڈس آرڈر (ADHD) "کو ایک بیماری کہا جاتا ہے، حالانکہ بعض اوقات یہ صرف بچوں کی قدرتی سرگرمی، تجسس اور توانائی کی زیادتی کا اظہار ہوتا ہے۔ روایتی معاشرتی اقدار میں بچوں کی فطری شرارت اور توانائی کو درست

سمت میں استعمال کرنے کے مواقع دیے جاتے تھے، مگر جدید سرمایہ دارانہ ماڈل میں ایسی توجہ تقسیم کرنے والے بچوں کو "نارمل" بنانے کے لیے دوائیوں پر ڈال دیا جاتا ہے تاکہ وہ تعلیمی اور صنعتی ڈھانچے کے مطابق ایک مشینی انداز میں کام کریں۔

"ڈپریشن" اور "اینزائٹی" جیسے مسائل کا جدید نفسیات میں علاج صرف دوائیوں اور کیمیکل بیلنس کے نظریے کے تحت کیا جاتا ہے، جبکہ دینِ فطرت کے مطابق ان کا ایک اہم تعلق انسانی روحانی و اخلاقی زندگی سے بھی ہے۔ جب انسان اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، قناعت اختیار کرتا ہے، اور دنیاوی حرص وہوس سے بچتا ہے تو اسے اندرونی سکون نصیب ہوتا ہے۔ مگر سرمایہ داری نے ایسے روحانی عوامل کو نظر انداز کرتے ہوئے انسان کو صرف مادی ضروریات اور دنیاوی کامیابی کے پیمانے میں قید کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں ذہنی دباؤ اور اضطراب میں اضافہ ہوتا ہے اور پھر ان مسائل کو بھی کاروباری مفادات کے تحت دوائیوں کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

"اینٹی سوشیل پرسنالٹی ڈس آرڈر" جیسے نفسیاتی عوارض میں بعض ایسی علامات کو بیماری قرار دیا جاتا ہے جو حقیقت میں سرمایہ داری کے خلاف مزاحمت اور فطرت کے قریب زندگی گزارنے کی خواہش ہو سکتی ہیں۔ ایسے افراد جو سرمایہ داری کے بنائے گئے سوشل نیٹ ورک اور طرزِ زندگی کو مسترد کرتے ہیں یا مصنوعی اقدار کو قبول نہیں کرتے، انہیں "سوشلی ان فٹ" قرار دے کر نفسیاتی طور پر بیمار ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ اسی نظام کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں۔

اسی طرح "ہوم سکنیس" یعنی گھر اور خاندان سے شدید محبت کو بھی جدید نفسیات میں بعض اوقات ایک نفسیاتی مسئلہ سمجھا جاتا ہے، جبکہ دین فطرت کے مطابق گھر، خاندان اور ماں باپ سے تعلق رکھنا ایک مثبت انسانی جذبہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام چونکہ افراد کو اپنے کاروباری اور صنعتی ڈھانچے میں مصروف رکھنا چاہتا ہے، اس لیے خاندانی تعلقات میں مضبوطی کو ایک کمزوری کے طور پر پیش کرتا ہے تاکہ لوگ اپنی جڑوں سے کٹ کر مارکیٹ کے محتاج بن جائیں۔

مثال کے طور پر، "پوسٹ ٹرامیٹک اسٹریس ڈس آرڈر (PTSD) " کو ایک انفرادی نفسیاتی مسئلہ قرار دیا جاتا ہے، جبکہ درحقیقت یہ سماجی ناانصافی، جنگوں، استعماریت، اور ظالمانہ نظام کی پیدا کردہ ذہنی کیفیت ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص ظلم، استحصال، یا غیر انسانی سلوک کا شکار ہوتا ہے تو اس کا ذہن فطری طور پر مزاحمت کرتا ہے اور اس کے اثرات دیرپا رہتے ہیں۔ لیکن جدید نفسیات اس کو ایک ایسی بیماری کے طور پر پیش کرتی ہے جسے فرد کی اپنی کمزوری سمجھا جاتا ہے، نہ کہ اس ظلم اور جبر کا نتیجہ جس کا وہ شکار ہوا تھا۔ دینِ فطرت ایسے افراد کے لیے صبر، اجتماعی انصاف، اور حقیقی روحانی سکون کا راستہ پیش کرتا ہے، جبکہ سرمایہ داری انہیں صرف دوائیوں اور تھراپی تک محدود کر دیتی ہے تاکہ وہ دوبارہ اسی ظالمانہ نظام میں فٹ ہو سکیں۔

"سوشل اینزائٹی ڈس آرڈر" کو ایک بیماری کے طور پر دکھایا جاتا ہے، حالانکہ بعض اوقات یہ جدید سوسائٹی کے مصنوعی اور ظاہری پن کے خلاف انسان کی فطری مزاحمت ہوتی ہے۔

دینِ فطرت میں معاشرتی زندگی سادگی، اخلاص اور بھائی چارے پر مبنی ہوتی ہے، جبکہ جدید سرمایہ داری انسانوں کو ایک دوسرے سے مقابلے، دکھاوے، اور غیر فطری سوشل نیٹ ورک میں دھکیلتی ہے، جس کی وجہ سے حساس فطرت رکھنے والے افراد شدید گھبراہٹ محسوس کرتے ہیں۔ مگر بجائے اس کے کہ جدید نظام اپنی بیمار سوسائٹی کا جائزہ لے، وہ ایسے افراد کو ہی ذہنی بیمار قرار دے دیتا ہے اور انہیں دوائیوں اور ماہرینِ نفسیات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔

"بائی پولر ڈس آرڈر" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ذہنی عدم توازن ہے، مگر حقیقت میں یہ سرمایہ دارانہ نظام کی دوغلی فطرت کی عکاسی بھی ہو سکتی ہے، جہاں انسان کبھی بے پناہ جوش و ولولے کے ساتھ کسی مقصد کی طرف بڑھتا ہے اور کبھی شدید مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ دینِ فطرت میں زندگی کا ایک متوازن راستہ دیا گیا ہے جہاں مقصدیت، قناعت، اور اندرونی سکون موجود ہوتا ہے، جبکہ سرمایہ داری لوگوں کو حد سے زیادہ خواہشات، اہداف، اور خواب دکھا کر ان پر دباؤ ڈالتی ہے، اور جب وہ ان میں ناکام ہوتے ہیں تو انہیں ذہنی بیمار قرار دیا جاتا ہے۔

"انسومنیا" یا نیند کی کمی کو نفسیاتی مسئلہ سمجھا جاتا ہے، جبکہ درحقیقت یہ اس صنعتی اور سرمایہ دارانہ زندگی کا نتیجہ ہے جو انسان کو مسلسل کام اور پریشانی میں ڈال کر اس کی فطری نیند اور آرام کو تباہ کر دیتی ہے۔ فطری زندگی میں نیند ایک قدرتی عمل ہوتا ہے، جہاں انسان دن کی مشقت کے بعد سکون سے سو جاتا ہے، لیکن جب زندگی بے ترتیبی، مصنوعی روشنیوں،

ڈیجیٹل اسکرینوں، اور غیر فطری مصروفیات میں گھری ہو تو نیند کا متاثر ہونا ایک فطری امر ہے۔ سرمایہ داری اس کا حل نیند آور گولیوں اور وقتی تدابیر میں ڈھونڈتی ہے، جبکہ دینِ فطرت انسان کو سادہ طرزِ زندگی، رات کو جلدی سونے اور روحانی سکون کی طرف بلاتا ہے، جو کہ اس مسئلے کا حقیقی حل ہے۔

"ہیلوسینیشن" یا واہمے دیکھنے اور سننے کو ذہنی بیماری سمجھا جاتا ہے، حالانکہ بعض اوقات یہ کسی روحانی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر سکتے ہیں۔ دینِ فطرت میں کشف، الہام، اور روحانی مشاہدات کا ایک مضبوط تصور موجود ہے، اور کئی بار انسان کو غیر مرئی چیزوں کا ادراک ہوتا ہے جو جدید مادی سائنس کی گرفت میں نہیں آتے۔ لیکن چونکہ سرمایہ دارانہ استعمار صرف مادی دنیا کو حقیقت مانتا ہے، اس لیے ہر غیر مرئی تجربے کو بیماری قرار دے کر اس کا علاج نیورولوجیکل یا کیمیکل سطح پر تلاش کرتا ہے، حالانکہ بعض تجربات انسان کی روحانی زندگی سے بھی جڑے ہوتے ہیں۔

جدید نفسیات نے کچھ ایسی کیفیات کو بھی بیماری قرار دے دیا ہے جو درحقیقت فطری یا سماجی عوامل کا ردِ عمل ہوتی ہیں، مگر سرمایہ دارانہ نظام کو چیلنج کرنے کے بجائے فرد کو ہی مسئلہ بنا دیا جاتا ہے۔ ایک مثال "اٹینشن ڈیفیسٹ ہائپر ایکٹیویٹی ڈس آرڈر (ADHD) " کی ہے، جہاں بچوں کی فطری چُستی، تخلیقی سوچ، اور آزادانہ حرکت کو ایک نفسیاتی عارضہ سمجھا جاتا ہے۔ صنعتی تعلیمی نظام، جو ایک خاص ترتیب میں بچوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بنایا گیا ہے، ہر ایسے بچے کو "بیمار" قرار دیتا ہے جو اس سانچے میں فٹ نہ آئے، حالانکہ ان بچوں کی توانائی

اور تخلیقی صلاحیتیں کسی قدرتی بیماری کی نہیں، بلکہ ان کے فطری رجحانات کا اظہار ہوتی ہیں۔ دینِ فطرت میں بچوں کی تربیت کا ایک ایسا طریقہ موجود ہے جو ان کی انفرادیت، فطری صلاحیتوں اور متحرک مزاج کو دبانے کے بجائے اس کی درست سمت میں رہنمائی کرتا ہے، جبکہ سرمایہ داری ایسے بچوں کو دوائیوں پر لگانے اور مشینی تعلیم کے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور کرتی ہے۔

"اوپوزیشنل ڈیفائنٹ ڈس آرڈر (ODD) "کو جدید نفسیات ایک ذہنی بیماری قرار دیتی ہے، حالانکہ یہ کسی جابرانہ یا غیر منصفانہ نظام کے خلاف فرد کے فطری ردِ عمل کا مظہر ہوتا ہے۔ جب ایک بچہ یا نوجوان والدین، اساتذہ، یا سماجی ڈھانچوں کے خلاف سوال اٹھاتا ہے، تو بجائے اس کے کہ اس کے خدشات کو سمجھا جائے، اسے بیمار سمجھ کر خاموش کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دینِ فطرت انسان کو فکری آزادی دیتا ہے اور نیکی و بدی میں فرق کرنے کی صلاحیت سکھاتا ہے، جبکہ سرمایہ داری ایسے افراد کو باغی قرار دے کر نفسیاتی علاج تجویز کرتی ہے تاکہ وہ اس کے بنائے ہوئے سانچے میں دب کر رہ جائیں۔

"گیمنگ ڈس آرڈر" کو ایک نفسیاتی بیماری کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ جدید طرزِ زندگی کی بے مقصدیت، سماجی تعلقات کی کمی، اور فرد کی ذہنی فرار کی کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے تفریح کو اس حد تک کنٹرول کر لیا ہے کہ اب لوگ حقیقی دنیا میں سکون اور خوشی تلاش کرنے کے بجائے ورچوئل دنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ دینِ فطرت میں تفریح ایک صحت مند، متوازن اور حقیقی دنیا سے جڑی ہوئی سرگرمی ہوتی

ہے، جہاں انسان کھیل، سماجی تعلقات، اور قدرتی ماحول میں خوشی تلاش کرتا ہے، جبکہ سرمایہ داری انسان کو ایسی تفریح فراہم کرتی ہے جو اسے حقیقت سے مزید دور کر دے اور اس کی ذہنی صلاحیتیں کمزور کر دے۔

"پرفیکشنزم ڈس آرڈر" کو بیماری کا نام دیا جاتا ہے، حالانکہ بعض اوقات یہ انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور کمال پسندی کی علامت ہوتی ہے۔ سرمایہ داری ایسے افراد کو "حد سے زیادہ متفکر" اور "ذہنی دباؤ کا شکار" قرار دیتی ہے، حالانکہ کئی بار یہ لوگ اپنی فطری طور پر دی گئی صلاحیتوں کا درست استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ دینِ فطرت میں کمال پسندی کو ایک مثبت چیز سمجھا گیا ہے، جب تک کہ یہ غیر فطری دباؤ کا باعث نہ بنے، مگر سرمایہ داری کے اندر چونکہ معیار اور کامیابی کی تعریف ہی غیر حقیقی اور تجارتی مفادات پر مبنی ہے، اس لیے وہ ان فطری رجحانات کو بھی بیماری کے زمرے میں ڈال دیتی ہے تاکہ لوگ درمیانے معیار کو قبول کر لیں اور بس صارف بن کر زندگی گزاریں۔

"ایمپیتھی اوورلوڈ" کو بھی ایک ذہنی دباؤ یا بیماری کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ اس بات کی علامت ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص دنیا کے ظلم و ستم، ناانصافی، اور تکلیف دہ حالات کو شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ جب ایک شخص دوسروں کے درد میں شریک ہوتا ہے، تو اسے ایک نفسیاتی مسئلہ قرار دے کر اس کے لیے جذبات کو کم کرنے کی دوائیاں تجویز کی جاتی ہیں۔ سرمایہ داری چاہتی ہے کہ لوگ ظلم اور تکلیف کو محسوس ہی نہ کریں تاکہ وہ کسی بڑی تبدیلی کا مطالبہ نہ کریں۔ جبکہ دینِ فطرت میں دوسروں کے درد کو محسوس کرنا ایک

اعلیٰ انسانی قدر اور ایمان کی علامت ہے، جس کا حل کسی کیفیات کو دبانے میں نہیں بلکہ اصلاحِ معاشرہ میں ہے۔

جدید نفسیات نے "ہائی سینسری سے منسے یٹیوٹی" کو ایک نفسیاتی مسئلہ قرار دیا ہے، حالانکہ یہ بعض افراد کی فطری حسّاسیت اور گہرے مشاہدے کی علامت ہوتی ہے۔ ایسے افراد روشنی، آواز، یا جذباتی اثرات کو عام لوگوں سے زیادہ محسوس کرتے ہیں اور ان کا ردعمل بھی زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ سرمایہ داری چونکہ ایک شور شرابے، تیز رفتار اور غیر فطری ماحول پر مبنی نظام ہے، اس لیے وہ ایسے افراد کو سماجی اور معاشی ڈھانچے کے لیے "غیر موزوں" قرار دے کر ان کے لیے دوائیاں اور تھراپی تجویز کرتی ہے۔ حالانکہ دینِ فطرت میں ان خصوصیات کو ایک نعمت سمجھا گیا ہے، اور ایسے افراد کو زیادہ فکری، روحانی اور تخلیقی امور کے لیے موزوں قرار دیا گیا ہے، جن سے وہ اپنی صلاحیتوں کو درست سمت میں بروئے کار لا سکیں۔

"ہائپومینیا" کو بھی جدید نفسیات میں ایک ذہنی مسئلہ سمجھا جاتا ہے، جس میں کوئی شخص غیر معمولی جوش، توانائی اور سرگرمی دکھاتا ہے۔ سرمایہ داری کا نظام چونکہ ایک کنٹرولڈ ورک فلو چاہتا ہے، جہاں افراد مخصوص اوقات میں مخصوص مقدار میں کام کریں، اس لیے وہ ایسے افراد کو غیر متوازن سمجھ کر ان کی توانائی کو مصنوعی طور پر قابو میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ یہ جوش اور غیر معمولی توانائی کئی بار انقلابی اور تخلیقی ذہنوں کی علامت ہوتی ہے، جو معاشرے میں بڑی تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ دینِ فطرت میں اس توانائی کو مثبت

اور تعمیری سرگرمیوں میں استعمال کرنے کا تصور دیا گیا ہے، مگر سرمایہ داری اسے "حد سے زیادہ متحرک" قرار دے کر بے اثر بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

"ڈے ڈریمنگ ڈس آرڈر" کے نام سے ایک اور اصطلاح قائم کی گئی ہے، جو ان افراد کے لیے استعمال ہوتی ہے جو گہری سوچ میں گم رہتے ہیں یا اپنی خیالی دنیا میں زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ سرمایہ داری میں انسان کو مسلسل ایک مشینی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہے، جہاں اسے پیداوار اور صارفیت کے دائرے میں قید رکھا جاتا ہے۔ ایسے میں جو افراد تخیل اور تصور کی دنیا میں زیادہ وقت گزارتے ہیں، انہیں ایک ذہنی بیماری کا شکار سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ تخیل کی قوت بڑے فلسفیوں، مفکروں اور تخلیق کاروں کی پہچان ہوتی ہے۔ دینِ فطرت میں تدبر اور تفکر کی بہت زیادہ اہمیت بیان کی گئی ہے، اور یہ تصور دیا گیا ہے کہ غور و فکر اور تخیل انسان کو حقیقت کی گہرائیوں تک لے جا سکتا ہے۔

"ڈیپریشن ریسیلینس ڈس آرڈر" کو بھی حالیہ دور میں کچھ ماہرین نے ایک نفسیاتی الجھن کے طور پر پیش کیا ہے، جس میں کوئی شخص شدید دباؤ، مایوسی یا مشکل حالات میں بھی حوصلہ مند اور ثابت قدم رہتا ہے۔ سرمایہ داری کا نظام چونکہ جذباتی عدم استحکام اور کمزوری کو سرمایہ کاری کے ایک موقع کے طور پر دیکھتا ہے، اس لیے وہ ایسے افراد کو جو مشکلات کے باوجود اپنی داخلی طاقت پر یقین رکھتے ہیں، "نارمل" نہیں سمجھتا۔ حالانکہ دینِ فطرت میں صبر، حوصلہ اور داخلی استقامت کو اعلیٰ ترین انسانی اوصاف میں شمار کیا گیا ہے۔

"انسومنیا کری ایٹیویٹی ڈس آرڈر" کو بھی ذہنی بیماریوں میں شامل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، جس میں کچھ افراد رات کو جاگ کر تخلیقی سرگرمیوں میں زیادہ فعال ہوتے ہیں۔ سرمایہ داری کا نظام چونکہ پیداواری شیڈول کے مطابق چلتا ہے اور مخصوص اوقات میں نیند اور مخصوص اوقات میں کام کا مطالبہ کرتا ہے، اس لیے وہ ان تخلیقی ذہنوں کو جو رات کے وقت زیادہ متحرک ہوتے ہیں، ایک بیماری کا شکار قرار دے کر انہیں "نارمل" بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ تاریخ میں بہت سے عظیم مفکرین، ادیب، شاعر اور سائنسدان راتوں کو جاگ کر اپنے بہترین خیالات اور ایجادات تک پہنچے ہیں، اور دینِ فطرت میں بھی رات کے وقت عبادت، غور و فکر اور خلوت کو ایک خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔

"سوشیوپیتھک نان کنفارمٹی" کے نام سے ایک نئی اصطلاح ابھر رہی ہے، جس میں وہ افراد شامل کیے جاتے ہیں جو سماجی روایات، اصولوں یا نظام سے اختلاف رکھتے ہیں اور ان پر بے چوں و چرا عمل نہیں کرتے۔ سرمایہ داری کا نظام چونکہ مکمل اطاعت اور فرمانبرداری پر قائم ہوتا ہے، اس لیے جو لوگ اس کی بنیادی ڈھانچے کو چیلنج کرتے ہیں یا اپنے اصولوں پر ڈٹے رہتے ہیں، انہیں "غیر سماجی"، "عدم مطابقت" اور "نفسیاتی عارضے" کے زمرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ دینِ فطرت میں حق اور باطل کی پہچان اور ناانصافی کے خلاف مزاحمت کو ایک بنیادی اصول کے طور پر بیان کیا گیا ہے، مگر سرمایہ داری ان رجحانات کو دبانے کے لیے انہیں ذہنی بیماریوں کے خانے میں ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔

"ایگزیسٹینشل کرائسس ڈس آرڈر" کو بھی ایک نفسیاتی مسئلہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جس میں کوئی شخص زندگی کے معنی، مقصد اور حقیقت پر سوال اٹھاتا ہے اور اپنی شناخت اور وجود کے بارے میں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام چونکہ انسان کو محض ایک اقتصادی اکائی کے طور پر دیکھتا ہے، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنے وجود کے گہرے سوالات میں نہ الجھیں اور بس ایک عام صارف یا مزدور بن کر زندگی گزاریں۔ جو لوگ اپنی حقیقت، کائنات کے مقصد اور اپنی زندگی کے معنی پر زیادہ غور کرتے ہیں، انہیں نفسیاتی مسائل کا شکار قرار دے کر خاموش کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ دینِ فطرت میں یہی غور و فکر حقیقت کی تلاش اور معرفتِ الٰہی کا بنیادی ذریعہ ہے۔

جدید نفسیات کا ایک اور بڑا فریب یہ ہے کہ وہ "سلف ایمپاورمنٹ سنڈروم" کو ایک ذہنی مسئلہ کے طور پر پیش کرتی ہے، جس میں کوئی شخص اپنی صلاحیتوں، خود اعتمادی اور ذاتی ترقی پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور دوسروں کی محتاجی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ سرمایہ داری چاہتی ہے کہ افراد ہمیشہ کسی نہ کسی سسٹم، ادارے، یا طاقتور طبقے کے محتاج رہیں، اس لیے جو لوگ خود مختاری، خود انحصاری اور اپنی ذہنی و روحانی ترقی پر زیادہ زور دیتے ہیں، انہیں "حد سے زیادہ خود اعتماد" قرار دے کر ایک نفسیاتی مسئلہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ حالانکہ دینِ فطرت میں اپنے نفس کو پہچاننا اور اپنی صلاحیتوں کو نکھارنا ہی حقیقی کامیابی کی راہ دکھاتا ہے۔

جدید نفسیات میں "ہیپی نیس اوبسیشن ڈس آرڈر" کے نام سے ایک نیا مسئلہ متعارف کروایا جا رہا ہے، جس میں وہ افراد شامل کیے جا رہے ہیں جو حقیقی خوشی، سکون اور اندرونی اطمینان

کی تلاش میں ہوتے ہیں اور مادی دنیا کی وقتی خوشیوں کو ناکافی سمجھتے ہیں۔ سرمایہ داری چونکہ سطحی اور مصنوعی خوشی کو فروغ دیتی ہے، جیسے تفریحی صنعت، برانڈ ڈ اشیاء، اور وقتی تسکین کے ذرائع، اس لیے جو افراد گہری خوشی اور دائمی سکون کے متلاشی ہوتے ہیں، انہیں ایک نفسیاتی مسئلہ کا شکار قرار دے کر ان کے سوالات کو بے معنی بنا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ دینِ فطرت میں حقیقی خوشی کو روحانی بالیدگی، عبادت، اور معرفتِ الٰہی سے جوڑا گیا ہے، نہ کہ دنیاوی عیش و عشرت سے۔

"سائلنس ڈس کامفرٹ ڈس آرڈر" کے نام سے ایک اور نفسیاتی مسئلہ بیان کیا جارہا ہے، جس میں وہ افراد شامل ہیں جو خاموشی اور سکون کو پسند کرتے ہیں، تنہائی میں غور و فکر کرتے ہیں اور ہجوم و شور شرابے سے دور رہنے میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ سرمایہ داری ایک ایسا ماحول پیدا کرتی ہے جہاں انسان ہر وقت مصروف اور تفریح میں مشغول رہے، کیونکہ یہ صارفیت اور کاروباری سرگرمیوں کے فروغ کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ تنہائی، خاموشی اور اندرونی سکون کو ترجیح دیتے ہیں، انہیں "سماجی طور پر غیر فعال" اور "ذہنی دباؤ" کا شکار قرار دے کر علاج کروانے کی ترغیب دی جاتی ہے، حالانکہ دینِ فطرت میں خلوت اور سکون کو روحانی ترقی کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے۔

"سلولائف سنڈروم" کو بھی ایک بیماری کے طور پر پیش کیا جارہا ہے، جس میں وہ افراد شامل کیے جاتے ہیں جو تیز رفتاری، مسلسل دوڑ دھوپ اور بے مقصد مصروفیت کے بجائے ایک متوازن اور سادہ زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام افراد کو زیادہ سے

زیادہ کام کرنے، غیر ضروری اہداف حاصل کرنے اور ہمیشہ ایک مقابلے کی فضا میں رکھنے پر مجبور کرتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ صارف بن سکیں۔ جو لوگ اپنی زندگی کو سکون، سادگی، اور قدرتی انداز میں گزارنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں "ناکام"، "کم حوصلہ" یا "ذہنی کاہلی" کا شکار سمجھا جاتا ہے، حالانکہ دینِ فطرت میں سادہ اور متوازن زندگی کو بہترین زندگی قرار دیا گیا ہے۔

"ایمپیتھی اور ایکسٹریم سینسیٹیویٹی ڈس آرڈر" کے نام سے ایک اور اصطلاح رائج کی جا رہی ہے، جس میں وہ افراد شامل ہیں جو دوسروں کے جذبات اور درد کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور ان کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں۔ سرمایہ داری چونکہ ایک بے حس، خود غرض اور نفع پر مبنی نظام ہے، اس لیے جو لوگ دوسروں کے احساسات کو گہرائی سے سمجھتے ہیں، سماجی ناانصافی پر بے چین ہوتے ہیں، اور کسی بھی ظلم یا زیادتی کے خلاف حساسیت کا مظاہرہ کرتے ہیں، انہیں ایک "نفسیاتی مسئلہ" میں ڈال دیا جاتا ہے۔ حالانکہ دینِ فطرت میں ہمدردی، رحم دلی، اور دوسروں کی تکالیف کو محسوس کرنا اعلیٰ انسانی صفات میں شمار ہوتا ہے۔

"ڈیجیٹل ڈیٹاکس ڈس آرڈر" بھی جدید نفسیات میں شامل کیا جا رہا ہے، جس میں وہ افراد آتے ہیں جو ٹیکنالوجی، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل اسکرینوں کے مسلسل استعمال سے بیزار ہو کر ایک سادہ، فطری اور حقیقی زندگی کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ سرمایہ داری کے لیے یہ خطرناک ہے کیونکہ اس کا زیادہ تر کاروبار اور کنٹرول ڈیجیٹل معیشت پر منحصر ہے۔ اس لیے

جو لوگ سوشل میڈیا سے دوری اختیار کرتے ہیں، مصنوعی خبروں اور مارکیٹنگ سے متاثر ہونے کے بجائے حقیقی دنیا میں دلچسپی لیتے ہیں، انہیں "سماجی کٹاؤ" یا "ڈیجیٹل فوبیا" کا مریض قرار دیا جارہا ہے۔ حالانکہ دینِ فطرت میں غیر ضروری مصروفیات سے بچنے اور حقیقی تعلقات اور فطرت کے قریب رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

"نیچرل ہیلنگ اوبسیشن" کے نام پر ایک اور اصطلاح متعارف کی جارہی ہے، جس میں وہ لوگ شامل کیے جارہے ہیں جو فطری اور غیر کیمیکل طریقوں سے اپنی جسمانی اور ذہنی صحت کا خیال رکھنا چاہتے ہیں۔ سرمایہ داری چونکہ دواسازی اور مہنگے علاجوں پر مبنی معیشت کو فروغ دیتی ہے، اس لیے جو لوگ جڑی بوٹیوں، قدرتی علاج، صحت مند خوراک، اور روحانی سکون کو شفا کا ذریعہ سمجھتے ہیں، انہیں "سائنس مخالف"، "نادان"، یا "خطرناک رجحان" کا حامل قرار دے کر ان پر کیمیکل ادویات اور صنعتی علاج مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ دینِ فطرت میں فطری غذاؤں، پاکیزگی، اور جسمانی صحت کے اصولوں کو اولین حیثیت دی گئی ہے۔

"ایگزسٹینشل ریفیوزل ڈس آرڈر" کے نام سے ایک اور نظریہ دیا جارہا ہے، جس میں وہ لوگ آتے ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے بناوٹی اصولوں کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور ایک مختلف طرزِ زندگی اپنانا چاہتے ہیں۔ جو لوگ اس عالمی اقتصادی نظام کی غیر منصفانہ حقیقت کو سمجھ کر اس سے علیحدہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں "سماجی بے دخلی"، "ذہنی

الجھن"، اور "غیر حقیقی خیالات" میں مبتلا سمجھا جاتا ہے، حالانکہ دینِ فطرت میں انسان کی حقیقی آزادی اور اختیار کو اس کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔

جدید نفسیات اور سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے جہاں ہر شخص ایک مخصوص سانچے میں ڈھلا ہو، مخصوص طرزِ زندگی اختیار کرے، اور مخصوص طریقوں سے سوچے۔ جو بھی اس دائرے سے باہر نکلتا ہے، اسے ایک نفسیاتی مریض قرار دے کر یا تو دواؤں کے ذریعے قابو میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے یا اسے سماجی طور پر الگ تھلگ کر دیا جاتا ہے۔ دینِ فطرت میں انسان کی انفرادیت، آزادی، فطری طرزِ زندگی، اور سادہ طرزِ حیات کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے، جو اس استحصالی نظام کے خلاف ایک حقیقی چیلنج ہے۔

سرمایہ داری کا بنیادی مقصد انسان کو اس کی فطرت، آزادی، اور خود مختاری سے دور کرنا ہے، تاکہ وہ ہمیشہ ایک کنٹرولڈ نظام کا حصہ بنا رہے اور اپنے ارد گرد کے استحصالی ڈھانچے کو چیلنج نہ کرے۔ جدید نفسیات کے نام پر کئی ایسی بیماریاں تراشی جا رہی ہیں جو درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کے جبر کا نتیجہ ہیں، مگر انہیں فرد کا مسئلہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ دینِ فطرت میں انسان کی ہر کیفیت کا ایک متوازن اور فطری حل موجود ہے، جو نہ صرف اس کی ذہنی اور روحانی ترقی میں مدد دیتا ہے بلکہ اسے ایک آزاد، خود مختار اور باوقار زندگی گزارنے کا راستہ بھی دکھاتا ہے۔

جدید نفسیات کا ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ "دین دار افراد" کو بھی بعض اوقات "شدید عقیدت پسندی" یا "بے جا روحانیت" کا شکار قرار دے کر ان کے عقائد کو ذہنی الجھن سے

تعبیر کرتی ہے۔ ایسے افراد جو دنیاوی زندگی کی بے ثباتی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اپنی روحانی زندگی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، انہیں بعض اوقات جدید نفسیات ایسے زاویے سے دیکھتی ہے جیسے وہ کسی "وہم" یا "نفسیاتی الجھن" میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ دینِ فطرت میں ایسے جذبات کو ایک اعلیٰ درجہ دیا گیا ہے، اور انسان کو دنیا کے فریب سے نکل کر ایک بلند تر حقیقت کی طرف متوجہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نہیں چاہتا کہ لوگ دینِ فطرت کی گہرائی میں جائیں، کیونکہ پھر وہ صارفیت، بے مقصد مصروفیات، اور مادی زندگی کے جال سے نکلنے لگیں گے، اس لیے وہ اس رجحان کو ایک نفسیاتی مسئلہ قرار دے دیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ استعمار نے بیماریوں کی ایک نئی فہرست مرتب کر کے انسان کو اس کی فطری اور سماجی حقیقت سے کاٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان تمام کیفیات اور رویوں کو "ڈس آرڈر" اور "مسئلہ" کہہ کر فرد کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ خود ہی کسی کمزوری کا شکار ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ تمام مسائل اس استحصالی اور غیر فطری نظام کے پیدا کردہ ہیں جو انسان کو اس کی فطری حقیقت سے دور لے جا رہا ہے۔ دینِ فطرت میں ہر کیفیت کا ایک متوازن حل موجود ہے، جو انسان کو حقیقت کے قریب لے جاتا ہے، جبکہ سرمایہ داری اسے مصنوعی علاج، دوائیوں، اور وقتی تسلیوں میں الجھا کر اپنے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔

سرمایہ داری نے ان تمام رویوں، کیفیات، اور ذہنی حالتوں کو بیماری قرار دے کر انہیں فرد کی کمزوری بنا دیا ہے، تاکہ نظام کو کسی قسم کا چیلنج درپیش نہ ہو اور لوگ خود کو ہی قصوروار

سمجھ کر علاج اور دوائیوں میں الجھے رہیں۔ جبکہ دینِ فطرت میں انسان کی ذہنی، روحانی اور جسمانی زندگی میں ایک متوازن ہم آہنگی موجود ہوتی ہے، جو اسے حقیقی خوشی، قناعت، اور معرفت کی طرف لے کر جاتی ہے۔ اگر ان نفسیاتی مسائل کا حقیقی حل تلاش کرنا ہے تو محض جدید نفسیات کی تشریحات پر بھروسہ کرنے کے بجائے دینِ فطرت کی روشنی میں ایک متوازن اور بامقصد زندگی کو اپنانا ضروری ہے، تاکہ انسان اس عالمی استعمار کی ذہنی غلامی سے نکل کر حقیقی معنوں میں آزاد ہو سکے۔

مجموعی طور پر سرمایہ داری نے ان تمام رویوں کو بیماری قرار دیا ہے جو فرد کو نظام کے تابع کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں، جبکہ دینِ فطرت انسان کی داخلی قوت، خوداعتمادی، اور روحانی استحکام کو اصل معیار قرار دیتا ہے۔ اگر نفسیاتی مسائل کا حل تلاش کرنا ہو تو صرف جدید سرمایہ دارانہ نظریات پر انحصار کرنے کے بجائے دینِ فطرت کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی طرف لوٹنا ضروری ہے تاکہ حقیقی ذہنی اور روحانی توازن حاصل کیا جا سکے۔

اوپوزیشنل ڈیفینٹ ڈس آرڈر (ODD) کو جدید نفسیات میں ایک نفسیاتی بیماری قرار دیا جاتا ہے، جس میں فرد کو نافرمانی، حکم عدولی اور اتھارٹی کو چیلنج کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ تاہم، دینِ فطرت کے مطابق ہر انسان کو آزادی فکر دی گئی ہے، اور اس کا اظہار قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے " :فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ "(الزمر: 17-18) یعنی میرے ان بندوں کو خوشخبری دے جو ہر بات کو غور سے سنتے ہیں اور جو

سب سے بہتر بات ہو، اس کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تحقیق اور سوال کرنا ایک فطری امر ہے، نہ کہ کوئی بیماری۔ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اس کی عملی مثال ہے، جب انہوں نے اپنے والد اور قوم کے خلاف تحقیق کی اور ان کے باطل عقائد کو چیلنج کیا۔ امام حسینؑ نے یزید کی اطاعت سے انکار کر کے یہ سکھایا کہ ظالم حکم کو ماننا کوئی صحت مند رویہ نہیں، بلکہ اصل بیماری جبر کے سامنے خاموش رہنا ہے۔

اٹینشن ڈیفیسٹ ہائپر ایکٹیویٹی ڈس آرڈر (ADHD) کو آج کے دور میں بچوں کی بے چینی، چُستی اور شرارت سے جوڑا جاتا ہے، حالانکہ دینِ فطرت کے مطابق بچوں کا متحرک ہونا، سوالات کرنا اور سیکھنے کے لیے فطری تجسس رکھنا ایک مثبت چیز ہے۔ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" :أَلْوَلَدُ سَيِّدٌ سَبْعَ سِنِينَ "(مستدرک الوسائل، ج15، ص 168) یعنی بچہ سات سال تک آزاد پرورش پائے۔ حضرت علیؑ کا بچپن اس بات کی واضح مثال ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسلسل سوالات کیے اور ان کے جوابات سے علم حاصل کیا۔ ماضی کے اسلامی معاشروں میں بچوں کو کھلی تحقیق اور تفکر کا موقع دیا جاتا تھا، مگر آج صنعتی تعلیمی نظام انہیں ایک مشینی طرز پر ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے، جس کی وجہ سے ان کی فطری چُستی کو دبا دیا جاتا ہے۔

جدید نفسیات میں ڈپریشن اور اینزائٹی کو محض ایک کیمیکل عدمِ توازن کی بیماری سمجھا جاتا ہے، اور اس کا علاج صرف دوائیوں میں تلاش کیا جاتا ہے، جبکہ قرآن مجید ہمیں سکھاتا ہے کہ روحانی سکون کا اصل ذریعہ اللہ کا ذکر ہے" :أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ "(الرعد:

28) یعنی بے شک، اللہ کے ذکر سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔ امام زین العابدینؑ کی دعائیں، خصوصاً صحیفہ سجادیہ کی دعائیں، اضطراب اور غم سے نجات کا روحانی ذریعہ ہیں۔ حضرت یونسؑ کا واقعہ، جب انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں "لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ سُوْرَةُ(الأنبیاء:87) کہا اور اللہ نے ان کی پریشانی کو دور کیا، یہ ثابت کرتا ہے کہ مشکلات میں اللہ سے رجوع کرنے سے ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔

اینٹی سوشیل پرسنالٹی ڈس آرڈر (ASPD) کو جدید ماہرینِ نفسیات ایک بیماری قرار دیتے ہیں، جب کہ حقیقت میں بعض لوگ سرمایہ دارانہ اور استحصالی نظام سے فرار اختیار کرتے ہیں اور ایک مختلف طرزِ زندگی کو اپناتے ہیں۔ امام علیؑ نے فرمایا" :لَا تَكُنْ عَبْدَ غَيْرِكَ وَقَدْ جَعَلَكَ اللهُ حُرًّا"(نہج البلاغہ، مکتوب 31) یعنی کسی کا غلام مت بنو، جبکہ اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔ یہ اصول ہمیں قرآن میں اصحابِ کہف کے قصے میں بھی نظر آتا ہے، جنہوں نے معاشرتی بگاڑ اور ظلم سے بچنے کے لیے ایک غار میں پناہ لی۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اپنی قوم کے شرک کو مسترد کرکے تنہائی اختیار کی۔

پوسٹ ٹرامیٹک اسٹریس ڈس آرڈر (PTSD) کو عام طور پر ایک نفسیاتی بیماری کے طور پر دیکھا جاتا ہے، حالانکہ یہ ظلم کا ایک فطری ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں واضح کیا گیا ہے " :وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّن سَبِيلٍ "(الشوریٰ:41) یعنی جو مظلوم ظلم کے بعد انتقام لیتے ہیں، ان پر کوئی الزام نہیں۔ حضرت زینبؑ کی مثال ہمارے

سامنے ہے، جنہوں نے کربلا کے صدمے کے بعد یزید کے دربار میں شجاعانہ خطبہ دیا، جو صدمے کو مزاحمت میں بدلنے کی بہترین مثال ہے۔

سوشل اینزائٹی ڈس آرڈر (SAD) کو جدید سائنس ایک بیماری کے طور پر بیان کرتی ہے، حالانکہ دینِ فطرت کے مطابق مومن کا دنیاداروں سے اجنبیت محسوس کرنا ایک فطری رویہ ہے۔ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" :المؤمن یستوحش من أھل الدنیا "(الکافی، ج 2، ص 135) یعنی مومن دنیاداروں کے ساتھ اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ امام علیؑ نے بھی فرمایا" :لا تأنس إلی أھل الدنیا "یعنی دنیا پرستوں سے انس مت رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ تقویٰ پرہیزگاری اور دنیاوی رسم ورواج سے الگ رہنے کو دین میں پسند کیا گیا ہے، تاکہ انسان اپنی روحانی ترقی پر توجہ دے سکے۔

انسومنیا (نیند کی کمی) کو جدید نفسیات میں ایک بیماری کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، اور اس کا علاج زیادہ تر نیند آور گولیوں میں تلاش کیا جاتا ہے۔ جبکہ دینِ فطرت ہمیں سکھاتا ہے کہ ایک متوازن نیند کا نظام اپنانا ضروری ہے۔ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "قُومُوا اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا "(المزمل: 2-3) یعنی رات کو جاگو مگر تھوڑا آرام بھی کرو۔ جدید ٹیکنالوجی، جیسے موبائل فون اور دیگر اسکرینز، ہماری نیند کو متاثر کرتی ہیں، جبکہ اسلامی تعلیمات میں رات کو جلد سونے اور فجر سے پہلے جاگنے کو صحت مند طرزِ زندگی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ تمام مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ جدید نفسیات بعض فطری رویوں کو بیماری قرار دے کر افراد کو سرمایہ دارانہ سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے، جبکہ دینِ فطرت ان کی اصلاح ایک متوازن روحانی و فکری طریقے سے کرتا ہے۔

جیسا عمل، ویسا ردعمل

زندگی میں پیش آنے والے واقعات اکثر ہمارے قابو میں نہیں ہوتے، لیکن ان پر ہمارا ردعمل مکمل طور پر ہمارے اختیار میں ہوتا ہے۔ جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آتا ہے، وہ زندگی کی ایک ناگزیر حقیقت ہے، لیکن ہم ان حالات سے کس طرح نمٹتے ہیں، یہی ہماری شخصیت، کامیابی اور سکون کا تعین کرتا ہے۔ اگر انسان یہ سمجھ لے کہ آزمائشیں اور مشکلات اس کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے مواقع ہیں، تو وہ کبھی بھی ناامید یا مایوس نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ ہر چیلنج کو ایک موقع سمجھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا۔

یہ حقیقت ہے کہ زندگی میں مسائل، رکاوٹیں اور مشکلات آتی ہیں، لیکن کچھ لوگ ان مشکلات کو شکست سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ انہیں سیڑھی بنا کر مزید بلندی کی طرف بڑھتے ہیں۔ اگر ہم ماضی کے عظیم لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ہر کامیاب شخصیت کو سخت چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ انہوں نے ان مشکلات کو ہمت، صبر اور حکمت سے قبول کیا اور ان سے سیکھ کر خود کو بہتر بنایا۔

انسان اگر کسی تکلیف دہ واقعے کو اپنے ذہن اور دل پر حاوی کر لے، تو وہ کبھی بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ لیکن اگر وہ اپنے رویے کو مثبت رکھے، اللہ پر بھروسا کرے اور حالات سے سیکھنے

کا حوصلہ پیدا کرے، تو یہی مشکلات اس کے لیے ایک نئی طاقت بن جاتی ہیں۔ بعض اوقات انسان کسی ناکامی یا تکلیف کو اپنی بربادی سمجھ لیتا ہے، حالانکہ وہی تکلیف اسے کسی بڑی بہتری کی طرف لے جانے کا سبب بن سکتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بھی اسی اصول پر زور دیا گیا ہے کہ آزمائشیں زندگی کا حصہ ہیں اور اصل کامیابی ان پر صبر اور شکر کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ مشکلات میں صبر کرنا ہی مومن کی اصل پہچان ہے، کیونکہ یہی رویہ انسان کو اندر سے مضبوط بناتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کو عظیم خوشخبری دی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کی مدد ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی ہے جو صبر اور استقامت سے حالات کا سامنا کرتے ہیں۔

لہٰذا، ہماری زندگی کا اصل معیار یہ نہیں کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے، بلکہ یہ ہے کہ ہم اس پر کیسے ردعمل دے رہے ہیں۔ جو شخص ہر حال میں اللہ پر بھروسا رکھتا ہے، اپنی ہمت نہیں ہارتا، اور اپنی پریشانیوں سے سبق سیکھ کر آگے بڑھتا ہے، وہی حقیقی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ زندگی کا حسن بھی اسی میں ہے کہ ہم اپنے اختیار میں موجود سب سے قیمتی چیز، یعنی اپنا رویہ، مثبت رکھیں اور ہر حال میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہیں۔

زندگی کا اصل دارومدار اس بات پر نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوتا ہے بلکہ اس پر ہے کہ ہم ان حالات پر کس طرح کا ردعمل دیتے ہیں۔ مشکلات، پریشانیاں اور ناپسندیدہ حالات ہر انسان کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں، لیکن ان سے گھبرا جانا یا شکست تسلیم کر لینا کسی مسئلے کا

حل نہیں بلکہ مزید مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی ہمیشہ آسانی اور سکون کے ساتھ گزرے گی، وہ پہلی آزمائش کے ساتھ ہی مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن جو لوگ زندگی کو ایک امتحان سمجھ کر اس کا سامنا کرتے ہیں، وہ ہر تکلیف میں بھی کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مشکلات اور چیلنجز انسان کی شخصیت کو نکھارتے ہیں اور اسے بہتر بنانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اگر انسان کا رویہ درست ہو تو وہ ہر مشکل سے ایک نئی طاقت حاصل کر سکتا ہے۔ بہت سے لوگ ذرا سی پریشانی میں ہمت ہار دیتے ہیں، جبکہ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہر مشکل کو ایک نئے سبق کے طور پر لیتے ہیں اور آگے بڑھنے کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جو کامیاب اور ناکام افراد میں پایا جاتا ہے۔ اگر ماضی کے کامیاب لوگوں کی زندگیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کو کسی نہ کسی موڑ پر سخت آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انہوں نے حالات کا شکار ہونے کے بجائے ان کا مقابلہ کیا اور اپنی قسمت کو خود تراشا۔

اسلامی تعلیمات بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ قرآن میں واضح طور پر ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، اور مشکلات کے بعد آسانی کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جب حالات سخت ہو جائیں تو سمجھ لو کہ آسانی قریب ہے، کیونکہ اللہ کی رحمت مایوسی کے اندھیروں میں نہیں بلکہ صبر اور استقامت کے چراغ روشن کرنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ جو لوگ ہر مشکل کو اپنی

ہمت، ایمان اور عقل کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہی زندگی میں حقیقی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں مشکلات سے بھاگنا ممکن نہیں۔ اگر ہم اپنے ماضی پر نظر ڈالیں تو ہمیں کئی ایسے لمحات یاد آئیں گے جب ہمیں لگا تھا کہ ہم مزید نہیں چل سکتے، لیکن آج ہم وہی وقت گزار چکے ہیں اور اس سے کچھ نہ کچھ سیکھ چکے ہیں۔ زندگی کی خوبصورتی یہی ہے کہ وہ ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی، لیکن ہمارا رویہ، ہمارے خیالات اور ہمارا ردعمل طے کرتا ہے کہ ہم ان بدلتے حالات کو کس طرح قبول کرتے ہیں۔ اگر ہم ہر مشکل کو ایک موقع سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھائیں تو کوئی بھی مشکل ہمیں توڑ نہیں سکتی بلکہ ہمیں مزید مضبوط بنا سکتی ہے۔

حسد کے بجائے حقیقت سمجھیں

انسانی زندگی مشکلات اور آزمائشوں کا مجموعہ ہے۔ ہر فرد کسی نہ کسی پریشانی، چیلنج یا غم سے دوچار ہوتا ہے، چاہے وہ ظاہری طور پر کتنا ہی خوش نظر آئے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے جب ہم اپنی زندگی کو دوسروں کی زندگی سے موازنہ کرنے لگتے ہیں، تو ہمارے دل میں بے چینی، حسد اور ناشکری کے جذبات جنم لینے لگتے ہیں۔ ہم دوسروں کی خوشیوں اور کامیابیوں کو دیکھ کر خود کو محروم اور کم تر محسوس کرتے ہیں، حالانکہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے دل میں کیا دکھ اور آزمائشیں چھپی ہوئی ہیں۔

قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم تمہیں خوف، بھوک اور جان و مال کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ آزمائشیں ہر انسان کی زندگی کا حصہ ہیں اور یہ زندگی کا وہ پہلو ہے جس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے، جہاں ہر شخص کسی نہ کسی پہلو سے آزمائش میں ہے، کوئی مالی تنگی میں مبتلا ہے، کوئی صحت کے مسائل سے دوچار ہے، کوئی رشتوں کی الجھنوں میں الجھا ہوا ہے اور کوئی روحانی سکون کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ جو لوگ ہمیں خوشحال اور مطمئن نظر آتے ہیں، وہ بھی اپنی زندگی میں کسی نہ کسی مسئلے کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں، مگر وہ اپنی تکالیف کو ظاہر نہیں

کرتے، اور یہی ہمیں دھوکہ دیتا ہے کہ شاید ان کی زندگی مکمل طور پر خوشیوں سے بھرپور ہے۔

اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ ہر انسان کسی نہ کسی آزمائش سے گزر رہا ہے، تو ہم دوسروں کی زندگیوں کو دیکھ کر حسد کرنے کے بجائے اپنی زندگی کے حالات کو بہتر طور پر قبول کرنا سیکھیں گے۔ حسد اور موازنہ کرنے کی بجائے ہمیں اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں پر توجہ دینی چاہیے، کیونکہ ہر شخص کا امتحان مختلف ہے اور ہر کسی کے لیے آزمائشوں کا انداز الگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو اس کے حالات اور ہمت کے مطابق آزمائش میں ڈالا ہے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

یہ دنیا کسی کے لیے بھی دائمی خوشی اور آرام کا مقام نہیں، بلکہ حقیقی خوشی اور سکون صرف آخرت میں نصیب ہو گا۔ اگر ہم اپنی زندگی کی مشکلات کو صبر، شکر اور اللہ پر بھروسے کے ساتھ قبول کریں، تو ہم دنیا میں ذہنی سکون حاصل کر سکتے ہیں اور آخرت میں حقیقی کامیابی پا سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی کو دوسروں کی زندگی سے موازنہ کرنے کے بجائے اپنی مشکلات کو صبر و استقامت سے گزارنا چاہیے اور اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی کی زندگی بظاہر کتنی ہی خوشحال کیوں نہ لگے، اس کے اندر بھی آزمائشیں اور پریشانیاں موجود ہوتی ہیں۔ انسان اکثر دوسروں کی ظاہری خوشیوں کو دیکھ کر اپنی زندگی سے ناخوش ہونے لگتا

ہے، حالانکہ وہ نہیں جانتا کہ وہی شخص جس کی زندگی اسے بے عیب اور مکمل نظر آ رہی ہے، وہ اندرونی طور پر کس قدر بے چین ہو سکتا ہے۔

یہ دنیا فانی ہے اور اس میں مکمل سکون اور دائمی خوشی کا تصور محض ایک سراب ہے۔ ہر انسان کے دل میں کوئی نہ کوئی خواہش، کوئی نہ کوئی تشنگی ایسی ضرور ہوتی ہے جو اسے بے قرار رکھتی ہے۔ جو دولت مند ہے، وہ عزت و محبت کی تلاش میں ہے۔ جو عزت دار ہے، وہ سکون کی جستجو میں ہے۔ جو صحت مند ہے، وہ بہتر مستقبل کے لیے فکر مند ہے۔ جو کامیاب نظر آتا ہے، وہ اپنی اندرونی جنگوں میں مصروف ہے۔ انسان دنیا میں جتنا بھی حاصل کر لے، کوئی نہ کوئی تشنگی باقی رہتی ہے، کیونکہ دنیا کی حقیقت ہی یہی ہے کہ یہ دل کو مکمل آسودگی نہیں دے سکتی۔

اگر ہم اپنی زندگی کو دوسروں سے موازنہ کرنے کی بجائے اپنی حقیقت پر غور کریں تو ہمیں اندازہ ہو گا کہ ہر انسان کو وہی ملا ہے جو اس کے لیے بہتر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ایک خاص انداز میں نوازا ہے اور ہر کسی کی آزمائش اس کے حالات کے مطابق رکھی ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے وہ ناشکری، حسد اور احساسِ محرومی سے بچ جاتا ہے۔ جو چیز ہمارے پاس نہیں، ہو سکتا ہے وہ ہمارے حق میں بہتر نہ ہو، اور جو کچھ ہمارے پاس ہے، وہی ہمارے لیے اصل نعمت ہو۔

زندگی میں مشکلات کا آنا ضروری ہے کیونکہ یہ ہمیں نکھارتی ہیں، ہمارے صبر اور حوصلے کو آزماتی ہیں اور ہمیں بہتر انسان بناتی ہیں۔ اگر خوشیاں دائمی ہو جاتیں تو نہ ہم اپنی غلطیوں سے

سیکھ پاتے، نہ ہمیں صبر کا درس ملتا اور نہ ہی ہم زندگی کے حقیقی معانی کو سمجھ پاتے۔ ہر غم، ہر پریشانی اور ہر آزمائش کے بعد ایک نیا باب کھلتا ہے اور انسان مزید مضبوط ہو جاتا ہے۔

حقیقی کامیابی اس میں نہیں کہ ہم دوسروں جیسی زندگی حاصل کرنے کی کوشش کریں بلکہ اصل کامیابی یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں جو کچھ بھی ہے، اس میں سکون اور شکر گزاری پیدا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے، اس کے رزق اور برکت میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا خوشی کا راز دوسروں سے موازنہ کرنے میں نہیں بلکہ اپنے حالات میں اطمینان اور اللہ کی رضا میں پوشیدہ ہے۔

حق و باطل کا معرکہ: ہم کہاں کھڑے ہیں؟

حق و باطل کی جنگ ازل سے جاری ہے اور تا ابد جاری رہے گی۔ یہ صرف ایک تاریخی یا سیاسی تصادم نہیں، بلکہ ایک نظریاتی اور روحانی جنگ ہے جو ہر دور میں مختلف اشکال میں سامنے آتی رہی ہے۔ حق وہ ہے جو خدا کی رضا کے مطابق ہو، اور باطل وہ ہے جو انسانوں کو خدا کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے۔ قرآن مجید اس معرکہ کو واضح کرتا ہے :

"*وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا"*(الإسراء: 81)

"اور کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹنے ہی والا تھا۔ "

یہ آیت اس ابدی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ حق ہمیشہ غالب آنے کے لیے ہے، لیکن بعض اوقات باطل کے تسلط کا مرحلہ آتا ہے جو دراصل اہل حق کی کوتاہیوں اور ان کی کمزوریوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر امت مسلمہ نے خدا اور محمد و آل محمد (علیہم السلام) کے پیغام پر مکمل عمل کیا ہوتا، تو باطل قوتیں ہرگز غالب نہ آتیں۔

آج کی دنیا میں بھی دو نظریاتی محاذ سامنے ہیں: ایک طرف صہیونیت ہے، جو ابلیس اور اس کے پیروکاروں کی نمائندہ ہے، اور دوسری طرف شیعت، جو خدا اور محمد و آل محمد کے

پیروکاروں کی جماعت ہے۔ صہیونی قوتیں شیطان کی اس حکمت عملی کو عملی جامہ پہناتی ہیں جو قرآن میں یوں بیان ہوئی :

"*إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ"* (فاطر:6)

"بے شک شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، پس تم اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو بس اپنے گروہ کو بلاتا ہے تاکہ وہ دوزخی بن جائیں۔ "

یہ وہی صہیونی ایجنڈا ہے جو دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے، اور اسی وجہ سے آج دنیا میں سب سے زیادہ طاقت، معیشت، میڈیا اور حکومتوں پر اسی کا قبضہ ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حق پر ہیں، بلکہ ان کی کامیابی محض آزمائش اور اہل حق کی غفلت کا نتیجہ ہے۔

عالمی سیاست میں اگر کوئی شخص، چاہے وہ کسی بھی مذہب یا نظریے سے تعلق رکھتا ہو، اگر وہ خدا، محمد و آل محمد کے پیروکاروں کی حمایت کرتا ہے تو وہ حق پرست ہے، چاہے وہ کمیونسٹ ہو، عیسائی ہو، ہندو ہو یا یہودی۔ اس کے برعکس، اگر کوئی مسلمان یا بظاہر شیعہ ہونے کا دعوے دار بھی ہو مگر دنیا پرستی، عافیت طلبی اور شیطان پرستی میں مبتلا ہو تو وہ درحقیقت صہیونی ایجنڈے کا ہی ایک حصہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں حق اور باطل کی پہچان کے لیے ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ کون سی قوتیں عالمی استعمار، ظلم اور استکبار کے خلاف کھڑی ہیں اور کون سی ان کا ساتھ دے

رہی ہیں۔ ایران، وینیزویلا، شمالی کوریا، قطر، کیوبا اور دیگر کچھ ممالک اگرچہ بظاہر مختلف نظریات رکھتے ہیں، مگر وہ عالمی استکبار کے خلاف بر سرِ پیکار ہیں، اسی لیے وہ حق پرست شمار کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے برعکس، سعودی عرب اور دیگر اسلامی ریاستیں جو ظاہری طور پر اسلام کی علمبردار ہیں لیکن درحقیقت صہیونی طاقتوں کے ایجنڈے کو فروغ دے رہی ہیں، وہ باطل کے ساتھ کھڑی ہیں۔

امریکہ، اسرائیل، اور یورپ آج باطل کے بڑے مراکز ہیں، جو صہیونیت کے سرغنے ہیں اور شیطانی طاقتوں کے نمائندہ بن کر دنیا میں فتنہ وفساد پھیلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے :

"* الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ" *(الفجر: 11-13)

"وہ لوگ جو زمین میں سرکشی کرتے رہے اور وہاں بہت زیادہ فساد پھیلایا، تو تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسادیا۔ "

یہی وہ انجام ہے جو باطل قوتوں کا مقدر ہے، اور تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی اہل حق بیدار ہوئے، باطل کا زوال شروع ہو گیا۔

لہٰذا، جدید دور میں حق اور باطل کا معیار صرف زبانی دعووں پر نہیں بلکہ عملی وابستگی پر ہو گا۔ جو شخص اور جو جماعت اہل بیت (علیہم السلام) کے حقیقی پیروکاروں کے ساتھ کھڑی

ہے اور ظالم و جابر طاقتوں کے خلاف مزاحمت کر رہی ہے، وہی حق پرست ہے۔ اور جو صہیونیت کے ساتھ مفادات وابستہ کرکے، عیش و عشرت اور دنیاوی آرام کو فوقیت دے رہا ہے،وہ چاہے کسی بھی مذہب کا ہو، حقیقت میں باطل کا حصہ ہے۔

یہ جنگ صرف طاقت اور حکومت کی جنگ نہیں بلکہ نظریات اور روحانی اقدار کی جنگ ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ بالآخر فتح حق کی ہو گی :

" * وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ " *(النور:55)

" اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک اعمال کیے کہ وہ انہیں زمین میں خلافت عطا کرے گا جیسے اس نے ان سے پہلے والوں کو دی تھی۔ "

یہی وہ نوید ہے جو اہل حق کے لیے حوصلے اور جدوجہد کا ذریعہ ہے۔ آج اگرچہ باطل غالب نظر آتا ہے، لیکن اللہ کے وعدے کے مطابق، جب اہل حق اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں گے اور اپنی کوتاہیوں کو دور کریں گے، تو حق کا پرچم بلند ہو گا اور باطل کا زوال یقینی ہو گا۔

حقیقت کو مسخ کرنے کے شیطانی طریقے

بعض اوقات لوگوں کی توجہ کسی اہم حقیقت سے ہٹانے، انہیں گمراہ کرنے یا کسی مخصوص ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے مختلف نفسیاتی اور حربی تکنیکیں استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ تکنیکیں سیاست، میڈیا، کاروبار اور سماجی معاملات میں عام طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک باشعور انسان کے لیے ان حربوں کو پہچاننا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ حقیقت اور دھوکہ دہی میں فرق کر سکے۔

ایک عام تکنیک یہ ہے کہ کسی غیر متعلقہ یا گمراہ کن موضوع کو نمایاں کر کے اصل مسئلے سے توجہ ہٹا دی جائے۔ جیسے اگر کسی سیاستدان پر کرپشن کے الزامات لگیں تو وہ قومی سلامتی یا کسی اور حساس معاملے پر بحث چھیڑ دیتا ہے تاکہ لوگ اس پر توجہ نہ دیں۔ اسی طرح بعض اوقات دو بالکل مختلف چیزوں کو برابر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ حقیقت میں ان کے درمیان کوئی مماثلت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی کہے کہ ایک عام شہری کو ٹیکس چوری پر سزا ملتی ہے لیکن ایک امیر شخص بچ نکلتا ہے، تو یہ دلیل اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتی ہے کہ امیر افراد اکثر قانونی طریقے سے ٹیکس بچاتے ہیں، جو تکنیکی طور پر چوری نہیں ہوتا۔

کبھی کبھار کسی کی اصل بات کو توڑ مروڑ کر ایک کمزور شکل میں پیش کر کے اس کا رد کیا جاتا ہے، جیسے اگر کوئی ماحولیاتی تحفظ پر زور دے تو جواب میں کہا جائے کہ وہ چاہتا ہے کہ تمام گاڑیاں اور فیکٹریاں بند کر دی جائیں، حالانکہ اس نے ایسا کچھ نہیں کہا ہوتا۔ بعض اوقات احساسِ جرم پیدا کر کے بھی کسی خاص نظریے یا عمل کو قبول کروانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر کوئی حکومت کی پالیسی پر تنقید کرے تو اس پر حب الوطنی کے خلاف ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے، حالانکہ تنقید کرنا وطن سے محبت کے خلاف نہیں ہوتا۔

کچھ مواقع پر دلیل کے اندر ہی نتیجہ پہلے سے فرض کر لیا جاتا ہے، جیسے اگر کوئی کہے کہ ایک دوا سب سے بہترین ہے کیونکہ ڈاکٹر ایسا کہتے ہیں، حالانکہ اس بات کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہوتا۔ اسی طرح جب کسی پر تنقید کی جاتی ہے تو بجائے جواب دینے کے، دوسرے لوگوں کی غلطیوں کا ذکر کر کے موضوع بدل دیا جاتا ہے، جیسے اگر کسی حکومت پر مہنگائی بڑھانے کا الزام لگے تو وہ کہے کہ پچھلی حکومت میں بھی ایسا ہی تھا، حالانکہ اس سے موجودہ حکومت کا جواز نہیں بنتا۔

کسی کی دلیل کو رد کرنے کے بجائے اس کی ذات پر حملہ کرنا بھی ایک عام حربہ ہے۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی عالم دین کسی مسئلے پر اپنی رائے دے تو بجائے اس کے دلائل پر بات کرنے کے یہ کہا جائے کہ یہ تو مولوی ہیں، ان کی بات مت سنو۔ اسی طرح بعض اوقات کسی معاملے کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے صرف دو ہی راستے ہوں، حالانکہ حقیقت

میں کئی اور امکانات بھی ہو سکتے ہیں، جیسے اگر کہا جائے کہ یا تو تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے دشمن، حالانکہ اختلافِ رائے کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔

کاروباری دنیا میں لوگوں کو جھانسہ دینے کے لیے بھی خاص طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ جیسے کسی چیز پر بڑی رعایت کا اشتہار دیا جائے، لیکن جب گاہک خریدنے آئے تو بتایا جائے کہ وہ ماڈل ختم ہو گیا ہے اور انہیں مہنگی چیز خریدنے پر مجبور کیا جائے۔ بعض اوقات طاقتور ادارے خود ہی ایک مصنوعی اپوزیشن کھڑی کر دیتے ہیں تاکہ ایسا لگے کہ تنقید ہو رہی ہے، حالانکہ اصل مسئلہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک اور نفسیاتی حربہ یہ ہے کہ کسی حقیقت کو چھپانے کے لیے غیر متعلقہ یا جذباتی معاملات کو نمایاں کر دیا جائے۔ اگر کسی حکومت پر کرپشن کے الزامات ہوں تو وہ عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے قومی سلامتی یا مذہبی معاملات کو بڑھا چڑھا کر پیش کر سکتی ہے۔ میڈیا میں بھی ایسا ہوتا ہے، جیسے کسی بڑے مالیاتی اسکینڈل کے وقت کسی مشہور شخصیت کی شادی یا طلاق کو بڑی خبر بنا دیا جائے۔ کاروباری دنیا میں، اگر کسی کمپنی پر ماحولیاتی نقصان کا الزام لگے تو وہ فوراً کسی فلاحی مہم کا اعلان کر دیتی ہے تاکہ عوام کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹ جائے۔

یہ تمام حربے بظاہر عام سے محسوس ہوتے ہیں لیکن درحقیقت بہت چالاکی سے رائے عامہ کو قابو میں رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک باشعور اور سمجھدار شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان چالاکیوں کو پہچانے اور حقیقت کو دھوکہ دہی سے الگ کر سکے۔

شیعہ تاریخ میں دشمنانِ تشیع نے ہمیشہ مختلف نفسیاتی اور حربی تکنیکوں کا استعمال کیا تاکہ اہلِ بیتؑ کے حقیقی پیغام کو دبایا جاسکے، مسلمانوں کو گمراہ کیا جاسکے اور اپنے سیاسی وذاتی مفادات کی تکمیل کی جاسکے۔ ان حربوں میں سب سے عام طریقہ یہ تھا کہ غیر متعلقہ یا گمراہ کن موضوعات کو نمایاں کر کے اصل حقیقت سے لوگوں کی توجہ ہٹادی جائے۔ اس کی ایک نمایاں مثال واقعہ کربلا کے بعد یزید اور اس کے حواریوں کی کوششیں تھیں کہ وہ اس سانحے کو محض ایک سیاسی بغاوت کے طور پر پیش کریں۔ جب امام حسینؑ کی شہادت نے لوگوں میں بے چینی پیدا کی، تو یزید نے مختلف حربے اپنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ ایک سازش تھی جس میں امام حسینؑ خود ملوث تھے اور یزید کو مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا۔

اسی طرح، دشمنانِ تشیع نے ہمیشہ جھوٹے تقابل اور غلط موازنوں کا سہارا لیا تاکہ حق اور باطل کو ایک جیسا ثابت کیا جاسکے۔ جب خلافت کے مسئلے پر بحث ہوئی، تو اہلِ بیتؑ کے حق کو نظر انداز کرنے کے لیے کہا گیا کہ اگر حضرت ابو بکر کو منتخب کر لیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہی درست طریقہ تھا، جبکہ اہلِ بیتؑ کی نامزدگی کو خاندانی حکمرانی کی خواہش قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں برابر نہیں تھیں، کیونکہ رسول اللہؐ نے خود امیر المؤمنینؑ کو خدا کے حکم کے مطابق امت کا رہبر مقرر فرمایا تھا۔

ایک اور حربہ یہ تھا کہ کسی کی اصل دلیل کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے اور پھر اس کمزور شکل کو رد کر دیا جائے۔ امیر المؤمنین علیؑ کے خلاف سب سے زیادہ استعمال ہونے والا حربہ یہی تھا کہ ان کے عدل اور حکمت کو منفی رنگ دے کر پیش کیا گیا۔ جب آپؑ نے خلافت

سنبھالی اور حکومتی انصاف کو بحال کرنا چاہا، تو ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ سیاسی بصیرت نہیں رکھتے اور امورِ حکومت کو درست طریقے سے نہیں چلا سکتے، حالانکہ آپؑ نے عدلِ الٰہی کو برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی۔ یہی تکنیک امام جعفر صادقؑ کے دور میں بھی استعمال کی گئی، جب عباسی خلافت نے امامؑ کے علمی مرکز کو کمزور کرنے کے لیے کہا کہ دین کے نام پر صرف فقہ اور ظاہر پرستی کافی ہے، جبکہ امامؑ کے فلسفیانہ اور سائنسی علوم کو بدعت قرار دیا گیا۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کسی پر تنقید کرنے کی بجائے اسے جذباتی بلیک میلنگ میں مبتلا کر دیا گیا۔ جب امام زین العابدینؑ نے دربارِ یزید میں خطبہ دیا اور حقائق کو آشکار کیا، تو یزیدی درباریوں نے فوراً اہلِ بیتؑ پر الزام لگایا کہ وہ امت میں تفرقہ ڈال رہے ہیں۔ یہی حربہ تاریخ میں بارہا دہرایا گیا، جیسے امام موسیٰ کاظمؑ کو قید میں ڈال کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ حکومت کے خلاف بغاوت کر رہے تھے، جبکہ حقیقت میں وہ دینِ اسلام کی اصل اقدار کی حفاظت کر رہے تھے۔

کچھ مواقع پر دلیل کے اندر ہی نتیجہ فرض کر لیا گیا اور بغیر کسی ثبوت کے بات کو سچ تسلیم کروا دیا گیا۔ جب خلافتِ بنی امیہ کو مضبوط کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے خطبوں میں یہ مشہور کر دیا گیا کہ جو بھی حکومت کے خلاف ہو، وہ دین سے خارج ہے، تو اس کا مطلب یہی تھا کہ بنی امیہ کی حکومت کو ہی دین کا معیار بنا دیا گیا۔ اسی لیے امام حسینؑ نے اپنی

شہادت سے پہلے واضح کیا تھا کہ دین کو ایک ظالم حکومت کے تابع کرنے کی یہ سازش درحقیقت اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دے گی۔

اپنی کوتاہیوں پر جواب دہ ہونے کے بجائے دوسروں کو بھی اس عمل میں شامل کرکے خود کو معمول کے مطابق ظاہر کیا گیا۔۔ جب اہلِ بیتؑ پر ظلم ڈھائے گئے اور ان کے حقوق سلب کیے گئے، تو بجائے اس ظلم کو تسلیم کرنے کے، کہا گیا کہ دیگر صحابہ پر بھی مظالم ہوئے تھے، اس لیے یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں۔ اس دلیل کا مقصد یہ تھا کہ اہلِ بیتؑ کے ساتھ ہونے والے جبر کو معمول کی ایک بات بنا دیا جائے تاکہ لوگ اس پر غور نہ کریں۔

کسی کی دلیل کو رد کرنے کے بجائے اس کی ذات پر حملہ کرنا بھی عام حربہ رہا۔ امام علیؑ کی شخصیت پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے، حتیٰ کہ ان کے خلاف مساجد میں لعنت بھیجنے کو عام کر دیا گیا تاکہ لوگ ان کی فضیلتوں سے بے خبر رہیں۔ اسی طرح امام محمد تقیؑ اور امام علی نقیؑ کے علم و حکمت کو کمزور کرنے کے لیے ان پر حکومت نواز ہونے کے الزامات لگائے گئے، حالانکہ وہ ہمیشہ ظالم حکمرانوں کے خلاف برسرپیکار رہے۔

ایک اور چالاکی یہ تھی کہ مسئلے کو یوں پیش کیا جائے جیسے صرف دو ہی راستے ہوں، جبکہ حقیقت میں کئی حل موجود ہوں۔ جیسے امام حسنؑ کے صلح کے فیصلے کو یوں پیش کیا گیا کہ یا تو وہ لڑتے اور ختم ہو جاتے یا پھر معاویہ کی اطاعت کرلیتے، حالانکہ امامؑ نے اپنی امت کے تحفظ کے لیے صلح کو بہترین حکمتِ عملی کے طور پر اپنایا تھا۔

کئی مواقع پر لوگوں کو دھوکہ دے کر جھانسے میں بھی رکھا گیا۔ جیسے عباسی خلفاء نے اہلِ بیتؑ کے چاہنے والوں کو حمایت کا یقین دلایا، لیکن جب اقتدار ملا تو انہوں نے اہلِ بیتؑ اور ان کے ماننے والوں پر پہلے سے بھی زیادہ سختیاں مسلط کر دیں۔ مامون الرشید نے امام رضاؑ کو ولی عہد بنانے کا ڈرامہ رچایا تاکہ لوگوں کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ وہ اہلِ بیتؑ کا حامی ہے، مگر اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ امامؑ کی شہرت اور اثر و رسوخ سے خوفزدہ تھا اور انہیں قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔

طاقتور حکمرانوں نے ہمیشہ ایک مصنوعی اپوزیشن کھڑی کی تاکہ یہ ظاہر ہو کہ ان پر تنقید ہو رہی ہے، جبکہ اصل مسائل پر پردہ ڈال دیا گیا۔ جیسے بنی عباس کے دور میں کئی ایسے نام نہاد علما پیدا کیے گئے جو بظاہر اہلِ بیتؑ سے محبت کا اظہار کرتے تھے، مگر اصل میں حکمرانوں کے ایجنڈے کو ہی تقویت دیتے تھے تاکہ عوام کو کنفیوز رکھا جا سکے۔

ایک اور حربہ کسی حقیقت کو چھپانے کے لیے غیر متعلقہ یا جذباتی معاملات کو نمایاں کرنا تھا۔ جب اہلِ بیتؑ کے ماننے والوں نے واقعۂ کربلا کے بعد یزیدی مظالم کے خلاف آواز بلند کی، تو حکومت نے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے دوسرے فقہی مسائل کو نمایاں کرنا شروع کر دیا۔ آج بھی یہی حربہ استعمال ہوتا ہے، جہاں اہلِ بیتؑ کی تعلیمات پر بات کرنے کے بجائے دوسرے غیر متعلقہ امور کو اجاگر کر کے اصل پیغام کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ تمام حربے تاریخ میں بارہا دہرائے گئے اور آج بھی استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ایک باشعور اور سمجھدار انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان چالاکیوں کو پہچانے، تاریخ سے سبق لے

اور حقیقت اور دھوکہ دہی کے درمیان فرق کرنا سیکھے تاکہ وہ اپنے عقیدے اور تاریخ کے
حوالے سے کسی سازش کا شکار نہ ہو۔

حقیقی کامیابی اور سکون

زندگی کی حقیقتوں کو اکثر انسان دیر سے سمجھتا ہے، اور جب تک وہ انہیں مکمل طور پر جان پاتا ہے، وقت کا بڑا حصہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ وقت کی تیزی کا ادراک جوانی میں نہیں ہوتا، مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ وقت پر لگا کر اُڑ رہا ہے۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے وقت کی قدر کی طرف متوجہ کیا ہے " :وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ۔ "(سورہ العصر: 1-2) یعنی "زمانے کی قسم! بے شک انسان خسارے میں ہے۔" اگر وقت کی حقیقت کا شعور ابتدائی عمر میں ہو جائے تو زندگی کا ہر لمحہ قیمتی محسوس ہوگا اور فضول کاموں میں ضائع ہونے سے بچے گا۔

صحت کی نعمت کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب یہ انسان کے ہاتھ سے نکلنے لگتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے " : الصحة والفراغ نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس "یعنی" دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگ دھوکے میں رہتے ہیں: صحت اور فراغت۔" اگر جوانی میں اپنے جسم کی حفاظت نہ کی جائے، تو بڑھاپے میں یہ نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ زیادہ کھانے، بے احتیاطی اور سستی سے بچنے والا انسان بڑھاپے میں بھی توانائی محسوس کرتا ہے، مگر جو اپنی صحت کو بگاڑتا ہے، وہ ایک ایک دن کو مشکل اور تکلیف دہ پاتا ہے۔

انسانی تعلقات ہی اصل دولت ہیں۔ مال و دولت، شہرت، اور دوسری دنیاوی چیزیں وقت کے ساتھ بے معنی ہو جاتی ہیں، مگر حقیقی خوشی اور اطمینان اچھے تعلقات میں ہے۔ امام علیؑ نے فرمایا" : الأَخُ الصَّدُوقُ خَيْرٌ مِنَ المَالِ المَكْسُوبِ "یعنی" سچا دوست حاصل کیے گئے مال سے بہتر ہے۔" یہی وجہ ہے کہ محبت، خلوص، اور سچی دوستی کو زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے، کیونکہ یہی چیزیں بڑھاپے میں انسان کے ساتھ رہتی ہیں، جبکہ دنیا کی دوسری چیزیں رفتہ رفتہ بے وقعت ہو جاتی ہیں۔

مال کی حقیقت بھی عجیب ہے، یہ جتنا بھی جمع کر لیا جائے، اس کی محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ مگر جو مال منصوبہ بندی کے بغیر خرچ کیا جائے، وہ بڑھاپے میں انسان کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے" : وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا "(سورہ الاسراء:29) یعنی" نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ لو (بخیل بنو)، اور نہ ہی اسے حد سے زیادہ کھول دو (فضول خرچی کرو) کہ انجام کار ملامت زدہ اور حسرت زدہ ہو جاؤ۔"

زندگی میں جو کچھ بویا جاتا ہے، وہی کاٹا جاتا ہے۔ اگر اچھے کام کیے گئے، دوسروں کی مدد کی گئی، والدین کی خدمت کی گئی، علم سیکھا اور سکھایا گیا، تو یہ سب بڑھاپے میں سکون اور راحت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لیکن اگر زندگی نادانی اور خود غرضی میں گزار دی جائے تو بڑھاپے میں یہی غفلت انسان کو پریشان کرتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے" : كَمَا تَدِينُ تُدَانُ "یعنی

"جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے۔" اگر زندگی میں اچھے کام کیے گئے ہوں، تو بڑھاپے میں ان کے مثبت اثرات نظر آتے ہیں، ورنہ انسان اپنے ماضی پر حسرت کرتا رہتا ہے۔

حسد اور جلن ایسی بیماریاں ہیں جو انسان کی روح کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ حسد کرنے سے نہ تو دوسرے کو نقصان پہنچتا ہے اور نہ ہی اپنا بھلا ہوتا ہے، بلکہ یہ انسان کی اپنی خوشیوں کو کم کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا" :وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ "(سورہ النساء:32) یعنی "اور اس چیز کی آرزو نہ کرو جو اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔" جو شخص دوسروں کی کامیابی پر جلتا ہے، وہ اپنی خوشیوں کو خود ہی ختم کر دیتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کا اپنا مقدر ہے اور اللہ سب کو مختلف آزمائشوں میں رکھ کر ان کا امتحان لیتا ہے۔

دنیا کی چیزوں کے پیچھے بھاگنے سے انسان کے سکون میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا یہ چیزیں بوجھ بن جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ بڑے گھروں، زیادہ مال و دولت اور دنیاوی عیش و عشرت کے پیچھے دوڑتے ہیں، مگر جب عمر بڑھتی ہے، تو یہی چیزیں ان پر گراں گزرنے لگتی ہیں۔ امام علیؑ نے فرمایا" :لَيْسَ الزُّهْدُ أَنْ لَا تَمْلِكَ شَيْئًا، وَلَكِنَّ الزُّهْدَ أَنْ لَا يَمْلِكَكَ شَيْءٌ "یعنی "زہد یہ نہیں کہ تمہارے پاس کچھ نہ ہو، بلکہ زہد یہ ہے کہ کوئی چیز تم پر حاوی نہ ہو۔"

زندگی میں سب سے زیادہ افسوس ان چیزوں کا ہوتا ہے جو انسان کر سکتا تھا، مگر کسی نہ کسی وجہ سے نہیں کر سکا۔ وہ سفر جو کر سکتے تھے، وہ مواقع جو ضائع کر دیے، وہ نیکیاں جو انجام نہیں دیں، ان سب پر انسان بعد میں پچھتاتا ہے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں" :الفُرصَةُ تَمُرُّ مَرَّ

السَّحابِ، فَانتَهِزُوا فُرَصَ الخَيرِ "یعنی "مواقع بادلوں کی طرح گزر جاتے ہیں، پس نیکی کے مواقع سے فائدہ اٹھاؤ۔" جو چیز زندگی میں ممکن ہو، اسے کر گزرنا چاہیے، کیونکہ وقت پلٹ کر نہیں آتا۔

ہر صبح جو نصیب ہوتی ہے، وہ ایک نئی زندگی کی علامت ہے۔ جو لوگ شکر کے ساتھ اپنی زندگی کو دیکھتے ہیں، وہ ہر دن کو ایک نئے موقع کے طور پر قبول کرتے ہیں اور اس کا بہترین استعمال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " :لَئِن شَكَرۡتُمۡ لَأَزِيدَنَّكُمۡ "(سورہ ابراہیم:7)یعنی "اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں مزید دوں گا۔" جو لوگ زندگی کی حقیقت کو جلد سمجھ جاتے ہیں، وہ وقت، صحت، تعلقات اور نیکی کے مواقع کو ضائع نہیں کرتے اور ہر دن کو ایک نعمت سمجھ کر بسر کرتے ہیں۔

زندگی کا سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ انسان کو وقت کی قدر، صحت کی حفاظت، تعلقات کی اہمیت، اور اعمال کے انجام پر گہری نظر رکھنی چاہیے۔ اکثر لوگ وقت کو یوں ضائع کرتے ہیں جیسے یہ کبھی ختم نہ ہو گا، مگر جیسے ہی زندگی کی سانسیں محدود محسوس ہونے لگتی ہیں، تب انہیں اس کی حقیقی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر کسی کو وقت کے گزرنے کا شعور ابتدا میں ہو جائے، تو وہ ہر لمحے کو دانش مندی سے استعمال کرے گا اور نیکیوں میں سبقت لے جائے گا۔ قرآن مجید میں اللہ نے زمانے کی قسم کھا کر انسان کے خسارے میں ہونے کی حقیقت بیان کی، جس سے واضح ہوتا ہے کہ جو وقت کا صحیح استعمال نہ کرے، وہ نقصان میں رہے گا۔

انسان کی صحت ایک خاموش نعمت ہے، جس کی حقیقی قدر تب ہوتی ہے جب وہ چھننے لگتی ہے۔ نوجوانی میں اگر کھانے پینے، نیند، ورزش اور ذہنی سکون کا خیال نہ رکھا جائے تو بڑھاپے میں یہی لاپرواہی جسم کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ جو لوگ اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی صحت پر توجہ دیتے ہیں، وہ زندگی کی آخری سانسوں تک تازگی اور توانائی محسوس کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحت اور فراغت کو بڑی نعمتیں قرار دیا، جن کا اکثر لوگ صحیح استعمال نہیں کرتے۔ اگر انسان اس حقیقت کو جلدی سمجھ لے تو وہ اپنی زندگی کو بہتر اور متوازن انداز میں گزار سکتا ہے۔

تعلقات کی اہمیت وقت کے ساتھ مزید واضح ہو جاتی ہے۔ دولت، عہدہ اور شہرت وقت کے ساتھ ماند پڑ جاتے ہیں، لیکن اچھے دوست، خاندان، اور محبت بھرے رشتے وہ چیزیں ہیں جو انسان کے دل کو اطمینان اور روح کو سکون فراہم کرتی ہیں۔ وہ لوگ جو صرف دنیاوی کامیابیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، وہ آخر میں تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جبکہ جو اپنے تعلقات کی پرورش محبت اور خلوص کے ساتھ کرتے ہیں، انہیں بڑھاپے میں بھی اپنوں کی محبت اور عزت نصیب ہوتی ہے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں کہ سچا دوست حاصل کیا گیا مال و دولت سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے، کیونکہ جب دنیا کی تمام چیزیں چھوٹ جاتی ہیں، تب یہی رشتے اور دوستیاں سہارا بنتی ہیں۔

مال کی حقیقت بھی ایک ایسی سچائی ہے جو اکثر انسان دیر سے سمجھتا ہے۔ لوگ دولت جمع کرنے میں اپنی پوری زندگی لگا دیتے ہیں، مگر جب بڑھاپے میں داخل ہوتے ہیں، تب انہیں

احساس ہوتا ہے کہ یہ دولت ان کے کسی کام کی نہیں، اگر اس کا صحیح استعمال نہ کیا جائے۔ قرآن مجید میں اللہ نے سکھایا کہ نہ دولت کی محبت میں اندھے ہو جاؤ، اور نہ اتنے سخی بنو کہ خود محتاج ہو جاؤ۔ جو لوگ مال کو صحیح طریقے سے استعمال کرتے ہیں، وہی اصل میں سکون پاتے ہیں۔ جو لوگ دولت کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں، ان کے لیے یہ بوجھ بن جاتی ہے، اور آخر میں انہیں یہی سوچنا پڑتا ہے کہ انہوں نے ساری زندگی جو کمایا، اس کا وہ خود کتنا فائدہ اٹھا سکے؟

زندگی کے فیصلے اور اعمال ہی وہ بیج ہیں جو بعد میں انسان کی قسمت کی زمین میں اگتے ہیں۔ اگر کسی نے نیک اعمال کیے، دوسروں کی مدد کی، اور خود کو علم و حکمت کے ساتھ بہتر کیا، تو بڑھاپے میں اسے انہی اعمال کے مثبت نتائج ملتے ہیں۔ اگر کسی نے اپنی زندگی کو بیکار کاموں، گناہوں، اور دنیاوی خواہشات کے پیچھے ضائع کر دیا، تو اس کے نتائج بھی اسے آخری عمر میں بھگتنے پڑتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جیسے کروگے ویسا پاؤگے، اس لیے جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی زندگی کا انجام بہتر ہو، وہ ابتدا سے ہی اچھے راستے کو اختیار کرے۔

حسد اور جلن ایسی بیماریاں ہیں جو انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ جو لوگ دوسروں کی کامیابی پر جلن محسوس کرتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے ذہنی سکون کو خود ہی ختم کر رہے ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہر شخص کا اپنا مقدر اور اپنی آزمائش ہوتی ہے، کسی کو زیادہ دیا گیا ہے تو کسی کو کم، لیکن حقیقی کامیابی اسی کی ہے جو اپنی آزمائش میں ثابت قدم رہے اور دوسروں کے لیے

نیکی اور خیر خواہی کے جذبات رکھے۔ قرآن مجید نے حسد کرنے سے منع کیا اور ہمیں سکھایا کہ دوسروں کے رزق اور مقام پر نظر ڈالنے کے بجائے اپنی محنت پر توجہ دینی چاہیے۔

دنیا کی چیزیں حاصل کرنا بظاہر اچھا لگتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب یہ چیزیں انسان پر حاوی ہو جاتی ہیں، تو یہ بوجھ بن جاتی ہیں۔ لوگ بڑے بڑے گھر، مہنگی گاڑیاں، اور زیادہ مال و دولت کے پیچھے دوڑتے ہیں، مگر بڑھاپے میں یہی چیزیں انہیں تھکا دیتی ہیں۔ امام علیؑ نے فرمایا کہ اصل زہد یہ نہیں کہ تمہارے پاس کچھ نہ ہو، بلکہ زہد یہ ہے کہ کوئی چیز تم پر حاوی نہ ہو۔ جو لوگ دنیا کی چیزوں کو زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں، وہ آخر میں پچھتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کس چیز کے لیے قربان کر دی۔

زندگی میں سب سے زیادہ افسوس ان چیزوں کا ہوتا ہے جو انسان کر سکتا تھا مگر نہیں کر سکا۔ وہ مواقع جو ہاتھ سے نکل گئے، وہ نیکیاں جو کرنے کی ہمت نہ ہوئی، وہ خواب جو حقیقت بن سکتے تھے مگر ٹلتے رہے، یہی چیزیں بڑھاپے میں پچھتاوے کا باعث بنتی ہیں۔ امام علیؑ نے فرمایا کہ مواقع بادلوں کی طرح گزر جاتے ہیں، اس لیے نیکی کے مواقع کو ضائع مت کرو۔ جو لوگ اپنی زندگی کو وقت پر سنوار لیتے ہیں، وہ بڑھاپے میں حسرت نہیں بلکہ سکون اور فخر کے ساتھ اپنی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں۔

ہر دن جو نصیب ہوتا ہے، وہ ایک نئے موقع کی مانند ہے۔ ہر صبح کا آغاز ایک نئی زندگی کی طرح ہوتا ہے، اور جو لوگ شکر گزاری کے ساتھ اپنے دن کا آغاز کرتے ہیں، وہی حقیقی خوشی پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں مزید دوں گا، اس

لیے جو لوگ اپنے پاس موجود نعمتوں کی قدر کرتے ہیں، وہی زندگی میں کامیاب اور مطمئن رہتے ہیں۔ جو شخص اس حقیقت کو جلد سمجھ لے، وہ اپنی زندگی کو زیادہ بامعنی اور بہتر بنا سکتا ہے۔

خاموشی! ایک طاقتور ہتھیار

خاموشی ایک طاقتور ہتھیار ہے جو بعض اوقات الفاظ سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ جو لوگ آپ کی بات کی قدر نہیں کرتے، ان کے لیے خاموشی ہی بہترین ردعمل ہے کیونکہ وہ آپ کے الفاظ کے مستحق ہی نہیں۔ خاموشی کسی ایسے شخص کے لیے بھی بہترین جواب ہے جو آپ کی سوچ، احساسات یا جذبات کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ بعض اوقات بحث و تکرار میں الجھنے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا زیادہ دانشمندی کا مظاہرہ ہوتا ہے، کیونکہ خاموشی نہ صرف ایک بے مقصد بحث کا خاتمہ کرتی ہے بلکہ دوسروں کو سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں" : جب عقل کامل ہو جاتی ہے تو کلام کم ہو جاتا ہے۔ "یعنی بعض اوقات خاموشی زیادہ حکمت بھری ہوتی ہے کیونکہ غیر ضروری بات چیت میں الجھنے کے بجائے سکون اختیار کرنا زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ اسی طرح امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں" : خاموشی دل کی راحت اور حکمت کا دروازہ ہے۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ خاموشی نہ صرف ذہنی سکون کا ذریعہ ہے بلکہ یہ حکمت اور بصیرت کے دروازے بھی کھولتی ہے۔

خاموشی کسی ایسے فرد کے لیے بھی بہترین ردعمل ہے جو صرف آپ کو غصہ دلانا چاہتا ہے یا آپ کی جذباتی کیفیت کو آزمانا چاہتا ہے۔ ایسے موقع پر بولنے کے بجائے خاموش رہنا زیادہ طاقتور ہوتا ہے، کیونکہ اس طرح دوسرا شخص زیادہ بے چین ہوتا ہے اور خود اپنی غلطی پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" :اور جب جاہل لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ (جواب میں) سلام کہتے ہیں۔ "(الفرقان: 63) یعنی مومن کا شیوہ یہ ہے کہ وہ جاہلوں کی باتوں کا مناسب جواب خاموشی یا نرمی سے دیتا ہے تاکہ بے فائدہ بحث میں نہ الجھے۔

خاموشی بعض اوقات ایک شخص کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ آخر آپ کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔ وہ لوگ جو آپ کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، آپ کی خاموشی کے ذریعے یہ احساس کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کی زندگی میں کس حد تک اثر رکھتے ہیں۔ خاموشی بعض اوقات اس سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے جتنا کہ سخت الفاظ۔ جو لوگ آپ کے جذبات کی قدر نہیں کرتے، ان کے لیے خاموشی ایک واضح پیغام ہے کہ آپ ان سے قطع تعلق کر چکے ہیں یا ان کی بے قدری کا جواب انہیں خاموشی سے دے رہے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ آپ سے سچ میں محبت کرتے ہیں، وہ آپ کی خاموشی کو محسوس کرتے ہیں اور اس سے پریشان ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو آپ کے خیالات، جذبات اور موجودگی کی پرواہ ہے تو آپ کی خاموشی انہیں بے چینی میں مبتلا کر دے گی، اور وہ یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ آپ کی خاموشی کا سبب کیا ہے۔ اس لیے خاموشی بعض اوقات

تعلقات میں ایک آزمائش بن جاتی ہے کہ کون آپ کی حقیقی قدر کرتا ہے اور کون محض رسمی رویہ اپنائے ہوئے ہے۔

خاموشی بدلہ لینے کا ایک بہترین ذریعہ بھی ہو سکتی ہے، خاص طور پر جب کوئی آپ کو تکلیف پہنچا چکا ہو اور آپ اس کا جواب دینا ضروری نہ سمجھیں۔ بعض اوقات سب سے بڑی سزا یہی ہوتی ہے کہ آپ کسی کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیں، کیونکہ بے توجہی اور عدم دلچسپی کسی بھی انسان کے لیے سب سے بڑا صدمہ ہوتی ہے۔

لہٰذا خاموشی ایک ایسا ذریعہ ہے جو نہ صرف حکمت، صبر اور وقار کی علامت ہے بلکہ یہ تعلقات اور انسانی رویوں کو بہتر طریقے سے پرکھنے کا بھی بہترین طریقہ ہے۔ خاموشی کو ہمیشہ کمزوری نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ بعض مواقع پر یہی سب سے مضبوط جواب اور بہترین انتقام ثابت ہو سکتا ہے۔

خاموشی کی طاقت انسانی رویوں پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہ صرف ایک ردعمل نہیں بلکہ ایک طرزِ فکر اور حکمتِ عملی ہے جو مختلف حالات میں مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ جب کوئی آپ کے الفاظ کی قدر نہ کرے، تو خاموشی ہی سب سے بہتر جواب بن جاتی ہے، کیونکہ بے قدری کا جواب کبھی بھی بحث و تکرار سے نہیں دیا جا سکتا۔ جو لوگ آپ کو سمجھنے کے بجائے آپ پر فیصلے صادر کرتے ہیں، ان کے لیے خاموشی ایک آئینہ بن جاتی ہے جو انہیں ان کی اپنی کوتاہیوں کا عکس دکھاتی ہے۔

خاموشی وہ ہتھیار ہے جو بغیر کسی شور کے سب سے گہرا وار کرتا ہے۔ یہ بے وقعت لوگوں کے لیے پیغام ہے کہ آپ ان کے رویے سے متاثر نہیں ہوتے اور ان کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ آپ جذباتی ہو کر ردعمل دیں، ان کے لیے خاموشی ایک گہری الجھن پیدا کر دیتی ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کے اندر کیا چل رہا ہے، اور یہی چیز ان کے اندر بے چینی پیدا کرتی ہے۔ امام علیؑ کا قول ہے کہ "عقل مند آدمی کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہوتی ہے اور جاہل کا دل اس کی زبان کے پیچھے ہوتا ہے۔" یہ بتاتا ہے کہ خاموش رہنا اور درست وقت پر بولنا ایک دانشمندانہ حکمت عملی ہے۔

خاموشی بعض اوقات صبر کی علامت بھی ہوتی ہے۔ جو شخص دوسروں کی غلطیوں پر فوری ردعمل نہیں دیتا بلکہ سکون کے ساتھ سوچنے کا وقت لیتا ہے، وہ ہمیشہ ایک بہتر اور مؤثر فیصلہ کر پاتا ہے۔ خاموشی ایک ایسی طاقتور زبان ہے جو بغیر کہے بہت کچھ بیان کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی چابھی ہے جو تعلقات کو کھولنے اور بند کرنے، دونوں کام انجام دے سکتی ہے۔ بعض اوقات خاموشی، محبت کا اظہار ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ تعلقات کی آخری حد کو ظاہر کرتی ہے۔

انسان کی خاموشی اس کی شخصیت کا عکس ہوتی ہے۔ بعض لوگ الفاظ کے ذریعے اپنی موجودگی ثابت کرتے ہیں، جبکہ بعض خاموشی کے ذریعے اپنی اہمیت ظاہر کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" خاموشی صبر کی وہ اعلیٰ منزل ہے جو انسان کو مضبوط بناتی ہے اور اسے ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ جو

لوگ زندگی میں سکون اور حکمت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے خاموشی ایک نعمت ہے۔ یہ شور میں گم نہیں ہوتی بلکہ اپنی گہری بازگشت چھوڑ جاتی ہے، جو دوسروں کو دیر تک سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

خوبیاں۔ مخالفت کا ایک سبب

انسانی فطرت کا ایک عجیب اور پیچیدہ پہلو یہ ہے کہ لوگ اکثر کسی کی خامیوں سے زیادہ اس کی خوبیوں کی وجہ سے اس سے حسد اور بغض رکھتے ہیں۔ عمومی تصور یہ ہے کہ لوگ دوسروں کی کمزوریوں کا مذاق اڑاتے ہیں یا انہیں حقیر سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ معاشرتی اور نفسیاتی سطح پر، لوگوں کے درمیان مخالفت اور دشمنی کی بڑی وجہ دوسروں کی خوبیاں، کامیابیاں اور اچھائیاں ہوتی ہیں، خاص طور پر جب وہ خوبیاں ان کے اپنے مفادات سے متصادم ہوں یا ان کے اندر کسی قسم کے احساسِ محرومی کو جنم دیں۔ یہی حقیقت امام علی علیہ السلام کے اس قول میں بیان کی گئی ہے کہ "میرے عدل کرنے کے باعث (کرپٹ) لوگ میرے دشمن ہیں۔"

عدل ایک ایسی صفت ہے جو کسی بھی معاشرے کے استحکام اور فلاح کے لیے ضروری ہے، لیکن یہی عدل اکثر ان لوگوں کے لیے ناقابلِ قبول بن جاتا ہے جو ظلم، ناانصافی اور کرپشن کے عادی ہوتے ہیں۔ جب امام علیؑ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تو آپؑ نے اسلامی معاشرے میں مساوات اور عدل کا عملی نفاذ کیا۔ آپؑ نے کسی کو محض خاندانی تعلقات، مال و دولت، یا منصب کی بنیاد پر کسی اور پر فوقیت نہ دی، بلکہ ہر ایک کو اس کے حق کے مطابق مقام دیا۔ یہی وہ بنیادی خوبی تھی جو ان لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی جو ذاتی مفادات

کے عادی تھے۔ انہیں امام علیؑ کی کوئی ذاتی خامی نظر نہیں آتی تھی، بلکہ ان کا بغض آپؑ کی خوبیوں اور انصاف پسندی کی وجہ سے تھا، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ انہیں غیر منصفانہ فوائد حاصل رہیں، جو امام علیؑ کے عدل کے تحت ممکن نہ تھا۔

یہی اصول آج بھی انسانی معاشروں میں لاگو ہوتا ہے۔ اکثر لوگ ان افراد کو پسند نہیں کرتے جو دیانتدار، ایماندار، اور انصاف پرور ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی موجودگی میں کرپٹ عناصر اپنی بدعنوانیوں کو جاری نہیں رکھ سکتے۔ ایک دیانتدار شخص کی موجودگی بددیانت لوگوں کے لیے آئینہ بن جاتی ہے، جس میں وہ اپنی اخلاقی کمزوریاں دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے بغض رکھنے لگتے ہیں۔

مزید برآں، جب کوئی شخص اپنی قابلیت اور خوبیوں کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے تو وہ لوگ جو سفارش، دھوکہ دہی، یا دیگر غیر اخلاقی ذرائع سے کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص صرف اپنی محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پر کامیاب ہو۔ وہ نہ صرف اس کی مخالفت کرتے ہیں بلکہ اس کے خلاف پروپیگنڈا اور سازشیں بھی رچاتے ہیں تاکہ اسے نیچا دکھایا جا سکے۔

تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے مصلحین، دانشور، اور نیک سیرت افراد کو ہمیشہ ان کی خوبیوں کی وجہ سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے صرف اس لیے کنویں میں پھینک دیا کیونکہ وہ اپنے والد کے نزدیک زیادہ عزیز اور اخلاقی برتری رکھتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون نے اس لیے اپنا دشمن بنا لیا

کیونکہ وہ حق اور عدل کی بات کرتے تھے، جو فرعون کے ظلم و جبر کے نظام کے لیے خطرہ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی قریش نے محض اس لیے دشمن بنالیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے معاشرتی نظام میں انصاف اور توحید کی بنیادیں رکھنی چاہیں، جو ان کے مشرکانہ اور استحصالی نظام کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔

یہی اصول عام زندگی میں بھی لاگو ہوتا ہے۔ اگر کسی ادارے میں ایک فرد ایمانداری اور محنت سے کام کرے اور دوسروں کو بھی دیانتداری کی ترغیب دے، تو اکثر کرپٹ لوگ اس کے خلاف محاذ بناتے ہیں۔ وہ اسے نیچا دکھانے اور اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس کی ایمانداری ان کے مفادات کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔

اسی طرح، اگر کوئی شخص علم، ہنر، اور قابلیت میں دوسروں سے ممتاز ہو، تو اسے معاشرے میں اکثر حسد اور بغض کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ خود اس مقام پر نہیں پہنچ پاتے، وہ اپنی نااہلی تسلیم کرنے کے بجائے کامیاب اور باصلاحیت لوگوں کے خلاف بغض رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے، جس میں انسان اپنی ناکامی کی ذمہ داری خود پر ڈالنے کے بجائے کسی اور کی کامیابی کو اپنی محرومی کی وجہ سمجھنے لگتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام علیؑ جیسے عظیم اور عادل حکمران کو بھی دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ ان کی زندگی میں کوئی ایسی خامی نہ تھی جسے بنیاد بنا کر ان کی مخالفت کی جا سکے۔ آپؑ کی خوبیوں نے ہی آپؑ کے دشمن پیدا کیے، کیونکہ وہ لوگ جو ناانصافی، اقربا پروری، اور کرپشن کے عادی تھے، آپؑ کے عدل و انصاف کے نظام میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتے تھے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر زمانے اور ہر معاشرے میں موجود رہی ہے اور رہے گی۔ لوگ اکثر دوسروں کی برائیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، لیکن اگر کوئی خوبی میں ممتاز ہو جائے، ایمانداری اور دیانت کی مثال بن جائے، یا عدل و انصاف کے اصولوں پر قائم رہے، تو وہی خوبیاں اس کے خلاف مخالفت، حسد، اور بغض پیدا کر دیتی ہیں۔ یہی دنیا کا دستور ہے اور یہی انسانی فطرت کا وہ پہلو ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔

خوف کی چادر میں لپٹی بزدلی

انسانی نفسیات میں خوف ایک بنیادی عنصر ہے جو اس کی سوچ، رویے اور فیصلوں پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ جب کوئی فرد یا گروہ کسی ایسے امتحان سے دوچار ہوتا ہے جس میں جان، مال، یا عزت و وقار کو خطرہ لاحق ہو، تو اس کے ردعمل مختلف ہوسکتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اتر آتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ بہانے تراش کر خود کو میدان سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے خوف کو چھپانے کے لیے مذہب، عقائد اور عبادات کا سہارا لیتا ہے، تاکہ وہ خود کو اور دوسروں کو یہ یقین دلا سکیں کہ ان کا میدان میں نہ اترنا کسی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی "اعلیٰ" دینی وجہ سے ہے۔

صدرِ اسلام میں ایسے افراد کی کئی مثالیں ملتی ہیں، جہاں لوگ جہاد کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے مذہبی حجتیں گھڑتے تھے۔ قرآن کریم میں ان لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو نبی اکرمؐ کے ساتھ جہاد میں جانے سے کتراتے تھے اور مختلف بہانے بناتے تھے۔ سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ ان منافقین کی ذہنیت کو بے نقاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ** "وَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُو الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ" ** (التوبہ: 86) یعنی جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کرو، تو ان میں سے صاحبِ حیثیت لوگ (جن کے پاس

وسائل ہوتے ہیں) آپؐ سے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ چھوڑ دیجیے۔

یہ طرزِ عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ایسے لوگ میدان میں اترنے کے بجائے اپنے خوف کو چھپانے کے لیے عقیدے، عبادت اور دیگر مذہبی دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ اپنے ضمیر کو مطمئن رکھنے کے لیے دلیلیں گھڑتے ہیں کہ "اصل جہاد تو نفس کا جہاد ہے"، یا "سب سے بڑی عبادت علم حاصل کرنا ہے"، یا "ہم دعا کے ذریعے مدد کریں گے"، لیکن درحقیقت یہ سب خیالی حجتیں ان کے اندر چھپے ہوئے خوف کی علامتیں ہوتی ہیں۔

نفسیاتی لحاظ سے یہ رویہ دفاعی میکانزم (defense mechanism) کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جہاں انسان ایک غیر آرام دہ حقیقت (اپنی بزدلی) کا سامنا کرنے کے بجائے، اس کا جواز تراش کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ افراد اس قدر شدت سے اپنے جواز پر یقین کر لیتے ہیں کہ وہ واقعی سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کا عمل ہی درست ہے، اور وہ دوسروں کو بھی قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جہاد جیسے عملی اقدامات کی بجائے "ذکر و عبادات" ہی سب سے زیادہ ضروری ہیں۔

اسلامی تاریخ میں کئی مواقع پر ایسے لوگوں نے اپنی بزدلی کو چھپانے کے لیے یہی رویہ اپنایا۔ جنگ احد میں منافقین کا ایک گروہ عین میدانِ جنگ سے واپس پلٹ آیا اور بعد میں اس کا

جواز یہ دیا کہ وہ "فتنے" میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ جنگ تبوک میں بھی بعض لوگوں نے گرمی کا بہانہ بنایا، جبکہ حقیقت میں ان کے دلوں میں میدان میں اترنے کا خوف تھا۔

یہی نفسیات آج بھی زندہ ہے۔ جب عملی میدان میں اترنے کا وقت آتا ہے، جب کسی حق کے لیے قربانی دینے کا لمحہ آتا ہے، تو بہت سے لوگ عبادات، عقائد، اور فلسفیانہ بحثوں میں الجھ کر اصل ذمہ داری سے فرار حاصل کرتے ہیں۔ وہ خود کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ دین کا اصل حسن صرف ذکر و اذکار اور روحانی مشقوں میں ہے، جبکہ میدانِ عمل میں اترنا، ظلم کے خلاف کھڑا ہونا، اور دین کی سربلندی کے لیے قربانی دینا ان کے نزدیک دوسرے درجے کی چیزیں بن جاتی ہیں۔ یہ رویہ دراصل خوف اور کمزوری کو چھپانے کا ایک نفسیاتی جال ہے، جو انسان اپنے لیے بُن لیتا ہے تاکہ اسے اپنی حقیقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

قرآن بار بار اس ذہنیت کو بے نقاب کرتا ہے اور ایمان والوں کو یاد دلاتا ہے کہ اصل کامیابی صرف عقائد اور عبادات میں نہیں، بلکہ دین کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے میں ہے۔ سچا مؤمن وہی ہے جو خوف اور دھوکے کی ان زنجیروں کو توڑ کر اللہ کے راستے میں قربانی دینے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

دوسروں کے سکون کی خاطر اپنا سکون قربان کرنا

دوسروں کے سکون کی خاطر اپنا سکون قربان کرنا ایثار، محبت اور قربانی کا ایسا مظہر ہے جو نہ صرف انسانی تعلقات کو مضبوط بناتا ہے بلکہ روحانی بلندی اور اخلاقی عظمت کی علامت بھی ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں ایثار اور قربانی کو بہت زیادہ فضیلت دی گئی ہے، کیونکہ یہ وہ صفت ہے جو انسان کو ذاتی مفاد سے بلند کر کے دوسروں کی فلاح و بہبود کو ترجیح دینے کی ترغیب دیتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ(الحشر:9) یعنی وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود انہیں تنگی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ آیت ایثار کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے کہ حقیقی مومن وہی ہوتا ہے جو اپنی ضرورت کے باوجود دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔

دوسروں کے سکون کے لیے اپنی راحت اور خوشیوں کو قربان کرنے کا سب سے بلند نمونہ ہمیں انبیاء، اولیاء اور اہلِ بیتؑ کی زندگیوں میں ملتا ہے۔ حضرت علیؑ کا یہ قول کہ "مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور اللہ کے نزدیک سب سے محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ نیکی کرے "اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دوسروں

کے آرام، عزت اور خوشیوں کے لیے اپنا سکون قربان کرنا دراصل اللہ کی رضا کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے دوسروں کی فلاح کے لیے اپنی تکالیف کو گلے لگایا۔ طائف کے میدان میں پتھر کھا کر بھی امت کی بھلائی کے لیے دعا کی، بھوک اور پیاس برداشت کی لیکن دوسروں کو سکون پہنچانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ اسی طرح امام حسینؑ کی قربانی اس بات کی سب سے بڑی مثال ہے کہ دوسروں کو ظلم سے بچانے، دین کو زندہ رکھنے اور امت کو بیدار کرنے کے لیے انہوں نے اپنی جان، اپنے اہلِ خانہ اور اصحاب کی قربانی پیش کی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص دوسروں کے آرام اور خوشی کے لیے اپنی خواہشات، نیند، آرام، اور حتیٰ کہ زندگی کی دیگر سہولتوں کو قربان کرتا ہے، وہ ایک روحانی بلندی پر فائز ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ وقتی طور پر آزمائشوں سے گزرتے ہیں، لیکن ان کے دل میں جو طمانیت اور اللہ کی رضا کا احساس ہوتا ہے، وہ ہر ظاہری نقصان سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ والدین کی مثال اس قربانی کی سب سے روشن علامت ہے، جو اپنی راتوں کی نیندیں قربان کرتے ہیں، اپنی خواہشات کو چھوڑ کر بچوں کی پرورش میں لگ جاتے ہیں، اور ان کی کامیابی کے لیے اپنی ہر راحت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

ایثار اور قربانی کا یہ جذبہ ایک فرد کو ذاتی مفاد، خود غرضی اور دنیاوی لالچ سے نکال کر ایک اعلیٰ انسانی مقام پر فائز کر دیتا ہے۔ حقیقی خوشی اور روحانی سکون اسی میں ہے کہ انسان

دوسروں کی زندگی میں راحت اور خوشی کا باعث بنے، کیونکہ یہی وہ عمل ہے جو نہ صرف دنیا میں محبت اور اخوت کو فروغ دیتا ہے بلکہ آخرت میں بھی نجات اور کامیابی کی ضمانت بنتا ہے۔

دوسروں کے سکون کی خاطر اپنا سکون قربان کرنا ایسی صفت ہے جو فرد کو صرف دوسروں کے قریب نہیں کرتی بلکہ اسے اللہ کے قرب کا مستحق بھی بناتی ہے۔ ایساانسان جو اپنی آرام دہ زندگی کو ترک کر کے دوسروں کی خوشیوں اور سہولتوں کے لیے جدوجہد کرتا ہے، درحقیقت وہی حقیقی مسرت پانے والا ہوتا ہے، کیونکہ خودغرضی اور انانیت انسان کے دل کو تنگ کر دیتی ہے، جبکہ ایثار اس میں وسعت، سکون اور روحانی روشنی پیدا کرتا ہے۔

انسان کی زندگی میں کئی مواقع ایسے آتے ہیں جب اسے انتخاب کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی آسانی کو ترجیح دے یا دوسروں کی بھلائی کو۔ ایک ماں جو رات کو جاگ کر اپنے بچے کو سنبھالتی ہے، ایک استاد جو اپنے شاگردوں کی بہتری کے لیے اپنی ذاتی راحت کو پس پشت ڈال دیتا ہے، ایک عالمِ دین جو اپنے آرام کی پرواہ کیے بغیر لوگوں کی ہدایت کے لیے جدوجہد کرتا ہے، ایک طبیب جو اپنی راتیں مریضوں کی خدمت میں بسر کرتا ہے، ایک سپاہی جو اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ملک وملت کی حفاظت کرتا ہے، یہ سب اسی قربانی اور ایثار کی عملی تصویریں ہیں۔

اسلام میں اس جذبے کو بے حد سراہا گیا ہے کیونکہ یہ انسانی تعلقات کو مضبوط کرتا ہے، معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دیتا ہے، اور سماج میں ایثار و قربانی کی ثقافت کو پروان چڑھاتا

ہے۔ اگر ہر انسان صرف اپنی ذات کے لیے سوچے اور دوسروں کی مشکلات کو نظرانداز کرے تو معاشرہ انتشار، بے حسی اور خودغرضی کا شکار ہو جائے گا، لیکن جب لوگ دوسروں کے آرام اور خوشی کے لیے اپنی راحت کو قربان کرتے ہیں تو محبت، ہمدردی اور بھائی چارہ فروغ پاتا ہے۔

قربانی اور ایثار کی یہ صفت صرف دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی انسان کے لیے کامیابی کی ضمانت بنتی ہے۔ جب کوئی شخص خلوصِ نیت سے کسی کی مدد کرتا ہے اور دوسروں کے لیے اپنی ذات کو وقف کرتا ہے تو اللہ اسے ایسی برکات اور تسکین عطا کرتا ہے جو ظاہری مال و دولت سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔ حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ جب تم کسی کے لیے آسانی پیدا کرتے ہو تو اللہ تمہاری مشکلات کو دور کر دیتا ہے۔ یہی وہ روحانی حقیقت ہے کہ جو دوسروں کے لیے قربانی دیتا ہے، اللہ اسے بے نیاز کر دیتا ہے اور اس کے دل کو ایسی خوشی اور اطمینان سے بھر دیتا ہے جو کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

دوسروں کے سکون کے لیے اپنی راحت کو ترک کرنا بظاہر مشکل نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں یہی اصل راحت اور طمانیت کا ذریعہ ہے۔ تاریخ کے عظیم انسانوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہی حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنی زندگیوں کو کھپا دیتے ہیں، ان کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہتا ہے اور وہی لوگ انسانیت کی حقیقی خدمت گزار کہلاتے ہیں۔

ڈرپوک منافق دانشوروں/صحافیوں سے ہوشیار رہیں!!

مغرب پرست دانشوروں اور صحافیوں کی نفسیاتی ساخت کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ان کی تحریریں، تقریریں اور بیانیے جدید غلامی کے نظام کو جواز بخشنے اور نیو کالونیل ازم کے اثرات کو چھپانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ افراد خود کو ترقی پسند اور حقیقت پسند کہلواتے ہیں، لیکن درحقیقت ان کی فکر ایک مخصوص فریم ورک کے تحت پروان چڑھی ہوتی ہے جو انہیں استعماری بیانیے کے دفاع پر مجبور کرتی ہے۔

ایسے دانشور عام طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو لاشعوری طور پر استعماری قوتوں کے جال میں پھنس چکے ہیں۔ یہ لوگ مغربی تعلیمی اداروں، میڈیا، اور عالمی نظریاتی نظام سے متاثر ہو کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دنیا طاقتوروں کے اصولوں پر چلتی ہے اور کمزور اقوام کا مقدر صرف بے بسی اور شکست خوردگی ہے۔ وہ تاریخ کے ان ابواب کو نظر انداز کرتے ہیں جہاں کمزور اقوام نے استعماری طاقتوں کو شکست دی اور اپنی آزادی حاصل کی۔ ان کی سوچ میں ایک داخلی احساسِ کمتری ہوتا ہے جو انہیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ مغرب کا نظام ناگزیر ہے، اس لیے اس کے خلاف مزاحمت کی بجائے اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہیے۔

دوسری قسم میں وہ دانشور شامل ہیں جو دانستہ طور پر استعماری قوتوں کے مفادات کا دفاع کرتے ہیں۔ یہ افراد مختلف عالمی میڈیا اداروں، این جی اوز، اور مغربی تھنک ٹینکس سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان کے خیالات اور تحریریں اس مخصوص بیانیے کو فروغ دیتی ہیں جس کے ذریعے مظلوم اقوام کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان کے مسائل کی اصل وجہ ان کی اپنی نااہلی اور اندرونی خرابیاں ہیں، نہ کہ بیرونی استعماری قوتیں۔ وہ نیو کالونیل ورلڈ آرڈر کو حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اسے ایک ایسافطری نظام بناکر دکھاتے ہیں جس میں طاقتور کی برتری کو ایک ناگزیر اصول سمجھا جاناچاہیے۔

یہ دانشور اور صحافی عام طور پر اپنی گفتگو میں "عملیت پسندی" اور "حقیقت پسندی" کا حوالہ دیتے ہیں تاکہ مزاحمت کے جذبات کو کمزور کر سکیں۔ وہ ہمیشہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ دنیا میں صرف معاشی اور فوجی طاقت ہی اہم ہے اور جو قومیں کمزور ہیں، ان کے پاس سوائے اطاعت کے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ وہ مظلوموں کو یہ پیغام دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ استعماری طاقتوں کے خلاف جدوجہد کرنا بے سود ہے، کیونکہ "طاقتور ہمیشہ طاقتور رہے گا اور کمزور ہمیشہ کچلا جائے گا۔" یہ سوچ درحقیقت ایک نفسیاتی ہتھیار ہے جس کے ذریعے غلامی کے خلاف بغاوت کے امکانات کو کمزور کیا جاتا ہے۔

یہ دانشور اپنے خیالات کو دانشورانہ لبادے میں چھپانے کے لیے مخصوص زبان اور اصطلاحات کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ کبھی "نیوٹرل صحافت" کا نعرہ لگاتے ہیں، کبھی "معروضیت" کی بات کرتے ہیں، اور کبھی "عالمی اصولوں" کا حوالہ دے کر عوام کو یہ باور کرانے کی

کوشش کرتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بس ایک "بین الاقوامی حقیقت" ہے جسے قبول کر لینا چاہیے۔ لیکن جب دنیا میں کہیں طاقتور مغربی ریاستیں کوئی ناانصافی کرتی ہیں تو یہی دانشور خاموش ہو جاتے ہیں یا پھر ایسی تشریحات پیش کرتے ہیں جو اصل مجرموں کو بری الذمہ ثابت کر دیں۔

ان کی نفسیاتی تشکیل میں ایک اور اہم عنصر "شخصی بقا" اور "مفادات کا تحفظ" ہے۔ جو صحافی یا دانشور مغربی میڈیا اداروں یا مغربی تھنک ٹینکس سے منسلک ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کے کیریئر اور مالی فوائد اسی وقت محفوظ رہ سکتے ہیں جب وہ استعماری بیانیے کی مخالفت سے گریز کریں اور اس کے بجائے ایسے مباحث چھیڑیں جو عوام کو ان کے اصل دشمنوں سے غافل رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر مسلمانوں کے داخلی مسائل کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں لیکن مغربی سامراجیت کے جرائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔
ان کی نفسیات میں ایک اور پہلو احساسِ برتری اور داخلی اجنبیت کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی سماج کو پسماندہ، رجعت پسند اور غیر منطقی سمجھتے ہیں، جبکہ مغرب کو عقلیت، ترقی اور آزادی کا واحد مرکز قرار دیتے ہیں۔ ان کے اندر یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ وہ مغرب کے منظورِ نظر بنیں، چاہے اس کے لیے انہیں اپنے ہی معاشرے کو کمتر ثابت کرنا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ استعماری سازشوں کو بے نقاب کرنے کے بجائے مظلوموں کو ہی موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔
یہ رویہ کسی بھی معاشرے کے لیے نہایت خطرناک ہوتا ہے کیونکہ یہ ذہنی غلامی کو فروغ

دیتا ہے۔ جب مظلوم اقوام کے دانشور ہی ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں اور انہی طاقتوں کی وکالت کریں جو ان کے حقوق سلب کر رہی ہیں، تو عوام میں شعوری بیداری کا عمل متاثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استعماری قوتیں ہمیشہ ایسے دانشوروں کو پروان چڑھاتی ہیں جو ان کے مفادات کا دفاع کریں اور عوام کو بے بسی کی نفسیات میں مبتلا رکھیں۔ تاہم، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ طاقت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی اور جب شعور بیدار ہوتا ہے تو سب سے پہلے ایسے دانشوروں کا نقاب اترتا ہے جو استعماری نظام کے محافظ بنے ہوتے ہیں۔ مسلمانوں اور دیگر کمزور اقوام کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے دانشوروں کی حقیقت کو پہچانیں، ان کے بیانیے کا تجزیہ کریں، اور اپنے مسائل کے حقیقی اسباب کو سمجھیں۔ اگر آج بھی مظلوم اقوام متحد ہو کر استعماری طاقتوں کے خلاف کھڑی ہو جائیں اور اپنے نظریاتی محاذ کو مضبوط کریں، تو جدید غلامی کے اس جال کو توڑا جاسکتا ہے اور حقیقی آزادی کی طرف سفر کا آغاز ممکن ہو سکتا ہے۔

نیو کالونیل ورلڈ آرڈر اور جدید غلامی کے اصولوں کو ناگزیر حقیقت کے طور پر پیش کرنے کا رجحان دراصل ایک نفسیاتی ہتھیار ہے جو مظلوم اقوام کو بے بسی کے احساس میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس تصور کو چیلنج کرنا ضروری ہے کیونکہ تاریخ بارہا یہ ثابت کر چکی ہے کہ طاقت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی، اور اگر کمزور اقوام شعوری طور پر مزاحمت کریں تو وہ اپنی تقدیر بدل سکتی ہیں۔

اگر دنیا میں ہمیشہ طاقتور ہی غالب رہتے اور کمزور ہمیشہ کچلے جاتے، تو حضرت موسیٰ (ع) کا فرعون کے جبر کے خلاف کھڑا ہونا اور بنی اسرائیل کا نجات پانا کبھی ممکن نہ ہوتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب ظلم کے خلاف قیادت میسر ہو، تو غلامی کی زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی انتہائی محدود وسائل کے ساتھ قیصر و کسریٰ جیسی سپر پاورز کو چیلنج کیا اور ایسی عظیم اسلامی ریاست قائم کی جس کی بنیاد عدل و انصاف پر تھی، نہ کہ طاقت کے زور پر جبر کرنے پر۔

یہ بیانیہ کہ زمین طاقتوروں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی اور کمزور اقوام ہمیشہ بے بس رہیں گی، تاریخ میں بارہا غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اگر طاقت کو ہی برتری کا واحد معیار مان لیا جائے تو صلاح الدین ایوبی کا بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے آزاد کرانا ممکن نہ ہوتا۔ اسی طرح، اگر دنیا صرف سرمایہ داروں اور استعماری طاقتوں کے زیرِ اثر چلتی، تو 1979ء میں ایران میں امام خمینیؒ کی قیادت میں انقلاب نہ آتا، جو دنیا کی سب سے بڑی سامراجی طاقت کے خلاف ایک تاریخی فتح تھی۔

یہ تصور کہ غزہ کے مظلوم عوام کا صفایا کر کے وہاں کوئی لگژری سوسائٹی یا کاروباری مرکز قائم کر دینا ترقی کی علامت ہو گی، درحقیقت جدید دور کی سب سے بڑی سفاکیت ہے۔ اگر فلسطینی عوام بھی اسی استعماری بیانیے کو قبول کر لیتے کہ "طاقت کا قانون ہی حتمی سچائی ہے"، تو آج وہ 75 سال کی مسلسل مزاحمت نہ کر رہے ہوتے، اور شاید فلسطین کا نام ہی مٹ چکا ہوتا۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مزاحمت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ الجزائر نے 130

سالہ فرانسیسی استعمار کے بعد آزادی حاصل کی، ویتنام نے امریکہ کو شکست دی، اور برصغیر نے 200 سالہ برطانوی غلامی سے نجات حاصل کی۔

س لیے یہ کہنا کہ کمزور ہمیشہ کمزور رہے گا اور دنیا صرف طاقتور کے اصولوں پر چلے گی، تاریخی حقائق سے انحراف ہے۔ اگر مسلمان باہم متحد ہو جائیں، جیسے ایران اور حزب اللہ نے استعماری طاقتوں کے خلاف کیا، تو نہ صرف اپنی مظلومیت سے نجات ممکن ہے بلکہ اس جابرانہ عالمی نظام کو بھی زمین بوس کیا جا سکتا ہے جو طاقتوروں کو کمزوروں کے استحصال کا اختیار دیتا ہے۔ دنیا میں عدل و انصاف اسی وقت قائم ہو گا جب مزاحمت کو اپنی طاقت بنایا جائے اور ظلم کے خلاف متحد ہو کر کھڑا ہوا جائے، جیسا کہ تاریخ کی عظیم تحریکوں نے ثابت کیا ہے۔

مزید مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں، جیسے کہ انبیاء اور معصومینؑ کی زندگیوں میں مزاحمت اور استقامت کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، جہاں الٰہی قیادت نے طاغوتی طاقتوں اور جبر کے نظام کو شکست دی۔ یہ مثالیں اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ اگر حق پر مبنی مزاحمت کی جائے تو باطل کا زوال یقینی ہے، چاہے وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔

حضرت نوحؑ کی مزاحمت اس وقت کے ظالم اور مشرک سماج کے خلاف تھی، جہاں بادشاہوں اور سرداروں نے حق کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن نوحؑ نے ساڑھے نو سو

سال تک مسلسل تبلیغ کی اور آخر کار اللہ کے عذاب کے ذریعے طاغوت کا خاتمہ ہوا، اور اہلِ ایمان کو نجات ملی۔

حضرت ابراہیمؑ نے نمرود جیسے جابر بادشاہ کے خلاف توحید کی صدا بلند کی، جس نے اپنی سلطنت کو خدائی کا درجہ دے رکھا تھا۔ ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کی سازش کی گئی، لیکن اللہ نے انہیں محفوظ رکھا اور بالآخر نمرود کا نظام تباہ ہو گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کی جدوجہد نے ملتِ توحید کی بنیاد رکھی، اور ان کی مزاحمت آج بھی حج اور دیگر اسلامی شعائر کی شکل میں زندہ ہے۔

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش تاریخ کی سب سے بڑی مزاحمتی تحریکوں میں سے ایک ہے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا اور وہ خود کو معبود کہلواتا تھا، لیکن حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے حکم سے اس کے جبر کے خلاف قیام کیا۔ فرعون نے ہر ممکن حربہ استعمال کیا، لیکن موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے صبر اور استقامت کے نتیجے میں دریا میں غرق ہو کر اس کا انجام ہوا، اور بنی اسرائیل کو آزادی نصیب ہوئی۔

حضرت عیسیٰؑ کا مقابلہ یہودی علما اور رومی حکمرانوں کے استحصالی نظام سے تھا۔ انہوں نے مذہبی منافقوں اور ظالم بادشاہوں کے خلاف آواز اٹھائی، جس کے جواب میں ان کے قتل کی سازش کی گئی، لیکن اللہ نے انہیں زندہ آسمانوں پر اٹھالیا اور ان کے دشمن ناکام ہو گئے۔ ان کی تعلیمات آج بھی ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کا درس دیتی ہیں۔

نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ الٰہی مزاحمت کی سب سے بڑی مثال ہے۔ مکہ میں مشرکین نے ہر ممکن طریقے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو دبانے کی کوشش کی، لیکن آپؐ نے صبر و استقامت کے ساتھ دینِ حق کی تبلیغ جاری رکھی۔ ہجرتِ مدینہ، بدر و احد کی جنگیں، صلح حدیبیہ، اور پھر فتح مکہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اگر مزاحمت خالصتاً اللہ کے لیے ہو تو وہ ضرور کامیاب ہوتی ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علیؑ نے نفاق، ظلم، اور استحصالی نظام کے خلاف عملی جدوجہد کی۔ جب خلافت کو خلافتِ الٰہیہ سے ملوکیت میں تبدیل کرنے کی سازش ہوئی، تو آپؑ نے خاموش مزاحمت کی اور جب وقت آیا تو ظالموں کے خلاف قیام کیا۔ آپؑ کی حکومت عدل و انصاف پر مبنی تھی، جسے استعماری قوتوں نے زیادہ دیر قائم نہ رہنے دیا، لیکن آپؑ کی فکر آج بھی حریت اور مزاحمت کی علامت ہے۔

سید الشہداء امام حسینؑ نے کربلا میں یزیدی نظام کے خلاف سب سے عظیم قربانی دی۔ یزید چاہتا تھا کہ اسلام کو ایک بادشاہت میں تبدیل کر دیا جائے، لیکن امام حسینؑ نے اپنی جان، اپنے خاندان، اور اپنے ساتھیوں کی قربانی دے کر اس استعماری نظام کو ہمیشہ کے لیے بے نقاب کر دیا۔ ان کی قربانی قیامت تک ہر دور کے ظالم حکمرانوں کے خلاف مزاحمت کا منشور بن چکی ہے، جسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔

امام زین العابدینؑ نے قید و بند اور یزیدی ظلم کے باوجود مزاحمت جاری رکھی اور دعا و مناجات کے ذریعے تحریکِ حسینی کو زندہ رکھا۔ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے علمی محاذ پر دشمن کا مقابلہ کیا اور اسلامی علوم کو اس انداز میں پھیلایا کہ آج دنیا ان کے علمی کارناموں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ نے ہارون رشید جیسے ظالم حکمران کی قید میں رہ کر استقامت کا وہ درس دیا جس نے عباسی استبداد کی بنیادیں ہلا دیں۔ امام علی رضاؑ کو مامون نے ولی عہدی کے جال میں پھنسانا چاہا، لیکن آپؑ نے اس کی چال کو ناکام بنا دیا اور اپنے علم و حکمت سے اسلامی بیداری کا احیاء کیا۔

یہ تمام مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ اگر حق پر مبنی مزاحمت کی جائے، تو استعماری اور جابرانہ طاقتوں کو شکست دینا ممکن ہے۔

اردو ادب اور صحافت میں ایسے دانشوروں کی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے جو یا تو شعوری طور پر نیو کالونیل ایجنڈے کے فروغ میں شریک رہے یا لاشعوری طور پر مغربی استعمار کے فکری اثرات کو تقویت دیتے رہے۔ ایسے افراد نے ہمیشہ مظلوم اقوام کی بے بسی کو مقدر بنا کر پیش کیا، اور سامراجی طاقتوں کو ایک ناقابلِ شکست حقیقت کے طور پر دکھایا۔ ان کی تحریروں میں ہمیشہ طاقتور کے بیانیے کو غالب حیثیت دی گئی، جبکہ مزاحمت کرنے والوں کو جذباتی، غیر منطقی اور ناکام قرار دیا گیا۔ بعض دانشور جیسے کہ منٹو کو اگرچہ سماج کے گہرے

تضادات اور طبقاتی مسائل پر کھل کر لکھنے والے ادیب کے طور پر جانا جاتا ہے، لیکن بعض اوقات ان کی تحریریں استعماری اثرات کو بے نقاب کرنے کے بجائے ان کی ترویج کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے سامراجی نظام کے استحصالی پہلوؤں کو براہ راست نشانہ بنانے کے بجائے ان کے زیرِ اثر پیدا ہونے والی بدحالی کو محض ایک سماجی حقیقت کے طور پر پیش کیا، جس میں تبدیلی کا امکان کم دکھائی دیتا ہے۔ یہی حال احمد علی کا ہے، جن کی تخلیقات میں اگرچہ برطانوی استعمار کے خلاف ایک دبے دبے احتجاج کی جھلک ملتی ہے، لیکن مجموعی طور پر وہ نیوکالونیل حقیقت کو چیلنج کرنے کے بجائے اس کا حصہ بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ علی عباس جلالپوری جیسے دانشوروں نے جدید مغربی فلسفے کو اس حد تک اپنایا کہ مشرقی فکر، خصوصاً اسلامی تہذیب کی اصل روح کو ایک قدامت پرست، غیر ترقی یافتہ اور جامد روایت کے طور پر پیش کیا۔ ان کے ہاں مغربی افکار کو ایک ناگزیر سچائی کے طور پر قبول کرنے کا رجحان نمایاں تھا، جو بالواسطہ طور پر نیوکالونیل نظام کے لیے راہ ہموار کرتا رہا۔ ان کے مقابلے میں عبداللہ حسین جیسے ناول نگاروں نے بھی اپنی تحریروں میں تاریخی اور سماجی حقائق کو سامراجی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کی تحریروں میں مزاحمتی بیانیے کے بجائے غلامی کی ایک نفسیاتی تسلیمیت زیادہ نمایاں رہی۔

صحافت میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو نیوکالونیل نظام کو تقویت دینے والے مائنڈ سیٹ کے نمائندہ رہے۔

قرآن کریم میں بزدلی، کمزوری اور جہاد سے گریز کرنے والوں کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اور تم بزدلی نہ دکھاؤ اور نہ غم کرو، تم ہی غالب آؤ گے اگر تم مؤمن ہو۔" (آل عمران: 139)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ مؤمنین کے لیے کمزوری اور بزدلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ پر ایمان رکھنے والا شخص کبھی مایوسی یا خوف میں مبتلا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہمت اور یقین کے ساتھ اللہ کے راستے میں جدوجہد کرتا ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں نکلو، تو تم زمین سے چمٹ جاتے ہو؟ کیا تم آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہو؟ حالانکہ دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑا ہے۔" (التوبہ: 38)

یہاں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو جہاد سے پیچھے ہٹتے ہیں اور دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے لوگ درحقیقت اپنی آخرت کو برباد کر رہے ہوتے ہیں، کیونکہ حقیقی کامیابی اسی میں ہے کہ اللہ کے دین کے لیے قربانی دی جائے۔

مزید برآں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وہ (منافقین) تمہارے ساتھ مل کر (جہاد میں) نہیں نکلتے مگر بہت کم، اور جب وہ تمہارے ساتھ ہوتے ہیں تو بس تمہاری نگرانی کرتے ہیں، اور جب خوف آ جاتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ موت کے ڈر سے ان کی آنکھیں ایسے گھوم رہی ہوتی ہیں جیسے کسی پر بے ہوشی طاری ہو گئی ہو، لیکن جب خوف دور ہو جاتا ہے تو تم پر تیز زبانیں چلاتے ہیں، مال و دولت کے لالچی ہیں۔ "(الاحزاب:18-19)

یہ آیات ان منافقین کا حال بیان کرتی ہیں جو بزدلی کے سبب دین کی راہ میں قربانی دینے سے کتراتے ہیں۔ وہ میدانِ جنگ میں کمزوری دکھاتے ہیں اور خطرہ ٹل جانے کے بعد زبانی دعوے کرتے ہیں، جبکہ ان کے دلوں میں ایمان کی حقیقی طاقت نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

"اگر تم جہاد کے لیے نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا اور تم اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکو گے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ "(التوبہ:39)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ جو لوگ اللہ کے راستے میں نکلنے سے گریز کرتے ہیں، اللہ انہیں سخت سزا دیتا ہے اور ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آتا ہے جو اس کے دین کے لیے جدوجہد کریں۔

قرآن کریم میں بارہا یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ بزدلی اور کمزوری ایک مؤمن کی شان کے خلاف ہے۔ اللہ کی راہ میں قربانی دینے والے ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں، جبکہ بزدل اور کمزور لوگ ذلت اور رسوائی میں مبتلا رہتے ہیں۔

خود پر کنٹرول حاصل کرنے میں ماہ رمضان کی اہمیت

تقویٰ اور نفس پر کنٹرول انسانی زندگی میں توازن، سکون اور کامیابی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ نفس اگر بے قابو ہو جائے تو انسان خواہشات کا غلام بن کر اپنی عقل اور شعور کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ جذباتی، اخلاقی اور روحانی تباہی کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ تقویٰ، جو درحقیقت اللہ کی نگرانی کا احساس ہے، انسان کو حدود میں رکھتا ہے اور اسے درست اور غلط کے درمیان فرق سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ ایک اندرونی قوت ہے جو برائیوں سے دور رکھتی ہے اور نیکیوں کی طرف مائل کرتی ہے۔

نفس کی خواہشات فوری تسکین چاہتی ہیں، لیکن اگر انہیں قابو میں نہ رکھا جائے تو انسان اپنی زندگی کے طویل المدتی فوائد کو قربان کر دیتا ہے۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر فیصلے کرنے لگتا ہے، جو اکثر نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ ضبطِ نفس کا مطلب صرف خواہشات کو دبانا نہیں، بلکہ انہیں اس انداز میں قابو میں رکھنا ہے کہ وہ انسان کی بہتری کے لیے کام کریں نہ کہ اسے نقصان پہنچائیں۔ جب کوئی شخص اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے، تو وہ خود کو گناہوں سے بھی بچا سکتا ہے اور اپنی شخصیت میں نظم و ضبط پیدا کر سکتا ہے، جو ہر میدان میں کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

روحانی نقطۂ نظر سے، نفس پر کنٹرول کے بغیر اللہ سے قربت حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک بے قابو انسان اپنے جذبات، خواہشات اور دنیاوی لذتوں میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی اصل حقیقت اور مقصدِ حیات کو بھول جاتا ہے۔ تقویٰ انسان کو اس غفلت سے نکالتا ہے اور اسے اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے، جس سے اس کے دل کو حقیقی سکون اور زندگی کو مقصدیت ملتی ہے۔ یہ اسے صرف ظاہری طور پر نیک بننے تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ اس کے باطن کو بھی پاکیزہ کرتا ہے، اس کے خیالات، ارادوں اور اعمال کو اللہ کی رضا کے مطابق ڈھالتا ہے۔

تقویٰ اور نفس پر قابو کے بغیر انسان اپنی زندگی میں ایک بے لگام گھوڑے کی مانند ہو جاتا ہے، جو کسی بھی سمت بھٹک سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی خواہشات کی باگیں کھینچ کر ان پر کنٹرول رکھے، تو وہ زندگی میں اعلیٰ اخلاقی اقدار اور معنوی ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ ضبطِ نفس اسے ہر قسم کی شدت پسندی، منفی جذبات اور وقتی جذباتیت سے بچاتا ہے، جس سے وہ ایک بہتر، باوقار اور کامیاب انسان بن سکتا ہے۔

روزہ انسان کے روحانی اور نفسیاتی پہلوؤں پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے، خاص طور پر جب تزکیۂ نفس اور تقویٰ کے حصول کی بات ہو۔ علمِ نفسیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو روزہ نفس کی تربیت کا ایک مؤثر ذریعہ ہے کیونکہ یہ انسان کو اس کی بنیادی جبلتوں پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے۔ کھانے، پینے اور دیگر جسمانی خواہشات سے پرہیز نفس کو قابو میں

رکھنے کا ایک عملی تجربہ فراہم کرتا ہے، جس کے نتیجے میں خود پر ضبط اور تحمل کی صفت پروان چڑھتی ہے۔

جب انسان کھانے اور دیگر ضروریات کو ترک کرتا ہے تو اس کے اندر قوتِ ارادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ نفسیاتی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ خود پر قابو پانے والے افراد زندگی میں زیادہ کامیاب اور متوازن ہوتے ہیں۔ روزہ رکھنے سے انسان میں یہ صلاحیت بڑھتی ہے کہ وہ فوری خواہشات کی تسکین کے بجائے طویل مدتی فوائد پر غور کرے، جو نفسیات میں delayed gratification کہلاتا ہے۔ یہ صفت نہ صرف تزکیۂ نفس میں مدد دیتی ہے بلکہ دیگر شعبوں میں بھی کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے۔

مزید برآں، روزہ انسانی جذبات کو بھی کنٹرول میں رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے، غصہ، بے چینی اور دیگر منفی جذبات کا اکثر تعلق نفس کی بے قابو خواہشات سے ہوتا ہے۔ جب انسان روزے کے دوران بھوک اور پیاس کو برداشت کرتا ہے، تو وہ صبر اور استقامت کو سیکھتا ہے۔ اس عمل سے ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے اور جذباتی استحکام میں اضافہ ہوتا ہے، جس کی جدید نفسیات میں بھی بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ روزہ انسان کو mindfulness یعنی شعوری آگاہی کا درس دیتا ہے۔ انسان اپنی حرکات وسکنات پر گہری نظر رکھتا ہے، گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنے خیالات کو پاکیزہ بنانے کی سعی کرتا ہے۔ یہ مسلسل خود احتسابی اور خود آگاہی کی

مشق نفسیاتی لحاظ سے بھی انتہائی مفید ہے، کیونکہ یہ فرد میں مثبت طرزِ فکر اور اصلاحِ نفس کی عادت پیدا کرتی ہے۔

تقویٰ کے حصول کے لیے روزہ ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے، کیونکہ یہ انسان کو اپنی زندگی میں سادگی، قناعت اور احساسِ ذمہ داری کی طرف راغب کرتا ہے۔ جب کوئی فرد مسلسل اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنا سیکھ لیتا ہے، تو وہ دنیاوی لذات کے دھوکے میں پڑنے کے بجائے اعلیٰ روحانی اور اخلاقی مقاصد پر توجہ مرکوز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس طرح روزہ محض ایک عبادت نہیں بلکہ نفسیاتی، اخلاقی اور روحانی ترقی کا ایک مکمل نظام ہے، جو انسان کو حقیقی تقویٰ اور پاکیزگی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

روزے کے ساتھ دیگر عبادات جیسے نماز، دعا اور تلاوتِ قرآن تقویٰ کے حصول اور نفس پر قابو پانے میں نہایت مؤثر ثابت ہوتی ہیں، کیونکہ یہ سب مل کر انسان کی ذہنی، روحانی اور نفسیاتی اصلاح کا ایک مکمل نظام تشکیل دیتی ہیں۔ علمِ نفسیات کی روشنی میں، عبادات کا مستقل معمول انسان کے ذہنی سکون، جذباتی توازن اور خود پر قابو پانے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔

نماز دن میں کئی مرتبہ دہرایا جانے والا ایک ایسا عمل ہے جو انسان کے شعور اور لاشعور میں گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے، تو وہ اپنی توجہ دنیاوی مصروفیات سے ہٹا کر ایک اعلیٰ مقصد کی طرف مرکوز کرتا ہے۔

یہ mindfulness اور meditation کی ایک اعلیٰ شکل ہے، جو نفسیاتی لحاظ سے انسان کے اندر سکون، یکسوئی اور خود آگاہی کو فروغ دیتی ہے۔ باقاعدگی سے نماز پڑھنے والا شخص اپنے جذبات کو بہتر طریقے سے کنٹرول کر سکتا ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں اسے مکمل طور پر اپنے خیالات اور حرکات پر توجہ دینی ہوتی ہے، جو ضبطِ نفس کی مشق ہے۔

دعا کا عمل انسان کے اندر عاجزی اور شکر گزاری کے جذبات پیدا کرتا ہے، جو نفسیاتی طور پر اسے مثبت سوچنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ جب کوئی شخص دعا کرتا ہے، تو وہ اپنی خواہشات اور پریشانیوں کو ایک اعلیٰ ہستی کے سپرد کر دیتا ہے، جس سے اس کا ذہنی دباؤ کم ہوتا ہے اور اس کے اندر صبر اور قناعت کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ جدید نفسیاتی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ دعا اور اللہ سے تعلق قائم رکھنے والے افراد میں مایوسی، بے چینی اور ذہنی دباؤ کم ہوتا ہے، کیونکہ ان کے پاس ایک ایسا سہارا ہوتا ہے جو انہیں امید دیتا ہے اور مشکل حالات میں سنبھالے رکھتا ہے۔

تلاوتِ قرآن تقویٰ اور ضبطِ نفس میں اس لیے مددگار ہے کیونکہ یہ نہ صرف روحانی بلکہ ذہنی اور جذباتی نشوونما کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ قرآن کی تلاوت اور اس پر غور و فکر انسان کے خیالات کو ایک مثبت رخ پر لے جاتی ہے اور اسے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ نفسیاتی طور پر، جب انسان ایک گہری اور معنی خیز کتاب کو توجہ سے پڑھتا ہے، تو اس کی cognitive abilities یعنی فکری صلاحیتیں بہتر ہوتی ہیں، اس کا ذہنی دباؤ کم ہوتا ہے اور وہ بہتر فیصلے کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ قرآن کی آیات خاص

طور پر انسانی نفسیات کے مطابق ہدایت فراہم کرتی ہیں، جو خوف، بے چینی، غصے اور لالچ جیسے منفی جذبات کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

یہ تمام عبادات روزے کے ساتھ مل کر نفس کے تزکیے کے عمل کو مضبوط کرتی ہیں۔ اگر صرف روزہ رکھا جائے لیکن باقی عبادات کو ترک کر دیا جائے، تو ضبطِ نفس اور تقویٰ کا وہ مطلوبہ اثر حاصل نہیں ہوتا جو ایک مکمل عباداتی نظام سے حاصل ہوتا ہے۔ جب انسان نماز، دعا اور تلاوت کو اپنے روزے کے ساتھ جوڑتا ہے، تو وہ مسلسل ایک ایسی کیفیت میں رہتا ہے جہاں اس کی روحانی اور نفسیاتی تربیت ہو رہی ہوتی ہے۔ اس کا دل اور دماغ پاکیزہ خیالات سے معمور ہو جاتے ہیں، اور وہ اپنی خواہشات کو قابو میں رکھ کر اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں مل کر اسے ایک مضبوط، متوازن اور تقویٰ کی راہ پر گامزن انسان بناتی ہیں، جو نہ صرف اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو پانے میں کامیاب ہوتا ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں صبر، حکمت اور استقامت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

بچپن میں والدین کی تربیتی کوتاہیاں اور نفاق کا علاج

فوری خواہشات کی تسکین اور چائلڈ ہُڈ ٹراما کے درمیان گہرا نفسیاتی تعلق پایا جاتا ہے۔ بچپن کے صدمے، جیسے نظر انداز کیا جانا، جذباتی یا جسمانی زیادتی، غیر محفوظ ماحول، یا والدین کی طرف سے محبت اور توجہ کی کمی، انسان کے ذہنی اور جذباتی نشوونما پر دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ایسے افراد اکثر جذباتی خلا کو بھرنے کے لیے فوری تسکین کی تلاش میں رہتے ہیں، کیونکہ ان کا دماغ خود کو بچانے کے لیے فوری خوشی اور راحت کے ذرائع کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

نفسیات کے مطابق، چائلڈ ہُڈ ٹراما کا شکار افراد اکثر impulse control یعنی فوری جذبات پر قابو پانے میں مشکلات محسوس کرتے ہیں۔ ان کے اندر صبر اور انتظار کی صلاحیت کمزور ہو جاتی ہے، کیونکہ ان کے ذہن نے ماضی میں تکلیف دہ تجربات کو برداشت کیا ہوتا ہے اور وہ کسی بھی قسم کے مزید درد سے بچنے کے لیے فوری طور پر خوشی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن میں صدمے جھیلنے والے افراد زیادہ تر ایسی سرگرمیوں میں مشغول ہو جاتے ہیں جو لمحاتی خوشی دیتی ہیں، چاہے وہ کھانے کی زیادتی ہو، نشہ آور اشیاء کا استعمال ہو، بے قابو خریداری ہو، یا سوشل میڈیا اور گیمز میں حد سے زیادہ وقت گزارنا ہو۔

یہ رویہ درحقیقت ایک دفاعی میکانزم کے طور پر کام کرتا ہے، جہاں دماغ dopamine کے ذریعے وقتی طور پر خوشی اور راحت حاصل کرتا ہے، لیکن طویل مدتی نقصان کا شکار ہو جاتا ہے۔ چونکہ ان افراد نے بچپن میں صبر، ضبطِ نفس، اور جذبات کو سنبھالنے کی مناسب مہارتیں نہیں سیکھیں ہوتیں، اس لیے وہ بڑے ہو کر اپنی پریشانیوں سے بچنے کے لیے فوری تسکین کے ذرائع اپنانے لگتے ہیں۔ یہ سلسلہ انہیں زندگی کے بڑے فیصلے کرنے میں بھی غیر مستحکم بنا سکتا ہے، کیونکہ وہ لمبے عرصے تک انتظار یا کسی بڑی قربانی کے لیے تیار نہیں ہوتے، بلکہ فوری حل چاہتے ہیں۔

اگر چائلڈ ہُڈ ٹراما کا صحیح علاج نہ کیا جائے تو یہ رویہ زندگی بھر قائم رہ سکتا ہے، اور انسان خود کو غیر صحت مند عادات میں جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ نفسیاتی علاج، خود آگاہی، صبر کی مشق، اور روحانی و جذباتی تربیت سے اس مسئلے پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اگر انسان اپنی ماضی کی تکالیف کا شعوری طور پر سامنا کرے اور خود کو وقت دے، تو وہ اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو پا کر بہتر اور متوازن زندگی گزار سکتا ہے۔

مکتبِ اہلِ بیتؑ چائلڈ ہُڈ ٹراما کے نتیجے میں پیدا ہونے والی فوری خواہشات کی تسکین کے رجحان پر گہرے روحانی، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ مکتب انسان کو صرف دنیاوی نفسیاتی اصولوں تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے ایک وسیع تر مقصد کی طرف متوجہ کرتا ہے، جہاں صبر، توکل، تقویٰ، اور خود سازی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اہلِ بیتؑ

کی تعلیمات ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ تکالیف اور آزمائشیں محض عارضی ہیں اور انہیں حکمت اور صبر کے ذریعے سمجھا اور سنبھالا جاسکتا ہے۔

اگر بچپن میں انسان کو جذباتی یا نفسیاتی زخم ملے ہوں، تو اہلِ بیتؑ کی سیرت اس کا عملی علاج فراہم کرتی ہے۔ امام علیؑ کا فرمان ہے کہ "صبر کامیابی کی کنجی ہے"، یعنی جو شخص مشکلات پر صبر کرتا ہے، وہ جلد بازی اور وقتی تسکین کی خواہشات سے بچ سکتا ہے اور بلند مقاصد کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ چائلڈ ہُڈ ٹراما اکثر انسان میں بے چینی، مایوسی اور اضطراب پیدا کرتا ہے، لیکن اہلِ بیتؑ کی تعلیمات سکون، ضبطِ نفس، اور اللہ پر بھروسہ کرنے کی طرف راغب کرتی ہیں، جو کسی بھی نفسیاتی بحران سے نکلنے کا سب سے مضبوط سہارا ہے۔

مکتبِ اہلِ بیتؑ میں دعا اور ذکر کو خاص اہمیت دی گئی ہے، جو دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی ایک ایسی روحانی توانائی ہے جو زخموں کو بھرنے میں مدد دیتی ہے۔ دعائے کمیل، مناجاتِ شعبانیہ اور صحیفۂ سجادیہ جیسی دعائیں نہ صرف انسان کو اپنے درد کے اظہار کا موقع دیتی ہیں بلکہ اسے اللہ کی رحمت اور مدد کا احساس بھی دلاتی ہیں، جس سے نفسیاتی سکون حاصل ہوتا ہے۔ امام زین العابدینؑ کی دعائیں خاص طور پر دکھوں اور جذباتی صدمات سے نمٹنے کے لیے ایک بہترین ذریعہ ہیں، کیونکہ ان میں ماضی کے زخموں کو صبر اور قربِ الٰہی کے ذریعے شفا دینے کا عملی طریقہ سکھایا گیا ہے۔

اس مکتب کی تعلیمات کے مطابق، فوری خواہشات کی تسکین میں گرفتار ہونے کے بجائے، انسان کو اپنی روحانی ترقی پر توجہ دینی چاہیے۔ امام صادقؑ نے فرمایا کہ "جو شخص اپنی خواہشات کو قابو میں رکھے، وہی حقیقت میں آزاد ہے"، یعنی جو اپنی نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھے، وہی حقیقی سکون اور آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ مکتبِ اہلِ بیتؑ کا دیا ہوا ضبطِ نفس اور تقویٰ کا درس انسان کے اندر اس قوت کو پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے جذبات پر حاوی ہو، اپنی زندگی کے زخموں کو نیکی، عبادت اور خدمتِ خلق کے ذریعے بھرے، اور اللہ کے قریب ہو کر اپنی اصل روحانی پہچان حاصل کرے۔

اس کے علاوہ، اہلِ بیتؑ کی سیرت میں ہمیں ان کی مشکلات اور آزمائشوں کے ساتھ صبر و استقامت کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو چائلڈ ہُڈ ٹراما سے گزرنے والے افراد کے لیے ایک عظیم درس ہو سکتی ہیں۔ کربلا کی تاریخ ایک زندہ مثال ہے کہ شدید ترین مصیبتوں کے باوجود امام حسینؑ اور ان کے اہلِ خانہ نے تقویٰ اور صبر کے ذریعے اپنے مقصد کو پایا۔ یہ واقعہ ہمیں سکھاتا ہے کہ تکلیفوں اور ماضی کے زخموں سے نکلنے کا راستہ وقتی خوشیوں میں پناہ لینا نہیں، بلکہ خود کو اللہ کے قریب کر کے صبر، استقامت اور بلند حوصلے سے اپنی زندگی کو سنوارنا ہے۔

مکتبِ اہلِ بیتؑ درحقیقت ایک مکمل نفسیاتی اور روحانی تربیت فراہم کرتا ہے، جو نہ صرف فوری خواہشات کی تسکین کی عادت کو ختم کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ ایک مضبوط، متوازن اور باوقار شخصیت کی تعمیر میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

نفاق در حقیقت ایک ایسی بیماری ہے جو انسان کے اندرونی تضاد، کمزور ارادے اور فوری تسکین کی خواہش سے جنم لیتی ہے۔ منافق کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہوتی ہے کہ وہ وقتی مفاد، ظاہری فوائد اور فوری آرام کو اپنی ترجیح بنا لیتا ہے، چاہے اس کے لیے اسے اپنے اصولوں، ایمان اور سچائی سے سمجھوتہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ چونکہ وہ مشکلات اور آزمائشوں کا سامنا کرنے کے بجائے آسان راستے کی تلاش میں ہوتا ہے، اس لیے اس کی شخصیت میں استقامت، سچائی اور مستقل مزاجی کی کمی رہتی ہے۔ یہی وہ بنیادی کیفیت ہے جو چائلڈہڈ ٹراما سے متاثرہ افراد میں بھی دیکھی جا سکتی ہے، کیونکہ وہ ماضی کے درد سے بچنے کے لیے فوری راحت کے ذرائع کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

تقویٰ وہ کیفیت ہے جو انسان کو فوری خواہشات پر قابو پانے کی صلاحیت دیتی ہے اور اسے ایک بلند مقصد کے لیے مشکلات برداشت کرنے کی ہمت عطا کرتی ہے۔ ایک متقی انسان اپنی خواہشات کو صرف وقتی آرام یا دنیاوی فائدے کے لیے استعمال نہیں کرتا، بلکہ وہ ہر فیصلے کو حق اور باطل کے معیار پر پرکھتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو نفاق کے علاج کے طور پر کام کرتی ہے، کیونکہ منافق کا بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ وہ وقتی فائدے کے لیے اپنے اصل چہرے کو چھپاتا ہے اور اصولوں کی قربانی دیتا ہے۔

قرآن میں بھی نفاق کو ایک ایسی بیماری قرار دیا گیا ہے جو دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسے مسلسل بڑھنے دیا جائے تو یہ ایمان کو کمزور کر دیتی ہے۔ تقویٰ اس بیماری کا اصل علاج ہے کیونکہ یہ انسان کے دل کو اللہ کی یاد سے معمور کر دیتا ہے، اس کے فیصلے وقتی جذبات کی

بجائے حقائق اور دیانت داری پر مبنی ہوتے ہیں، اور وہ وقتی فائدے کے بجائے طویل مدتی اخروی کامیابی کو اپنی ترجیح بنالیتا ہے۔

اگر کوئی شخص چائلڈ ہُڈ ٹراما کی وجہ سے نفاق جیسی کیفیت میں مبتلا ہو چکا ہو، جہاں وہ حقیقت کا سامنا کرنے کے بجائے فوری تسکین کے پیچھے بھاگ رہا ہو، تو اسے تقویٰ کے ذریعے اس کیفیت سے نکالا جا سکتا ہے۔ جب وہ صبر، استقامت اور خود پر قابو پانے کی تربیت حاصل کرتا ہے، تو وہ آہستہ آہستہ اپنے اندرونی تضاد سے نجات پانے لگتا ہے۔ تقویٰ اسے یہ شعور دیتا ہے کہ وقتی فائدے کے بجائے سچائی، دیانت داری اور اللہ کی رضا کی راہ اختیار کی جائے، اور اسی میں اس کی حقیقی فلاح ہے۔ یہی وہ طرزِ فکر ہے جو نفاق کی جڑ کو کاٹ دیتا ہے اور انسان کو ایک خالص، مضبوط اور سچے مؤمن کی حیثیت سے پروان چڑھاتا ہے۔

خلاصتاً چائلڈ ہُڈ ٹراما اور فوری تسکین کی خواہش کا گہرا تعلق ہے، کیونکہ ماضی میں جذباتی یا نفسیاتی زخم کھانے والے افراد میں صبر اور ضبطِ نفس کی کمی ہوتی ہے۔ وہ اپنی تکلیف سے فرار حاصل کرنے کے لیے فوری خوشی کے ذرائع اپناتے ہیں، جیسے بے قابو خریداری، نشہ آور اشیاء، یا وقت ضائع کرنے والی سرگرمیاں۔ اس رویے کی جڑیں لاشعوری طور پر ماضی کے صدمات سے جڑی ہوتی ہیں، جہاں انسان نے تکلیف کو برداشت کرنے کے بجائے فوری راحت کو ترجیح دی ہوتی ہے۔ اگر ان زخموں کا شعوری طور پر سامنا نہ کیا جائے، تو یہ رویہ زندگی بھر چلتا رہتا ہے اور شخصیت کی پختگی میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

مکتبِ اہلِ بیتؑ چائلڈ ہُڈ ٹراما سے نجات کا عملی راستہ فراہم کرتا ہے۔ یہ انسان کو صبر، توکل اور ضبطِ نفس سکھاتا ہے، جو فوری خواہشات کے غلامی سے نجات دلانے کے لیے ضروری ہے۔ اہلِ بیتؑ کی سیرت، ان کی دعائیں، اور ان کا طرزِ زندگی مشکلات کے باوجود صبر و استقامت کی بہترین مثالیں ہیں۔ امام زین العابدینؑ کی مناجات، امام علیؑ کے فرامین، اور امام حسینؑ کا کربلا میں طرزِ عمل ہمیں سکھاتا ہے کہ تکلیفوں کا حل وقتی خوشی میں نہیں بلکہ خود کو مضبوط بنانے میں ہے۔ تقویٰ اور اللہ سے قربت ماضی کے زخموں کو بھرنے کا سب سے مؤثر طریقہ ہے، کیونکہ یہ دل کو سکون دیتا ہے اور وقتی تسکین کی لت سے بچنے کی طاقت عطا کرتا ہے۔

نفاق بھی درحقیقت فوری تسکین کی بیماری ہے، کیونکہ منافق وہی ہوتا ہے جو وقتی فائدے کے لیے حق اور باطل کے درمیان جھولتا رہتا ہے۔ وہ سچائی اور استقامت کی راہ پر چلنے کے بجائے آسان راستہ اختیار کرتا ہے، جو اکثر وقتی مفاد سے جڑا ہوتا ہے۔ تقویٰ نفاق کا اصل علاج ہے، کیونکہ یہ انسان کو وقتی فائدے پر طویل المدتی کامیابی کو ترجیح دینا سکھاتا ہے۔ متقی انسان وقتی خواہشات کے پیچھے نہیں بھاگتا، بلکہ حق اور سچائی کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ جب ایک شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے، تو وہ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانے لگتا ہے، اپنے ماضی کے زخموں کا سامنا کرتا ہے اور خود کو اللہ کی رضا کے مطابق ڈھال لیتا ہے، جو نفاق کی جڑ کو کاٹ کر شخصیت میں سچائی اور استحکام پیدا کرتا ہے۔

والدین کی تربیتی کوتاہیاں, ایک فطری عمل ہے

ہر نسل کا اپنے والدین کے طریقوں کو پرانا سمجھنا اور ان میں غلطیاں یا کوتاہیاں محسوس کرنا ایک فطری اور قدرتی عمل ہے، جو زمانے کی تبدیلی اور انسانی ترقی کے ساتھ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ہر دور کے اپنے مخصوص حالات، نظریات اور ٹیکنالوجی ہوتی ہے، اور نئی نسل ان سے متاثر ہو کر ایک مختلف انداز میں سوچتی اور زندگی گزارتی ہے۔ جیسے جیسے دنیا آگے بڑھتی ہے، زندگی کے تقاضے بھی بدلتے جاتے ہیں، اور نئی نسل کو اپنے والدین کے طرزِ زندگی میں وہ فرسودگی نظر آتی ہے جو ان کے اپنے زمانے کے لحاظ سے غیر ضروری یا غیر موزوں محسوس ہوتی ہے۔

یہ سلسلہ صرف آج کے دور تک محدود نہیں بلکہ ہر زمانے میں یہی ہوتا آیا ہے۔ والدین اپنی زندگی کے تجربات کی بنیاد پر اپنے بچوں کی رہنمائی کرتے ہیں، جبکہ نئی نسل اپنی عقل، مشاہدے اور جدید دنیا کے اثرات کے تحت مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس فرق کی وجہ سے بعض اوقات والدین کے فیصلے سخت، غیر مؤثر یا دقیانوسی لگتے ہیں، جبکہ والدین سمجھتے ہیں کہ نئی نسل بے صبری اور جلد بازی کا شکار ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا نقطہ نظر اپنی جگہ درست ہوتا ہے، کیونکہ والدین کا تجربہ اور نئی نسل کی تازہ بصیرت، دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں بھی والدین اور اولاد کے تعلق کو اسی فطری حقیقت کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ قرآن نے والدین کے احترام کو لازم قرار دیا، لیکن ساتھ ہی عقل، حکمت اور مشاورت کو بھی اہمیت دی۔ امام علیؑ نے فرمایا کہ اپنے بچوں کی تربیت ان کے زمانے کے مطابق کرو، کیونکہ وہ ایک مختلف دور میں جینے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ اصول اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ زمانے کے فرق کو سمجھنا اور اسے قبول کرنا ضروری ہے، نہ کہ والدین اور اولاد کے درمیان تلخی اور دوری پیدا ہونے دی جائے۔

یہ فطری حقیقت کہ ہر نسل اپنے والدین کے طریقوں میں کچھ کمزوریاں محسوس کرتی ہے، ایک مثبت پہلو بھی رکھتی ہے۔ اگر اس تبدیلی کو صحیح انداز میں اپنایا جائے تو نئی نسل والدین کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اپنے زمانے کے مطابق بہترین راہ اختیار کر سکتی ہے۔ والدین کو بھی اس تبدیلی کو قبول کرتے ہوئے اپنی نصیحت اور رہنمائی کو نئی نسل کے مزاج کے مطابق ڈھالنا چاہیے، تاکہ ایک توازن قائم رہے اور نسلوں کے درمیان محبت اور ہم آہنگی برقرار رہے۔

والدین کی تربیت میں کمی بیشی ایک فطری امر ہے، کیونکہ وہ بھی انسان ہیں اور ان کی اپنی محدودات، تجربات اور حالات ہوتے ہیں۔ ہر والدین اپنی بہترین نیت کے ساتھ بچوں کی پرورش کرتے ہیں، مگر بعض اوقات ناواقفیت، سماجی دباؤ، یا اپنی ہی نفسیاتی الجھنوں کی وجہ سے کچھ کمزوریاں ان کی تربیت میں شامل ہو جاتی ہیں۔ انسان فطرتاً غلطیوں کا شکار ہوتا ہے،

اور والدین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، اس لیے اسلامی تعلیمات میں والدین کے لیے دعا اور مغفرت کی تلقین کی گئی ہے۔

اسلام نے والدین کے احترام کو لازم قرار دیا اور ان کے لیے دعا کو عبادت کا حصہ بنایا، تاکہ اولاد ان کی تربیت میں پائی جانے والی کمیوں کی بجائے ان کی محبت، محنت اور قربانیوں کو یاد رکھے۔ قرآن میں واضح طور پر والدین کے حق میں دعا سکھائی گئی: رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا یعنی "اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسے انہوں نے مجھے بچپن میں پالا تھا۔" یہ دعا اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ والدین نے جس طرح بچوں کی پرورش کی، اسی طرح وہ بھی اللہ کی رحمت کے محتاج ہیں۔

مکتبِ اہلِ بیتؑ میں بھی والدین کے لیے دعا کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ امام سجادؑ کی رسالۃ الحقوق میں والدین کے حقوق میں انہیں عزت دینے اور ان کے لیے دعا کرنے پر زور دیا گیا ہے، کیونکہ وہ اپنی زندگی میں جتنی بھی کوشش کریں، ان کی تربیت میں کچھ نہ کچھ کمی رہ ہی جاتی ہے۔ اولاد اگر والدین کی غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے لیے دعائیں کرے، تو یہ عمل جہاں والدین کے درجات کی بلندی کا سبب بنتا ہے، وہیں اولاد کے دل میں بھی نرمی، وسعتِ ظرف، اور شکر گزاری کو پروان چڑھاتا ہے۔

والدین کے لیے دعا اور مغفرت کا حکم صرف ان کی دنیاوی زندگی تک محدود نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی برقرار رہتا ہے۔ یہ نہ صرف والدین کے لیے نجات کا ذریعہ بنتا ہے

بلکہ اولاد کے کردار کو بھی سنوارتا ہے، کیونکہ جو اپنے والدین کے حق میں دعا کرتا ہے، وہ درحقیقت اپنے اندر شکر گزاری، محبت اور درگزر کی خوبیاں پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ اسلام کی یہ حکمت ہمیں سکھاتی ہے کہ والدین کی خامیوں پر توجہ دینے کے بجائے ان کی قربانیوں کو یاد رکھا جائے اور اللہ سے ان کے لیے بھلائی اور مغفرت طلب کی جائے، تاکہ خاندانی رشتے محبت اور رحمت کے اصولوں پر قائم رہیں۔

جلد بازی دکھانے والے وقت پڑنے پر بھاگنے والے ہوتے ہیں

یہود کا رسول کے انتظار میں ہونا اور مدینہ میں اس امید پر بسنا کہ جب وہ آئیں گے تو وہ ان کے ساتھ مل کر باطل کے خلاف جنگ کریں گے، ایک نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو صرف تاریخی تناظر میں نہیں بلکہ آج کے دور میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں انسان سچائی اور حق کی حمایت کا زبانی دعویدار ہوتا ہے، لیکن جب عملی اقدام کا وقت آتا ہے تو مختلف بہانے بنا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ یہود مدینہ میں رہ کر اہلِ کتاب ہونے کے ناطے خود کو باطل کے خلاف ایک بڑی قوت تصور کرتے تھے، مگر جب رسول اکرمؐ کا ظہور ہوا، تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی ہی پیش گوئی کے مطابق ان کا ساتھ دیتے، حسد، مفادات، اور خوف کی وجہ سے ان کے دشمن بن گئے۔ ان کے انتظار میں اخلاص نہیں تھا، بلکہ وہ کسی ایسے نجات دہندہ کو چاہتے تھے جو ان کے مفادات کے مطابق ہو، اور جب حقیقت ان کی توقعات کے برعکس نکلی، تو وہی لوگ دشمنی پر اتر آئے۔

اسی طرح رسول اللہؐ کے ساتھ رہنے والے کچھ افراد جب تک جہاد فرض نہیں ہوا تھا، بے چینی سے پوچھتے کہ کب انہیں یہ عظیم سعادت نصیب ہوگی، لیکن جب عملی طور پر جہاد کا وقت آیا، تو سب سے پہلے وہی پیچھے ہٹ گئے۔ یہ انسانی نفسیات میں ایک عام رویہ ہے کہ جب کسی کام کا تصور ہوتا ہے، تو انسان اس میں اپنی خواہشات، جذبات اور عزائم کے مطابق

ایک ہیرو کا کردار دیکھتا ہے، لیکن جب حقیقت میں اس کام کے تقاضے سامنے آتے ہیں، مشکلات اور قربانیاں درکار ہوتی ہیں، تو اس کے اندر کا خوف، مفادات اور سہولت پسندی اسے پسپا کر دیتی ہے۔

یہی نفسیاتی مسئلہ آج بھی موجود ہے۔ لوگ حق اور سچائی کے لیے بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں، خود کو انصاف، دیانت اور قربانی کے علَم بردار سمجھتے ہیں، لیکن جب انہیں حقیقت میں قربانی دینی پڑے، اپنے مفادات کو پسِ پشت ڈالنا پڑے، اور آزمائش کا سامنا ہو، تو وہی لوگ راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ اس مسئلے سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر تقویٰ اور خود احتسابی پیدا کرے، اپنے عمل اور نیت کو مسلسل پرکھے، اور کسی نظریے یا تحریک کی صرف زبانی حمایت کے بجائے اس کے عملی تقاضوں کے لیے خود کو تیار کرے۔ رسول اللہؐ کے دور میں جو لوگ جہاد کا مطالبہ کرتے تھے لیکن عملی طور پر بھاگ گئے، ان میں زیادہ تر وہی تھے جو جذباتی، وقتی جوش میں باتیں تو بڑی کرتے تھے، لیکن ان کے دل میں حقیقی استقامت نہیں تھی۔

مکتبِ اہلِ بیتؑ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ سچائی کی راہ پر چلنا صرف زبانی دعووں سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے عمل، صبر، اور قربانی درکار ہوتی ہے۔ امام حسینؑ کے ساتھیوں نے کربلا میں یہی ثابت کیا کہ سچائی کے لیے جان دینا بھی پڑے تو وہ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اگر آج کے دور میں ہم اس رویے سے بچنا چاہتے ہیں، تو ہمیں اپنی نیتوں کو خالص کرنا ہو گا، سچائی اور عدل کے لیے صرف باتوں میں نہیں بلکہ عمل میں بھی ثابت قدمی دکھانی ہو گی، اور خود کو

حقیقی قربانی کے لیے تیار رکھنا ہو گا، ورنہ ہم بھی اسی نفسیاتی مسئلے کا شکار ہو جائیں گے، جو یہودِ مدینہ اور فرار اختیار کرنے والے جنگجوؤں میں نظر آیا تھا۔

جدید علمِ نفسیات کے تناظر میں یہ رویہ کمیٹمنٹ کنڈرم (Commitment Conundrum) اور کوگنیٹیو ڈسوننس (Cognitive Dissonance) سے جُڑا ہوا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں انسان کسی نظریے، عقیدے یا مقصد سے جذباتی وابستگی کا اظہار تو کرتا ہے، لیکن جب حقیقت میں اس پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے اور اکثر راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ یہودِ مدینہ کا رسولؐ کے انتظار میں رہنا، مگر ان کے آنے کے بعد انکار کر دینا، اور مسلمانوں کا جہاد کے حکم کے انتظار میں بے چین ہونا، مگر جب حکم نازل ہوا تو بھاگ کھڑے ہونا، اسی نفسیاتی الجھن کی مثالیں ہیں۔

علمِ نفسیات کے مطابق، جب انسان کسی چیز کے بارے میں بلند توقعات قائم کر لیتا ہے اور اسے اپنے جذباتی یا سماجی تشخص کے ساتھ جوڑ لیتا ہے، تو وہ لاشعوری طور پر ایک آئیڈیل ورژن تخلیق کر لیتا ہے۔ جب وہ حقیقت سے ٹکراتا ہے، تو اگر وہ حقیقت اس کی توقعات کے برعکس نکلے، تو وہ ریزسٹینس بائیس (Resistance Bias) میں مبتلا ہو جاتا ہے، یعنی حقیقت کو تسلیم کرنے کے بجائے اسے مسترد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہودِ مدینہ نے ایک ایسے نبی کا تصور کیا تھا جو ان کے قومی مفادات کو تقویت دے گا، لیکن جب نبی اکرمؐ کی دعوت عدل، مساوات اور عالمگیر صداقت پر مبنی نکلی، تو وہ اس حقیقت کو قبول نہ کر سکے اور مخالفت پر اتر آئے۔

جہاد کے معاملے میں، جدید نفسیات میں ایڈونچر ازم (Adventurism) اور فینٹسی بیسڈ تھنکنگ (Fantasy-Based Thinking) کو دیکھا جا سکتا ہے، جہاں لوگ کسی چیز کے تصوراتی یا رومانوی پہلو سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن جب حقیقت میں اس کے چیلنجز کا سامنا ہوتا ہے، تو وہ ایسکیپ ازم (Escapism) کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ جنگ سے پہلے، لوگ اپنے اندر بہادری اور قربانی کا جذبہ محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ ذہنی طور پر ایک فاتحانہ، شاندار منظر نامہ بناتے ہیں، مگر جب حقیقت میں موت، تکلیف، اور مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، تو ان کی اصل نفسیاتی حالت کھل کر سامنے آتی ہے، اور وہ بھاگنے لگتے ہیں۔

یہ رویہ جدید دور میں بھی مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ لوگ نظریاتی طور پر تبدیلی، انصاف، اور قربانی کی باتیں کرتے ہیں، مگر جب انہیں عملی اقدامات کرنے پڑیں، اپنی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی لانی ہو، یا اپنے مفادات کی قربانی دینی ہو، تو وہ اپنی سہولت پسندی اور خوف کے باعث پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ یہ نفسیاتی مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب انسان کی گفتار اور عمل میں تضاد ہو، اور وہ خود کو ایک مثالی شخصیت کے طور پر دیکھنے کا عادی ہو، مگر اس مثالی تشخص کو حقیقت میں ڈھالنے کے لیے ضروری تکالیف سے گزرنے کے لیے تیار نہ ہو۔

اس سے بچنے کے لیے جدید نفسیات ہمیں سکھاتی ہے کہ ہم اپنی توقعات کو حقیقت پسندانہ بنائیں، اپنے عقائد اور رویوں میں ہم آہنگی پیدا کریں، اور اپنی عملی صلاحیتوں کو جذباتی دعووں سے الگ کر کے دیکھیں۔ اگر انسان سچائی کے لیے واقعی تیار ہو، تو اسے صرف زبانی

دعووں پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے نفس کی تربیت کرنی چاہیے تاکہ وہ آزمائش کے وقت ثابت قدم رہے اور وقتی جذباتی جوش میں آکر ایسی کمٹمنٹ نہ کرے جسے وہ پورا نہ کر سکے۔

اس صفت کے نفسیاتی اسباب انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں سے جُڑے ہوتے ہیں، جن میں سب سے بنیادی عنصر ابتدائی تربیت اور ماحول ہے۔ بچپن میں اگر کوئی فرد ایسے ماحول میں پروان چڑھتا ہے جہاں حقیقت پسندی اور عملی جدوجہد کی بجائے زبانی دعوے، خیالی دنیا اور غیر حقیقی توقعات کو فروغ دیا جاتا ہو، تو اس میں یہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ بڑی باتیں کرنے کا عادی ہو، مگر جب حقیقت میں عمل کرنے کا وقت آئے تو مشکلات سے گھبرا کر پیچھے ہٹ جائے۔ اگر والدین بچوں کو عملی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ کریں، بلکہ ہر چیز آسانی سے فراہم کر دیں، تو وہ ذہنی طور پر چیلنجز کے لیے تیار نہیں ہوتے اور جب زندگی میں قربانی یا سختی کا وقت آتا ہے، تو وہ راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔

ایک اور اہم سبب خود فریبی اور دفاعی میکانزم (Self-Deception & Defense Mechanisms) ہے۔ انسان اپنے ذہن میں ایک مثالی شخصیت کا تصور پیدا کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو ویسا ہی سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ اس نے کبھی اس کے لیے عملی اقدامات نہیں کیے ہوتے۔ جب حقیقت میں اس کا امتحان آتا ہے، تو اس کے اندر کی کمزوریاں کھل کر سامنے آتی ہیں، لیکن وہ ان کا سامنا کرنے کے بجائے بہانے تراشنے لگتا ہے، یا اپنے رویے کو جواز دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، جو لوگ جہاد کی جلدی کر رہے تھے، وہ

حقیقت میں خود کو نڈر مجاہد سمجھتے تھے، مگر جب میدانِ عمل آیا تو ان کے اصل خوف اور کمزوریاں ظاہر ہو گئیں، اور بجائے اس کے کہ وہ اپنی بزدلی کا اعتراف کرتے، وہ بہانے بنانے لگے۔

اس صفت کا ایک نفسیاتی جڑ فوری تسکین کی خواہش (Instant Gratification) بھی ہے۔ جو لوگ مشکلات کا سامنا کرنے کی عادت نہیں ڈالتے، وہ طویل المدتی محنت اور قربانی کی بجائے فوری نتائج چاہتے ہیں۔ جب وہ کسی چیز میں فوری طور پر کامیابی، عزت یا فتح نہیں دیکھتے، تو وہ اس سے دستبردار ہو جاتے ہیں یا خود کو کسی اور کام میں مشغول کر لیتے ہیں جو آسان ہو اور فوری خوشی دے۔ یہ مسئلہ آج کے دور میں زیادہ شدت سے پایا جاتا ہے کیونکہ جدید ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا نے ہر چیز کو فوری طور پر دستیاب کر دیا ہے، جس سے صبر، محنت اور استقامت جیسی خوبیاں کمزور پڑ گئی ہیں۔

ایک اور نفسیاتی پہلو گروہی دباؤ اور سماجی شناخت (Social Pressure & Identity Conflict) ہے۔ بعض اوقات لوگ کسی نظریے یا مقصد سے جذباتی وابستگی کا اظہار صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اپنے گروہ میں عزت اور قبولیت حاصل کر سکیں۔ جب انہیں لگتا ہے کہ کسی نظریے کو قبول کرنے سے وہ سماجی حیثیت میں اضافہ کر سکتے ہیں، تو وہ بلند دعوے کرتے ہیں، مگر جب حقیقت میں اس پر عمل کا وقت آتا ہے، تو وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کا مقصد صرف نظریے سے جذباتی جڑت تھا، اس پر عمل کرنا نہیں۔ یہی کیفیت مدینہ کے یہود میں بھی نظر آئی کہ انہوں نے ظاہری طور پر نبی آخر الزمانؐ کے

انتظار کو اپنی شناخت بنایا، مگر جب حقیقت سامنے آئی، تو انہوں نے اپنی سماجی اور سیاسی حیثیت کے خطرے کے پیشِ نظر اس کا انکار کر دیا۔

اس مسئلے سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو حقیقت پسندانہ بنیادوں پر استوار کرے، جذباتی جوش کی بجائے عملی تیاری کرے، اور فوری تسکین کی عادت سے نکل کر مستقل مزاجی اور استقامت پیدا کرے۔ یہی وہ اصول ہیں جو مکتبِ اہلِ بیتؑ نے سکھائے، جہاں اخلاص، صبر، اور حقیقت پسندی کو اہمیت دی گئی تاکہ انسان صرف زبانی دعووں پر نہیں بلکہ اپنے عمل سے اپنی سچائی ثابت کرے۔

انسانی نفسیات میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ کسی نظریے یا مقصد سے جذباتی وابستگی تو اختیار کر لیتا ہے، مگر جب اس پر عمل کا وقت آتا ہے تو ذہنی کشمکش، خوف، اور سہولت پسندی کے باعث راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ یہ رویہ اس کی ابتدائی تربیت، خود فریبی، فوری تسکین کی عادت، اور سماجی دباؤ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان کو عملی مشکلات کے لیے تیار نہ کیا جائے اور صرف خیالی دنیا میں جینے کا عادی بنا دیا جائے، تو وہ آزمائش کے وقت پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ مدینہ کے یہود اور ابتدائی مسلمانوں کی مثالیں اس نفسیاتی کیفیت کو واضح کرتی ہیں، جہاں لوگوں نے وقتی جذبات میں بڑے دعوے کیے مگر جب حقیقت کا سامنا ہوا تو وہ پسپا ہو گئے۔

یہ مسئلہ صرف ماضی تک محدود نہیں بلکہ آج بھی جدید زندگی میں مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے، جہاں لوگ نظریاتی طور پر کسی بڑی چیز کا حصہ بننے کا خواہش مند ہوتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو وہ مشکلات کے باعث پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اس سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ انسان حقیقت پسندی کو اپنائے، اپنے جذبات اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کرے، فوری تسکین کے بجائے صبر اور استقامت کو اپنائے، اور اپنی کمزوریوں کا اعتراف کر کے خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرے۔ مکتبِ اہل بیتؑ کا راستہ یہی سکھاتا ہے کہ عمل، استقامت اور اخلاص کے بغیر کوئی دعویٰ سچا ثابت نہیں ہو سکتا۔

ماں,بیوی اور شوھر

ماں، بیوی اور شوہر کے تعلقات ایک نازک مگر اہم توازن کا تقاضا کرتے ہیں، جس میں محبت، عزت، اور حقوق کی تقسیم نہایت حکمت کے ساتھ ہونی چاہیے۔ شوہر، ایک طرف ماں کا بیٹا ہے، جس نے اسے پالا، تربیت دی، اور زندگی کے ہر موڑ پر اس کا ساتھ دیا۔ دوسری طرف، وہ ایک بیوی کا شوہر ہے، جو اس کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کرتی ہے اور محبت، وفاداری اور رفاقت کا تقاضا رکھتی ہے۔

ماں کی محبت بے غرض ہوتی ہے، وہ اپنی اولاد کے لیے ہمیشہ خیر خواہ اور دعاگو رہتی ہے۔ بیوی کی محبت اگرچہ ماں سے مختلف ہوتی ہے، لیکن یہ بھی خلوص اور ایثار پر مبنی ہوتی ہے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شوہر ان دونوں کے درمیان توازن قائم نہیں کر پاتا اور کسی ایک کے حق میں جھکاؤ اختیار کر لیتا ہے۔ اگر وہ ماں کے جذبات کا لحاظ کیے بغیر بیوی کے حقوق کی طرف زیادہ جھک جائے تو ماں کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا اس سے دور ہو گیا ہے۔ دوسری طرف، اگر وہ ماں کی محبت اور تعلق کو بنیاد بنا کر بیوی کے جذبات اور حقوق کو نظر انداز کرے تو ازدواجی زندگی میں مسائل جنم لیتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں شوہر کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ والدین، بالخصوص ماں کے ساتھ حسن سلوک کرے، کیونکہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے، لیکن ساتھ ہی بیوی کے حقوق بھی

واضح طور پر متعین کیے گئے ہیں۔ بیوی کو نہ صرف عزت اور محبت دی جائے بلکہ اس کے ساتھ عدل اور انصاف کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو بہترین اخلاق کی علامت قرار دیا ہے اور خود اپنے عمل سے اس کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

بیوی کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ شوہر کی ماں صرف ایک عورت نہیں بلکہ وہ اس کا وجود اور شخصیت بنانے والی ہستی ہے۔ اگر وہ ماں کے احترام اور خدمت کو اپنی ذمہ داری سمجھ لے تو رشتے میں محبت اور برکت بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح، ماں کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ بیٹا اب ایک نئی ذمہ داری سنبھال چکا ہے اور اس کی ازدواجی زندگی میں سکون تبھی قائم رہے گا جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ خوش رہے گا۔

یہ رشتہ صرف قربانی اور ایثار کے ذریعے مضبوط ہو سکتا ہے۔ ماں کو بیٹے کی ازدواجی زندگی میں بے جا مداخلت سے گریز کرنا چاہیے، اور بیوی کو شوہر کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اپنے اخلاقی اور دینی فرض کے طور پر اپنانا چاہیے۔ شوہر کو چاہیے کہ وہ حکمت، محبت اور انصاف کے ساتھ ان دونوں رشتوں کو نبھائے تاکہ اس کے گھر میں سکون، محبت اور برکت قائم رہے۔

ماں، بیوی اور شوہر کے رشتے میں مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی ایک کی محبت، عزت اور حقوق کو دوسرے پر ترجیح دے دی جاتی ہے، یا جب احساسات اور جذبات کو سمجھنے

کی بجائے اپنی جگہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر ماں یہ محسوس کرے کہ اس کا بیٹا شادی کے بعد بدل گیا ہے، اس کی باتوں کو پہلے جیسی اہمیت نہیں دیتا، یا بیوی کے کہنے پر ماں کے جذبات کو نظر انداز کرتا ہے، تو دل میں شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی معاملہ بیوی کا بھی ہوتا ہے، جب وہ محسوس کرتی ہے کہ شوہر ہر بات میں اپنی ماں کی طرفداری کرتا ہے، اس کی ضروریات اور جذبات کو نظر انداز کرتا ہے، یا کسی بھی اختلاف میں ہمیشہ اپنی ماں کے حق میں فیصلہ کرتا ہے، تو وہ خود کو کمتر اور غیر اہم محسوس کرنے لگتی ہے۔

بہت سے مسائل اس وقت جنم لیتے ہیں جب ماں یہ چاہتی ہے کہ بیٹا پہلے کی طرح ہر وقت اس کا خیال رکھے، اور شادی کے بعد بھی اس کی ترجیحات میں کوئی تبدیلی نہ آئے، جبکہ بیوی یہ چاہتی ہے کہ شوہر کی محبت اور توجہ مکمل طور پر اس کے لیے ہو۔ بعض اوقات ماں کو لگتا ہے کہ نئی آنے والی بہو نے اس کے بیٹے کو اس سے چھین لیا ہے، اور بیوی کو لگتا ہے کہ ماں کا حد سے زیادہ دخل اندازی کرنا اس کی ازدواجی زندگی میں خلل ڈال رہا ہے۔ اگر شوہر ان دونوں کے درمیان انصاف نہ کر سکے، ماں کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے بیوی کے ساتھ محبت اور عزت کا رویہ نہ رکھ سکے، تو یہ نازک توازن بگڑ جاتا ہے۔

مسئلہ اس وقت اور پیچیدہ ہو جاتا ہے جب شوہر ماں اور بیوی کے درمیان پل بننے کے بجائے ایک فریق بن جائے، یا جب ماں اور بیوی دونوں اس کی محبت اور توجہ کو اپنی مکمل ملکیت سمجھنے لگیں۔ اگر شوہر کمزور ہو اور دونوں کے درمیان حکمت اور عدل کے ساتھ توازن قائم

نہ کر سکے، تو چھوٹے چھوٹے اختلافات بڑھ کر بڑے جھگڑوں میں بدل جاتے ہیں، جو بعض اوقات ازدواجی زندگی کو تباہی کی طرف لے جاتے ہیں۔

کبھی کبھار خاندان کے دیگر افراد بھی ان مسائل کو بڑھا دیتے ہیں، خاص طور پر اگر سسرال میں کسی کی جانب سے بہو کو نیچا دکھانے یا ماں کے خلاف اکسانے کی کوشش کی جائے۔ غلط فہمیاں، عدم برداشت، اور دوسروں کی باتوں میں آکر فیصلے کرنے کی عادت ان رشتوں کو مزید کشیدہ بنا دیتی ہے۔ اگر ہر فریق دوسرے کے جذبات اور مقام کو سمجھنے کے بجائے اپنی برتری ثابت کرنے پر تُل جائے، تو محبت کی جگہ تنازع اور سکون کی جگہ بے چینی لے لیتی ہے۔

ماں، بیوی اور شوہر کے رشتے میں پیدا ہونے والے مسائل کا بنیادی حل حکمت، عدل اور باہمی احترام میں پوشیدہ ہے۔ حکمت یہ ہے کہ ہر شخص اپنے مقام اور حدود کو سمجھے اور دوسرے کے جذبات اور ضروریات کا احترام کرے۔ عدل یہ ہے کہ شوہر دونوں رشتوں کے ساتھ انصاف کرے، نہ ماں کو بیوی پر مسلط کرے اور نہ بیوی کو ماں کے خلاف کھڑا کرے، بلکہ ہر ایک کو اس کے جائز حقوق دے اور محبت کے ساتھ توازن قائم رکھے۔

اگر ماں یہ سمجھ لے کہ بیٹے کی شادی ایک قدرتی عمل ہے، اور اب اس کی زندگی میں ایک نئی ذمے داری آگئی ہے، تو وہ بیٹے کی ازدواجی زندگی میں مداخلت کی بجائے اس کی حمایت کرے گی۔ اسے اپنی محبت کو اس طرح ظاہر کرنا چاہیے کہ بہو اسے رقیب یا حریف نہ سمجھے،

بلکہ ایک ماں کی حیثیت سے اس کا احترام کرے۔ اسی طرح، اگر بیوی یہ سمجھے کہ ماں کا رشتہ محض ایک خاندانی تعلق نہیں، بلکہ وہی ہستی ہے جس نے اس کے شوہر کو پروان چڑھایا اور سنوارا ہے، تو وہ ماں کو حریف سمجھنے کے بجائے اپنی زندگی کا حصہ تسلیم کرے گی۔

شوہر کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے، کیونکہ وہی اس توازن کو برقرار رکھنے والا ہے۔ اگر وہ ماں اور بیوی کے درمیان ایک منصف کا کردار ادا کرے اور دونوں کے جذبات کا احترام کرے، تو کسی کو شکوہ نہیں رہے گا۔ اسے چاہیے کہ وہ ماں کے ساتھ حسن سلوک اور ادب کا دامن کبھی نہ چھوڑے، کیونکہ والدین کی خدمت اور ان کی رضا اللہ کی رضا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ بیوی کے ساتھ بھی محبت اور عزت سے پیش آئے، کیونکہ ازدواجی زندگی کا حسن اسی میں ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا سکون بنیں۔ اگر کبھی کوئی اختلاف پیدا ہو بھی جائے، تو شوہر کو چاہیے کہ وہ کسی ایک طرف جھکنے کے بجائے صبر، نرمی اور حکمت کے ساتھ معاملہ سلجھائے۔

گھریلو مسائل کو حل کرنے کے لیے سب سے اہم چیز بات چیت اور باہمی اعتماد ہے۔ اگر ماں کو محسوس ہو کہ اس کا بیٹا اس سے بدظن نہیں ہوا، بلکہ اسے عزت اور محبت دی جا رہی ہے، تو وہ بہو کے خلاف شکوے شکایات نہیں کرے گی۔ اگر بیوی کو یہ اعتماد ہو کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ انصاف کرے گا اور ماں کی محبت کو اس کی ازدواجی زندگی پر مسلط نہیں کرے گا، تو وہ بھی سکون محسوس کرے گی۔

بعض اوقات اختلافات کی بنیاد غلط فہمیاں ہوتی ہیں، جنہیں دور کرنے کے لیے کھلے دل سے گفتگو ضروری ہے۔ اگر ماں اور بہو ایک دوسرے سے اپنے مسائل اور احساسات بانٹیں، اور اگر شوہر ان کے درمیان کسی بھی بدگمانی کو بڑھنے نہ دے، تو مسائل خود بخود ختم ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح، اگر کبھی تنازع پیدا ہو، تو شوہر کو چاہیے کہ وہ نرمی اور محبت کے ساتھ معاملہ سلجھائے، جذباتی ردعمل نہ دے، اور کسی کی دل آزاری نہ ہونے دے۔

گھر میں سکون اور محبت کا ماحول قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب ایک دوسرے کی عزت کریں، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں، اور چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظر انداز کریں۔ ایثار، درگزر اور مثبت رویہ ہی وہ اصول ہیں جو ان رشتوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ اگر ہر فریق اپنی جگہ پر اپنے فرائض ادا کرے، ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرے اور اللہ کی رضا کو مقدم رکھے، تو یہ رشتے کبھی کشیدگی کا شکار نہیں ہوں گے، بلکہ محبت، اعتماد اور سکون کے ساتھ آگے بڑھیں گے۔

رشتوں کی طاقت کا راز

انسانی زندگی میں خوبصورتی اور جسمانی کشش کا ایک مخصوص وقت ہوتا ہے، جو آہستہ آہستہ ماند پڑ جاتا ہے، لیکن وہ رشتے جو قربت، دوستی، خیال رکھنے اور باہمی اعتماد پر مبنی ہوتے ہیں، وقت کے ساتھ مزید گہرے اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اگر ابتدائے بلوغت ہی میں نوجوانوں کو یہ سمجھا دیا جائے کہ وقتی دلکشی اور ظاہری حسن کی کشش مستقل نہیں ہوتی، بلکہ اصل اہمیت اس قربت، محبت، اور ہم آہنگی کی ہے جو دو لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے، تو وہ زندگی کے بہتر فیصلے کر سکتے ہیں۔

جب ایک نوجوان اپنے ارد گرد دیکھتا ہے تو اسے فلموں، سوشل میڈیا اور معاشرتی روایات کے ذریعے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ خوبصورتی ہی سب کچھ ہے۔ مگر حقیقت اس سے کہیں مختلف ہے۔ فرض کریں کہ ایک نوجوان لڑکا کسی نہایت حسین لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے، مگر کچھ عرصے بعد وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں نہ تو گفتگو کا وہ حسن ہے جو اسے دیر تک محظوظ رکھ سکے، نہ ہی وہ ایک دوسرے کے خیالات اور احساسات کو سمجھنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ جب ابتدائی کشش ختم ہو جاتی ہے تو دونوں میں بے زاری آنا شروع ہو جاتی ہے، اور آخر کار یہ تعلق کمزور ہو کر بکھر جاتا ہے۔

اس کے بر عکس، اگر کوئی تعلق دوستی، اعتماد اور باہمی احترام پر قائم ہو تو وہ وقت کے ساتھ اور بھی مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جوڑا، جو شادی کے ابتدائی دنوں میں ایک دوسرے کی ظاہری خوبصورتی اور پر کشش شخصیت کی وجہ سے قریب آیا تھا، اگر ان کے درمیان صرف جسمانی کشش تھی تو کچھ ہی سالوں میں وہ ایک دوسرے سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگیں گے۔ لیکن اگر وہ ایک دوسرے کے بہترین دوست بن جاتے ہیں، ایک دوسرے کی پریشانیوں کو سمجھتے ہیں، مشکل وقت میں ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں، اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے ہیں، تو ان کا رشتہ بڑھاپے تک محبت اور قربت سے بھرا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض عمر رسیدہ جوڑے، جن کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہوتی ہیں اور جوانی کی تازگی ختم ہو چکی ہوتی ہے، پھر بھی ایک دوسرے کے ساتھ خوش اور مطمئن رہتے ہیں، کیونکہ ان کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم ہو چکا ہوتا ہے جو جسمانی حسن کا محتاج نہیں۔

یہی اصول دوستی میں بھی لاگو ہوتا ہے۔ وہ دوستیاں جو صرف وقت گزاری کے لیے قائم کی جاتی ہیں، جلد ہی ختم ہو جاتی ہیں، لیکن وہ دوستی جو اخلاص، بھروسے اور خیر خواہی پر مبنی ہو، وہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اگر نوجوانوں کو یہ سمجھا دیا جائے کہ کسی بھی رشتے کی اصل طاقت اعتماد، احساسِ ذمہ داری اور ایک دوسرے کے جذبات کی قدر میں پوشیدہ ہے، تو وہ اپنی زندگی میں زیادہ دیرپا اور خوشگوار تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔

زندگی کے نشیب و فراز میں، جب کوئی شخص بیماری، کمزوری، یا کسی مشکل وقت سے گزرتا ہے، تب ظاہری حسن کسی کام کا نہیں رہتا، بلکہ وہی لوگ ساتھ کھڑے ہوتے ہیں جن کے ساتھ حقیقی قربت، محبت اور دوستی کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ ہمیں حقیقی زندگی میں اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک نوجوان جب اپنے والدین کو دیکھتا ہے تو شاید وہ ان کی ظاہری عمر رسیدگی کو محسوس کرتا ہو، مگر جیسے جیسے وہ زندگی میں تجربہ حاصل کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ ان کی محبت، قربت، اور دعاؤں کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اسی طرح ایک اچھا رشتہ وہی ہوتا ہے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ قربت اور دوستی میں اضافہ ہو، نہ کہ صرف وقتی دلکشی پر انحصار کیا جائے۔

اگر نوجوانوں کی تربیت اس بنیاد پر کی جائے کہ خوبصورتی اور جسمانی کشش وقت کے ساتھ ماند پڑ جاتی ہے، مگر حقیقی محبت، دوستی، احساس اور بھروسہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیشہ باقی رہتی ہیں، تو وہ زندگی کے بہتر فیصلے کر سکیں گے۔ وہ نہ صرف اپنے لیے موزوں ساتھی کا انتخاب کر سکیں گے بلکہ ہر رشتے میں ان قدروں کو فوقیت دیں گے جو دیرپا اور مضبوط ہوتی ہیں۔ یہی شعور انہیں وقتی جذبات سے نکل کر حقیقی خوشی اور اطمینان کی طرف لے جائے گا، جہاں رشتے وقت کے ساتھ کمزور ہونے کے بجائے مزید مستحکم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مکتبِ محمد و آلِ محمد (علیہم السلام) میں رشتوں کی بنیاد محبت، دوستی، اعتماد اور باہمی احترام پر رکھی گئی ہے۔ اس حوالے سے کئی احادیث اور روایات ہمیں ملتی ہیں جو یہ واضح کرتی ہیں کہ

ایک تعلق کی اصل بنیاد جسمانی حسن یا وقتی کشش نہیں، بلکہ اخلاص، قربت اور حسنِ سلوک پر ہونی چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے محبت کرے تو اسے بتا دے، کیونکہ یہ باہمی تعلقات کو بہتر بناتا ہے اور محبت کو مضبوط کرتا ہے۔ اس فرمان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ محبت اور دوستی محض ایک جذباتی یا وقتی تعلق نہیں بلکہ اسے سچائی اور اخلاص کے ساتھ مضبوط کرنا ضروری ہے تاکہ وہ دیرپا رہے۔ اسی حقیقت کی طرف امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے بھی اشارہ فرمایا جب انہوں نے کہا کہ عورت کے حسن کو مت دیکھو، بلکہ اس کی وفاداری کو دیکھو۔ ان کا یہ فرمان اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ حقیقی رشتہ صرف خوبصورتی کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتا بلکہ اس میں وفاداری، محبت اور اعتماد جیسے عوامل زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی شادی کا ارادہ کرے تو دیکھے کہ وہ اپنی محبت کہاں رکھ رہا ہے، کیونکہ اسی کے ساتھ اسے ہمیشہ رہنا ہے۔ یہ قول ایک انتہائی اہم اصول کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ تعلقات کی اصل بنیاد جسمانی کشش نہیں بلکہ اخلاقی ہم آہنگی اور سچی محبت ہونی چاہیے تاکہ وہ تعلق وقت کے ساتھ مضبوط ہوتا چلا جائے۔ اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سب سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے لیے سب سے بہتر ہو اور میں اپنے اہل کے لیے سب

سے بہتر ہوں۔ اس حدیث میں واضح طور پر یہ سبق دیا گیا ہے کہ ایک پائیدار رشتہ محض ظاہری دلکشی پر نہیں بلکہ حسنِ سلوک، محبت اور خیر خواہی پر قائم ہوتا ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا کہ حقیقی محبت وہ ہے جو اللہ کے لیے ہو اور اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ اس فرمان کی روشنی میں ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ رشتے جو خالص محبت اور اللہ کی رضا کے لیے قائم کیے جاتے ہیں، وہی مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ یہی وہ اصول ہیں جو ہمیں اہلِ بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں ملتے ہیں اور ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ رشتے وقتی جذبات یا ظاہری کشش پر قائم نہیں ہونے چاہئیں بلکہ اعتماد، محبت، وفاداری اور قربت جیسے اعلیٰ اقدار پر مبنی ہونے چاہئیں تاکہ وہ وقت کے ساتھ کمزور ہونے کے بجائے مزید مضبوط ہوتے چلے جائیں۔

زندگی کی تعمیر حکمت و دانش کے ہمراہ

زندگی میں بہتری کا راستہ ہمیشہ خود کو سمجھنے، اپنی کمزوریوں کو قبول کرنے اور آگے بڑھنے کے لیے عملی اقدامات کرنے سے شروع ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اپنی سوچوں میں الجھ کر خود کو ایک ایسے جال میں قید کر لیتے ہیں جہاں خوف، پچھتاوا اور بے یقینی ان کے ہر فیصلے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے" :اور جب تم کسی کام کا عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو، بے شک اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔")آل عمران:159(یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ سوچنے کے بعد عمل کرنا ضروری ہے، کیونکہ محض سوچنا ہمیں کہیں نہیں لے جاتا، جبکہ عمل انسان کی تقدیر بدل سکتا ہے۔

غلطیاں انسانی فطرت کا حصہ ہیں، لیکن جو لوگ اپنی غلطیوں سے سیکھ کر آگے بڑھتے ہیں، وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ امام علیؑ فرماتے ہیں" : عقلمند وہی ہے جو اپنی غلطیوں سے سیکھے۔ "اگر انسان اپنی کوتاہیوں کو سمجھ کر ان کی اصلاح کرے، تو وہ نہ صرف اپنی زندگی میں بہتری لا سکتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک مثال بن سکتا ہے۔ خود کو بار بار ملامت کرنے کے بجائے غلطیوں سے سیکھنا اور اپنی اصلاح کرنا ہی اصل دانشمندی ہے۔

کبھی کبھار ہم زندگی میں ہر چیز کو مکمل کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ معاملات ہمارے اختیار میں نہیں ہوتے۔ انہیں اللہ کے سپرد کر دینا ہی حقیقی

سکون کا باعث بنتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" :جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، اللہ اسے کافی ہو جاتا ہے۔ " بے جا فکریں اور اندیشے انسان کے ذہن اور روح کو بوجھل کر دیتے ہیں، جبکہ سکون انہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو اپنے حصے کی محنت کر کے باقی معاملات کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔

زندگی میں ہمیں ہمیشہ دوسروں کے رویے کا سامنا رہتا ہے، اور ہر شخص ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا۔ لیکن اگر کوئی ہمیں برا سلوک دکھائے اور ہم اس کا جواب اچھائی سے دیں، تو یہی اخلاقی برتری کی نشانی ہے۔ امام حسنؑ فرماتے ہیں" :لوگوں میں سب سے بہترین وہ ہے جو برائی کا جواب بھلائی سے دے۔ "نرمی اور بردباری وہ اوصاف ہیں جو ایک انسان کے کردار کو مضبوط اور اس کے مقام کو بلند کر دیتے ہیں۔

جب بھی زندگی میں دو راستے سامنے آئیں، تو اکثر وہ راستہ جس میں زیادہ چیلنج ہو، وہی زیادہ ترقی کا ذریعہ بنتا ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں" :مشکل راستے ہمیشہ تمہیں مضبوطی عطا کرتے ہیں۔ "جو لوگ آسان راستے کی تلاش میں رہتے ہیں، وہ ترقی کے مواقع کھو دیتے ہیں، جبکہ جو لوگ خوف پر قابو پا کر مشکل راستے اپناتے ہیں، وہی کامیاب ہوتے ہیں۔

نیا کام کرتے وقت جوش و خروش اور اخلاص کے ساتھ اس میں داخل ہونا کامیابی کی ضمانت ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے" :اور کہو کہ میرا عمل اللہ کے لیے ہے، اور میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔) "الأنعام:162) جو لوگ کسی بھی کام کو وقتی

شوق کے بجائے مستقل مزاجی اور ایمانداری کے ساتھ کرتے ہیں، وہی دیرپا کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

کبھی کبھار ہمیں لگتا ہے کہ دوسروں کی زندگی ہم سے بہتر ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہمیں اسی جگہ پر محنت کرنی ہوگی جہاں ہم کھڑے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" :سب سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنی محنت کے ذریعے اپنی حالت کو بہتر بنائے۔ "جو لوگ صرف دوسروں کی کامیابیوں کو دیکھ کر حسرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ اپنی نعمتوں کی قدر نہیں کر پاتے۔ اپنی صلاحیتوں کو نکھارنا، موجودہ حالات کو بہتر بنانا اور محنت کے ساتھ آگے بڑھنا ہی حقیقی کامیابی کی نشانی ہے۔

زندگی کی تعمیر صبر، حکمت اور مسلسل سیکھنے کے عمل سے ممکن ہے۔ ہر دن ایک نیا موقع ہے کہ ہم خود کو بہتر بنائیں، اپنی غلطیوں سے سیکھیں، اپنی کمزوریوں پر قابو پائیں، اور آگے بڑھنے کے لیے اپنے خوف کو شکست دیں۔ جو شخص اپنے خیالات، جذبات اور اعمال کو سمجھ کر ان پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، وہی حقیقی کامیابی حاصل کرتا ہے۔

زندگی کی تعمیر مسلسل سیکھنے، صبر اور عمل کے امتزاج سے ممکن ہوتی ہے۔ ہر دن ایک نئے امتحان کے ساتھ طلوع ہوتا ہے، اور اس میں کامیاب وہی ہوتا ہے جو اپنے اندر تحمل، بردباری اور حکمت کو جگہ دیتا ہے۔ وقت کے گزرنے کا احساس ہمیشہ بعد میں ہوتا ہے، لیکن دانشمند وہ ہے جو لمحوں کی قدر کرتے ہوئے اپنی زندگی کو بامقصد بنائے۔ حضرت علیؑ فرماتے

ہیں" :زندگی کے دن تیرے جسم کے صفحات ہیں،جودن گزر گیاوہ تیری زندگی کا ایک ورق ختم ہو گیا۔ "جو لوگ اپنی جوانی کو بے مقصد کاموں میں ضائع کر دیتے ہیں، وہ بڑھاپے میں اس محرومی کا احساس کرتے ہیں، لیکن تب وقت واپس نہیں آتا۔

دنیاوی معاملات میں بہتری لانے کے لیے جسم اور روح دونوں کا توازن ضروری ہے۔ جو لوگ اپنے جسم کی دیکھ بھال نہیں کرتے، وہ بعد میں صحت کے سنگین مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" : صحت اور فرصت دوایسی نعمتیں ہیں جن کی انسان قدر نہیں کرتا جب تک وہ ان سے محروم نہ ہو جائے۔ "اگر ہم اپنے کھانے پینے، نیند اور جسمانی سرگرمیوں پر توجہ نہیں دیتے تو وقت کے ساتھ ہمارا جسم کمزور ہونے لگتا ہے اور یہ کمزوری ہمارے حوصلے اور ارادوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کی تربیت بھی ضروری ہے، کیونکہ جو دل اللہ کی یاد سے غافل ہو جائے، وہ دنیا کی پریشانیوں میں گھرا رہتا ہے۔

کامیاب زندگی صرف ظاہری کامیابیوں کا نام نہیں، بلکہ وہ تعلقات اور احساسات زیادہ معنی رکھتے ہیں جو ہمیں دوسروں کے قریب لاتے ہیں۔ لوگ کسی کی دولت یا شہرت کو نہیں یاد رکھتے بلکہ وہ محبت، اخلاص اور حسن سلوک کو یاد رکھتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" : تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اخلاق میں سب سے بہتر ہو۔ "ہم دنیا میں کئی طرح کے مشاغل اور مصروفیات میں مگن رہتے ہیں، لیکن جو وقت ہم اپنے پیاروں کے ساتھ گزارتے ہیں، وہی اصل خوشی کا باعث بنتا ہے۔

انسان کا مزاج اور سوچ اس کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ جو شخص ہر بات میں منفی پہلو دیکھتا ہے، وہ ہمیشہ بے سکون رہتا ہے، اور جو شخص مثبت پہلو تلاش کرتا ہے، وہ مشکلات میں بھی امید کی روشنی پاتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں" : مومن کا دل امید اور خوف کے درمیان ہوتا ہے۔ "یعنی وہ نہ تو مشکلات سے گھبرا کر ہمت ہارتا ہے اور نہ ہی اتنا بے فکر ہوتا ہے کہ کوشش کرنا چھوڑ دے۔

زندگی میں بعض اوقات خاموشی بہترین جواب ہوتی ہے۔ جو لوگ آپ کی قدر نہیں کرتے، ان کے لیے خود کو وضاحتیں دینا بے معنی ہوتا ہے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں" : عقل مند کی خاموشی بہترین جواب ہے۔ "بعض معاملات میں خاموش رہنا انسان کے وقار میں اضافہ کرتا ہے اور بعض اوقات خاموشی سے دی گئی سزا الفاظ سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔ مگر ساتھ ہی، خاموشی ہمیشہ بہتر حل نہیں ہوتی۔ کچھ مواقع پر اپنی بات کہہ دینا ضروری ہوتا ہے تاکہ دوسروں کو ہمارے احساسات اور خیالات کا علم ہو۔

انسانی تعلقات میں وفاداری ایک بنیادی جزو ہے۔ لیکن اس وفاداری کو جذباتی بے وقوفی میں نہیں بدلنا چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" : جب تمہیں کسی کے ساتھ تعلق میں نقصان پہنچنے لگے، تو وہاں حکمت کے ساتھ فیصلہ کرو۔ "بعض رشتے اور تعلقات ہمارے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں، اور انہیں ختم کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر فیصلہ کرتے وقت جذبات کی بجائے عقل سے کام لینا ضروری ہے۔

ہر فرد کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے خلاف ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مشکل وقت ہی ہمیں مضبوط اور کامیاب بنانے کے لیے آتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" :بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔) "سورہ الانشراح:6) جو لوگ مشکل وقت میں بھی صبر اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، وہی زندگی میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

زندگی کی خوبصورتی اس بات میں ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کو پہچانیں اور ان کا بہترین استعمال کریں۔ ہر شخص کے پاس کوئی نہ کوئی خاص خوبی ہوتی ہے، اور جب انسان اپنے مقصد کو سمجھ لیتا ہے، تو وہ ناقابلِ شکست بن جاتا ہے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں" :جو شخص اپنی قیمت پہچان لے، وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا۔ "جب ہمیں اپنی صلاحیتوں اور مقصد کا ادراک ہو جائے، تو ہمیں دنیا کی کسی رائے کی پرواہ نہیں رہتی۔

زندگی میں ناکامیاں بھی ایک حقیقت ہیں، لیکن ان سے سیکھنا ضروری ہے۔ جو لوگ ناکامیوں کو قبول کرکے ان سے سبق لیتے ہیں، وہی ترقی کرتے ہیں۔ جو لوگ صرف ماضی کے پچھتاوے میں رہتے ہیں، وہ حال اور مستقبل کو ضائع کر دیتے ہیں۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں" : گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا، مگر آنے والا وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ "اگر ہم ماضی کی ناکامیوں سے سیکھ کر آگے بڑھیں، تو ہر دن ہمارے لیے کامیابی کا نیا دروازہ کھول سکتا ہے۔

زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے، اور اسے صحیح طریقے سے گزارنا ہی اصل دانشمندی ہے۔ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنی توانائی اور وقت کو صحیح سمت میں استعمال کرتے ہیں، اپنی ذات کو مسلسل بہتر بناتے ہیں، اور اللہ پر بھروسہ رکھ کر ہر چیلنج کا سامنا کرتے ہیں۔

سادگی ایمان کی علامت ہے

انسان کی قدر و قیمت اس کے اخلاق، کردار، اور علم سے پہچانی جاتی ہے، نہ کہ اس کی ظاہری صورت، مال و دولت، یا لباس سے۔ دنیا کی فانی چمک دمک اور سماجی معیار بعض اوقات انسان کو ایسی سوچ کی طرف مائل کر دیتے ہیں جہاں وہ اپنے حقیقی جوہر کو بھلا کر ظاہری چیزوں کو اپنی عزت و وقار کا معیار بنالیتا ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جسے مکتب محمد و آل محمدؐ کی تعلیمات نے ہمیشہ رد کیا ہے اور ہمیں وہ اصول دیے ہیں جو حقیقی کامیابی اور عزت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

پرانے کپڑوں کو پہننا کوئی عیب نہیں، کیونکہ لباس انسان کے کردار کا پیمانہ نہیں ہوتا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیتؑ سادہ لباس پہنتے تھے اور سادگی کو فخر سمجھتے تھے۔ حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ لباس کی قیمت نہیں، بلکہ لباس پہننے والے کی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ انسان کی اصل پہچان اس کے تقویٰ، علم، اور عمل سے ہوتی ہے، نہ کہ اس کے ملبوسات سے۔ جب ایک شخص اپنے لباس کی سادگی پر شرمندہ نہیں ہوتا اور اسے عزت و وقار کے ساتھ زیب تن کرتا ہے، تو وہ معاشرتی دباؤ سے آزاد ہو کر حقیقی کامیابی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

والدین کا بڑھاپا وہ نعمت ہے جسے اکثر لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہم ہیں، وہ ہمارے والدین کی دعاؤں، قربانیوں، اور محنت کا نتیجہ ہے۔ جب وہ کمزور ہو جاتے ہیں، تو یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ان کی خدمت کریں اور انہیں عزت دیں۔ قرآن مجید میں واضح حکم ہے کہ والدین کے ساتھ نرمی اور ادب کا برتاؤ کرو اور انہیں کبھی بھی جھڑکنا یا تکلیف دینا جائز نہیں۔ حضرت امام زین العابدینؑ کے حقوق العباد میں والدین کے حقوق پر جو تفصیل موجود ہے، وہ ہمیں بتاتی ہے کہ والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک دین کا ایک لازمی حصہ ہے۔ جو شخص اپنے والدین کو بوجھ سمجھنے لگے، وہ درحقیقت اپنی کامیابی کے دروازے خود بند کر لیتا ہے، کیونکہ والدین کی رضا ہی اللہ کی رضا کا ذریعہ ہے۔

سادہ زندگی اختیار کرنا دراصل وہ حقیقت ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا سبب بنتی ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ اپنی ظاہری حالت کو بنا سنوار کر دوسروں پر اپنی برتری ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن دینِ اسلام کی تعلیمات کے مطابق حقیقی عزت اور کامیابی دولت میں نہیں، بلکہ سادگی اور قناعت میں ہے۔ رسول اکرمؐ کی زندگی کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا طرزِ زندگی سادہ تھا، آپؐ دنیاوی عیش و عشرت سے دور رہے، اور آپؐ نے ہمیں سکھایا کہ کامیابی کی بنیاد اخلاص، محنت، اور اللہ پر توکل میں ہے، نہ کہ ظاہری شان و شوکت میں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ سادگی ایمان کا زیور ہے، اور جو اس زیور کو اپناتا ہے، وہ ہمیشہ عزت دار اور مطمئن رہتا ہے۔

دوستی وہ رشتہ ہے جو اخلاص اور نیک نیتی پر قائم ہونا چاہیے، نہ کہ مال و دولت پر۔ دنیا میں بہت سے لوگ دوستی میں معیار اور مرتبے کو دیکھتے ہیں، لیکن مکتب اہل بیتؑ ہمیں سکھاتا ہے کہ دوست کا انتخاب کردار، امانت داری، اور دیانت کو دیکھ کر کیا جانا چاہیے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ دوست وہ ہوتا ہے جو مشکل وقت میں ساتھ کھڑا ہو، نہ کہ وہ جو صرف خوشحالی کے دنوں میں موجود ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے غریب دوستوں پر شرمندگی محسوس کرے یا انہیں کمتر سمجھے، تو وہ دراصل اپنی اخلاقی کمزوری کا شکار ہے۔ حقیقی دوستی میں دولت، سماجی حیثیت، یا دنیاوی رتبہ کوئی معنی نہیں رکھتا، بلکہ دوستی وہ نعمت ہے جو باہمی محبت، اخلاص، اور نیکی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔

یہ تمام اصول ہمیں اس حقیقت سے روشناس کراتے ہیں کہ عزت اور کامیابی کا معیار دنیاوی چیزیں نہیں، بلکہ تقویٰ، حسنِ اخلاق، اور دین کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہے۔ جو لوگ پرانے کپڑوں کو پہننے میں شرمندہ نہیں ہوتے، جو اپنے بوڑھے والدین کو بوجھ نہیں سمجھتے، جو سادہ زندگی کو عزت کے ساتھ اپناتے ہیں، اور جو دوستی میں دولت کو معیار نہیں بناتے، وہی درحقیقت دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مکتب محمد و آل محمدؐ کی تعلیمات ہمیں ان اصولوں کو اپنانے کی دعوت دیتی ہیں تاکہ ہم اپنی زندگی کو حقیقی کامیابی اور عزت کے راستے پر گامزن کر سکیں۔

انسان کی عزت و وقار اس کے ایمان، تقویٰ، اور حسنِ اخلاق میں پنہاں ہے، نہ کہ اس کے مال و دولت میں۔ اسلام کی تعلیمات ہمیں سکھاتی ہیں کہ عزت کا اصل معیار دنیاوی وسائل

نہیں، بلکہ انسان کی اندرونی خوبیاں اور اس کا تعلق خدا سے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام نے ہمیشہ ان اقدار کو اجاگر کیا جو انسانی عظمت کی بنیاد بنتی ہیں اور ہمیں اس بات سے خبردار کیا کہ دنیاوی دولت کو معیار بنا کر دوسروں کے سامنے جھکنا نہ صرف عزتِ نفس کے خلاف ہے بلکہ یہ دین کے زوال کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ "جو شخص کسی دولت مند کے سامنے اس کی دولت کی بنا پر جھکے، اس کا دو تہائی دین رخصت ہو جاتا ہے۔"

یہ حدیث ہمیں ایک بہت اہم حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ جب کوئی شخص محض دولت کی چمک دمک دیکھ کر کسی کے سامنے جھکنے لگتا ہے، تو وہ درحقیقت اپنی ایمانی قوت کو کمزور کر رہا ہوتا ہے۔ دولت کی بنیاد پر کسی کے آگے جھکنا اس بات کی علامت ہے کہ انسان کی نظر میں دین اور اخلاق کی قدر کم ہو گئی ہے اور وہ دنیاوی اسباب کو فوقیت دینے لگا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بارہا فرمایا ہے کہ دنیاوی مال و دولت محض ایک آزمائش ہے اور اصل کامیابی ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان، صبر، اور تقویٰ کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔ سورہ الحجرات میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے، نہ کہ وہ جو سب سے زیادہ مالدار ہے۔

تاریخ میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جہاں اہل بیت علیہم السلام نے اس اصول کو عملی طور پر واضح کیا۔ حضرت علیؑ کا طرزِ زندگی اس حدیث کی بہترین مثال ہے۔ آپ نے ہمیشہ دولت مندوں اور فقرا کے درمیان انصاف اور مساوات کو برقرار رکھا اور کبھی بھی

کسی دولت مند کے سامنے اس کے مال کی وجہ سے جھکنے کا تصور نہیں کیا۔ آپؑ فرماتے ہیں:
"دنیاوی مال کی محبت انسان کے دین کو کھوکھلا کر دیتی ہے اور اسے حقیقت سے اندھا کر دیتی ہے۔" اس فرمان سے واضح ہوتا ہے کہ اگر انسان اپنی عزت کو مالداروں کی خوشنودی کے لیے قربان کر دے، تو وہ درحقیقت اپنے دین کی روح کو نقصان پہنچا رہا ہوتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ دولت خود برا نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ انسان کا رویہ اور اس کی ترجیحات اہم ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی دولت مند سے تعلقات رکھتا ہے لیکن اس کا مقصد انصاف، سماجی بھلائی، یا دین کی ترویج ہو، تو یہ چیز ممدوح ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی محض دولت کی بنا پر کسی کے سامنے جھکے، اس کے اثر ورسوخ سے مرعوب ہو، یا اسے غیر ضروری تعظیم دے، تو یہ اس کے ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایات میں دنیا کے فریبی چمک دمک سے دھوکہ نہ کھانے کی تاکید کی گئی ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:
"دنیا کا مال وزر محض ایک آزمائش ہے، جو اس میں فخر کرے وہ خسارے میں ہے اور جو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ کامیاب ہے۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ مادی دنیا میں اکثر لوگ اپنی عزت نفس کو پس پشت ڈال کر دولت مندوں کی چمک دمک سے متاثر ہو جاتے ہیں اور انہیں غیر ضروری اہمیت دینے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی حقیقت کو بھول کر ایک ایسی دنیا کی طرف مائل ہو جاتے ہیں جو محض عارضی اور فانی ہے۔ اس کے برعکس، جو لوگ اپنی عزت کو دین اور ایمان کی بنیاد پر قائم رکھتے ہیں، وہ حقیقی کامیابی کی طرف بڑھتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کی سیرت میں ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ

عزت اللہ کی عطا کردہ ہے اور اسے دنیاوی مال و دولت سے مشروط نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے ہمیشہ مظلوموں، فقیروں، اور سادہ زندگی گزارنے والوں کو عزت دی اور ان کے ساتھ محبت اور احترام کا رویہ رکھا، جبکہ ظاہری دولت پر فخر کرنے والوں کو تنبیہ کی۔

یہ حدیث (جو شخص کسی دولت مند کے سامنے اس کی دولت کی بنا پر جھکے، اس کا دو تہائی دین رخصت ہو جاتا ہے) ہمیں ایک عملی سبق دیتی ہے کہ ہمیں اپنی عزت و وقار کو کسی بھی دنیاوی معیار کے مطابق نہیں بلکہ اللہ کے احکام اور دین کی تعلیمات کے مطابق پرکھنا چاہیے۔ جو شخص کسی مالدار کے سامنے جھکنے سے گریز کرتا ہے اور اپنی خودداری کو برقرار رکھتا ہے، وہی درحقیقت دین کے سچے اصولوں پر کاربند رہتا ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص اپنی شناخت اور دین کی قدروں کو چھوڑ کر محض دنیاوی طاقت کے سامنے جھک جائے، وہ رفتہ رفتہ اپنی ایمانی طاقت کھو بیٹھتا ہے اور دین کی اصل روح سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایت میں اس کے دین کے دو تہائی حصے کے ضائع ہونے کی بات کی گئی ہے، کیونکہ وہ اللہ کے بجائے دنیاوی طاقتوں کو معیار بنا کر اپنی روحانی قوت کو ختم کر دیتا ہے۔

اگر ہم واقعی دین کی سربلندی چاہتے ہیں اور حقیقی عزت کے خواہاں ہیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی خودداری کو ہر حال میں محفوظ رکھیں اور دنیاوی مال و دولت کی چکاچوند سے متاثر نہ ہوں۔ کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ ہم اپنے دین اور ایمان کی قیمت پر کسی بھی دنیاوی طاقت

کے آگے نہ جھکیں، بلکہ عزت و وقار کو اس راستے پر رکھیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہمارے لیے پسند فرمایا ہے۔

ڈیپ اسٹیٹ، کثیر الجہتی تفرقہ اور استعمار

پاکستان جیسے ملک میں، جہاں ڈیپ اسٹیٹ کا ایک پیچیدہ نظام موجود ہے، وہاں وڈیرے، جاگیر دار، چودھری اور سردار ایک خاص سماجی اور سیاسی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخی طور پر یہ طبقات برطانوی دور سے ہی طاقت کے ڈھانچے کا حصہ رہے ہیں، اور آزادی کے بعد بھی ان کا اثر ورسوخ برقرار رہا۔

یہ افراد مقامی سیاست، زمینوں کی ملکیت، اور برادری کے نظام پر گرفت رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے انہیں عوام پر ایک غیر رسمی کنٹرول حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ ڈیپ اسٹیٹ میں اصل طاقت عسکری اور بیوروکریٹک اداروں کے پاس ہوتی ہے، لیکن یہ جاگیردار اور سردار سیاسی جماعتوں کے ذریعے ان اداروں کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت اکثر پاور بروکرز کی ہوتی ہے، جو انتخابات میں اپنی برادریوں کے ووٹ بینک کو استعمال کر کے قومی اور صوبائی سیاست میں اپنا اثر ڈالتے ہیں۔

جاگیردارانہ نظام کے باعث ان کا اختیار دیہی علاقوں میں زیادہ مضبوط ہے، جہاں وہ قانون، انصاف اور وسائل کی تقسیم پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا کردار ریاستی اسٹیبلشمنٹ کے لیے مفید ہوتا ہے کیونکہ وہ مقامی سطح پر استحکام قائم رکھنے میں مدد

دیتے ہیں۔ تاہم، جب ان کے مفادات ریاستی پالیسیوں سے متصادم ہوتے ہیں تو بعض جاگیرداروں اور وڈیروں کو کمزور کرنے یا ان کی طاقت محدود کرنے کی کوششیں بھی کی جاتی ہیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ کچھ جاگیردار اور وڈیرے خود ڈیپ اسٹیٹ کا حصہ بن گئے ہیں، جبکہ کچھ دوسرے اپنی روایتی حیثیت کھو رہے ہیں، خاص طور پر شہری سیاست اور جدید سیاسی حرکیات کے سبب۔ اس کے باوجود، مجموعی طور پر ان طبقات کی حیثیت آج بھی پاکستانی سیاست اور سماجی ڈھانچے میں اہم اور اثر انگیز ہے۔

استعماری طاقتیں ہمیشہ ان خطوں میں خصوصی دلچسپی لیتی ہیں جہاں قدرتی وسائل وافر مقدار میں موجود ہوں اور مقامی سطح پر طاقت چند جاگیرداروں، وڈیروں، سرداروں یا بااثر خاندانوں کے ہاتھ میں ہو۔ پاکستان جیسے ملک میں، جہاں بعض علاقوں میں ایسے بااثر طبقات کی مضبوط رٹ ہوتی ہے، وہاں استعماری قوتیں اپنے اقتصادی مفادات کے لیے ان طبقات اور ریاستی اسٹیبلشمنٹ کے درمیان ایک توازن قائم رکھتی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جاسکے۔

یہ قوتیں سب سے پہلے مقامی وڈیروں اور سرداروں کے ساتھ ایسے معاہدے کرتی ہیں جن سے ان کی طاقت مستحکم رہے، جیسے ترقیاتی منصوبوں کے نام پر انہیں مالی فوائد، مراعات یا دیگر سیاسی فائدے دیے جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں، یہ بااثر طبقات اپنی برادری یا علاقے

میں استعماری طاقتوں کے مفادات کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دیتے اور اکثر مزاحمت کو دبانے میں بھی کردار ادا کرتے ہیں۔

دوسری جانب، استعماری طاقتیں اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی کے اندر ایسے افراد کو سپورٹ کرتی ہیں جو ان کے منصوبوں کو آسانی سے عملی جامہ پہنا سکیں۔ بیوروکریسی میں ان کے مفاد کے حامل افراد پالیسی سازی میں مدد دیتے ہیں، قانونی رکاوٹیں ہٹانے میں سہولت فراہم کرتے ہیں، اور ان اقتصادی معاہدوں کو یقینی بناتے ہیں جو استعماری قوتوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اگر کسی موقع پر مقامی سردار یا وڈیرے ان پالیسیوں کے خلاف کھڑے ہونے کی کوشش کریں تو استعماری طاقتیں اسٹیبلشمنٹ کے ذریعے ان پر دباؤ ڈالتی ہیں، اور اگر ضرورت پڑے تو انہیں کمزور کرنے کے لیے متبادل قیادت کو فروغ دیتی ہیں۔

اس پورے کھیل میں عام عوام سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو ان وسائل سے براہ راست کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ ان کے علاقے استحصالی پالیسیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ قدرتی وسائل کے نام پر ان کی زمینیں ہتھیالی جاتی ہیں، ماحولیات کو نقصان پہنچایا جاتا ہے، اور اگر وہ آواز اٹھائیں تو یا تو مقامی بااثر طبقات انہیں دبا دیتے ہیں یا پھر ریاستی مشینری کے ذریعے ان پر سختی کی جاتی ہے۔ اس طرح، استعماری قوتیں نہ صرف اقتصادی مفاد حاصل کرتی ہیں بلکہ مقامی طاقتوں کو استعمال کر کے اپنی گرفت مزید مضبوط کر لیتی ہیں، جبکہ عوام بے بسی کا شکار رہتے ہیں۔

استعماری طاقتیں ہمیشہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی کو اپنے اقتصادی مفادات کے لیے ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی رہی ہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں، جہاں وڈیرے، جاگیردار، سردار، اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی مقامی سطح پر طاقتور حیثیت رکھتے ہیں، وہاں یہ قوتیں بڑی چالاکی سے ان ہی عناصر کو اپنی حکمت عملی کے تحت استعمال کرتی ہیں تاکہ بغیر کسی نمایاں مزاحمت کے اپنے اہداف حاصل کیے جا سکیں۔

مذہب کے میدان میں، فرقہ وارانہ تقسیم کو ہوا دی جاتی ہے تاکہ عوام ایک دوسرے کے خلاف مصروف رہیں اور اصل مسائل کی طرف توجہ نہ جا سکے۔ مخصوص گروہوں کو مالی و سیاسی مدد دے کر انہیں مضبوط کیا جاتا ہے، جبکہ بعض دیگر کو پس پشت ڈال کر ایک مستقل کشمکش کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ اس دوران، وڈیرے اور سردار مقامی سطح پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے اس تقسیم کو مزید تقویت دیتے ہیں، اور اسٹیبلشمنٹ ان گروہوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کے نام پر ایسی پالیسیاں اپناتی ہے جو درحقیقت استعماری مفادات کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں۔

سیاسی میدان میں، استعماری طاقتیں ہمیشہ ایسے رہنماؤں اور گروہوں کو پروان چڑھاتی ہیں جو وقتی طور پر ان کے مفادات کے لیے موزوں ہوں۔ سیاست دانوں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر کے انہیں کمزور کیا جاتا ہے تاکہ کوئی ایک جماعت یا شخصیت اتنی طاقتور نہ ہو کہ وہ قومی سطح پر آزادانہ فیصلے کر سکے۔ وڈیروں اور جاگیرداروں کے ذریعے مقامی سیاست کو

قابو میں رکھا جاتا ہے، جبکہ بیوروکریسی کو اس بات پر مامور کیا جاتا ہے کہ وہ ہر ایسی پالیسی کو نافذ کرے جو استعماری مفادات کو تحفظ فراہم کرے۔

ثقافت اور تہذیب کے حوالے سے، روایتی اقدار کو کمزور کیا جاتا ہے اور مغربی نظریات کو فروغ دیا جاتا ہے تاکہ مقامی شناخت کمزور پڑ جائے۔ وڈیروں اور جاگیرداروں کو اس معاملے میں سہولت دی جاتی ہے کیونکہ وہ پہلے ہی مقامی ثقافت پر اپنی گرفت مضبوط رکھے ہوئے ہوتے ہیں، اور استعماری طاقتوں کے ساتھ جُڑ کر انہیں مزید مواقع ملتے ہیں کہ وہ اپنی برتری قائم رکھ سکیں۔ دوسری طرف، اسٹیبلشمنٹ ایسی تعلیمی اور میڈیا پالیسیوں کی سرپرستی کرتی ہے جو عوام کی فکری سمت کو غیر محسوس انداز میں استعماری ایجنڈے کی طرف موڑ دیں۔

زبان کے معاملے میں بھی استعماری حکمت عملی واضح نظر آتی ہے۔ قومی سطح پر ایسے لسانی تنازعات پیدا کیے جاتے ہیں جو مختلف قومیتوں اور گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیں۔ ایک مخصوص زبان کو فروغ دے کر باقی زبانوں کو کمزور کیا جاتا ہے تاکہ مختلف قومیتوں میں احساسِ محرومی بڑھے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ اس عمل میں بیوروکریسی اور تعلیمی پالیسیوں کے ذریعے غیر محسوس انداز میں ایسی تبدیلیاں کی جاتی ہیں جو اس تقسیم کو مزید گہرا کرتی ہیں۔

قومیتوں کے حوالے سے، استعماری طاقتیں ہمیشہ ان عناصر کی پشت پناہی کرتی ہیں جو علیحدگی پسندی کو ہوا دیتے ہیں، تاکہ ریاست مستقل داخلی مسائل میں الجھی رہے اور

اسٹیبلشمنٹ کو بار بار ایسے فیصلے لینے پڑیں جو استعماری مفادات کے لیے سازگار ہوں۔ بعض قوم پرست رہنماؤں کو پس پردہ مدد دے کر ان کے مطالبات کو شدت دی جاتی ہے، جبکہ دوسری طرف انہی گروہوں کو وڈیروں، جاگیرداروں یا ریاستی اداروں کے ذریعے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ داخلی کشیدگی برقرار رہے اور اصل مسائل کی طرف توجہ نہ دی جا سکے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک اندرونی طور پر تقسیم کا شکار رہتا ہے، مقامی طاقتیں استعماری پالیسیوں کے تحت ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی ہیں، اور استعماری قوتیں آسانی سے اپنے اقتصادی مفادات حاصل کر لیتی ہیں۔ یوں نہ کوئی بڑی بغاوت اٹھتی ہے، نہ کوئی عوامی تحریک مضبوط ہو پاتی ہے، اور استعماری مفادات کا کھیل بغیر کسی نمایاں رکاوٹ کے جاری رہتا ہے۔ اس پوری حکمت عملی میں وڈیروں، جاگیرداروں، سرداروں، اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی کو اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، بلکہ استعماری طاقتوں کو بغیر کسی بڑی سرمایہ کاری کے رنگ چوکھا نظر آتا رہے۔

اقوام متحدہ اور دیگر عالمی ادارے اور استعماری مفادات

اقوام متحدہ اور اس جیسے دیگر عالمی ادارے بظاہر دنیا میں امن، ترقی، انسانی حقوق اور عالمی تعاون کے فروغ کے لیے قائم کیے گئے ہیں، لیکن اگر ان کے طرزِ عمل، پالیسیوں اور فیصلوں کا باریک بینی سے تجزیہ کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ادارے زیادہ تر استعماری طاقتوں کے مفادات کی تکمیل کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کے بنیادی ڈھانچے، مالی معاونت اور فیصلہ سازی کے طریقہ کار میں وہی اقوام غالب نظر آتی ہیں جو دنیا پر اپنی سیاسی، اقتصادی اور فوجی برتری برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔

اقوام متحدہ کے قیام کو اگر ایک تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد معرضِ وجود میں آیا، اور اس کا مقصد بظاہر دنیا میں جنگوں کو روکنا اور قوموں کے درمیان امن قائم رکھنا تھا۔ لیکن اس کی حقیقی کارکردگی اس کے برعکس رہی ہے۔ طاقتور ممالک، خاص طور پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے مستقل اراکین، اس ادارے کو اپنے سیاسی اور عسکری عزائم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ سلامتی کونسل میں ویٹو پاور رکھنے والی اقوام جیسے امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین اپنے مفادات کے مطابق فیصلے کرواتے ہیں اور جب بھی کوئی قرارداد یا اقدام ان کے استعماری منصوبوں کے خلاف ہو، وہ اسے ویٹو کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فلسطین، کشمیر، یمن، اور دیگر تنازعات میں اقوام متحدہ کا

کردار محض بیانات اور غیر مؤثر قرار دادوں تک محدود رہا ہے، کیونکہ یہاں طاقتور ممالک کے مفادات داؤ پر لگے ہوتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے مختلف ذیلی ادارے جیسے عالمی بینک، آئی ایم ایف، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، اور عالمی صحت تنظیم بھی استعماری ایجنڈے کی تکمیل کے لیے کام کرتے ہیں۔ عالمی بینک اور آئی ایم ایف ترقی پذیر ممالک کو قرضے دیتے ہیں، مگر ان کی شرائط ایسی ہوتی ہیں کہ یہ ممالک ہمیشہ ان کے شکنجے میں جکڑے رہتے ہیں۔ ان مالیاتی اداروں کے ذریعے ترقی پذیر اقوام کو اقتصادی طور پر کمزور رکھا جاتا ہے اور انہیں ایسی پالیسیوں پر مجبور کیا جاتا ہے جو مغربی سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت دیں۔ یہ قرضے اکثر ایسے انفراسٹرکچر یا پالیسی ریفارمز کے لیے دیے جاتے ہیں جو ان ممالک کو مزید مغربی معیشتوں کا محتاج بنا دیتے ہیں اور ان کے قدرتی وسائل کو بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لیے آسان ہدف بنا دیتے ہیں۔

عالمی صحت تنظیم بھی بظاہر صحت کی بہتری کے لیے کام کرنے والا ادارہ ہے، مگر اس کے فیصلے اور پالیسیوں پر بڑی فارماسیوٹیکل کمپنیوں اور مغربی ممالک کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ کرونا وبا کے دوران یہ واضح ہوا کہ صحت کے نام پر بھی سرمایہ دارانہ مفادات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ویکسینز اور ادویات کی پالیسیوں میں غریب ممالک کو ہمیشہ پسِ پشت ڈالا گیا، جبکہ مغربی ممالک نے اپنی اجارہ داری برقرار رکھی۔ اسی طرح، زراعت اور خوراک سے متعلق ادارے بھی بڑے کارپوریشنز کے اثر میں کام کرتے ہیں اور ترقی پذیر ممالک میں

قدرتی زراعت کو ختم کرکے جینیاتی خوراک اور مغربی کمپنیوں کے بیج اور کھادوں پر انحصار بڑھانے کی پالیسی کو فروغ دیتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ادارے بھی اکثر مغربی ایجنڈے کی توسیع کا ذریعہ بنتے ہیں۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر ان اداروں کی کارروائیاں ہمیشہ انتخابی اور مخصوص ممالک کے خلاف ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ملک مغربی پالیسیوں سے روگردانی کرے تو اسے انسانی حقوق کے نام پر تنقید اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جبکہ امریکہ، اسرائیل، اور مغربی ممالک کی طرف سے کیے جانے والے سنگین جرائم کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ فلسطین میں اسرائیل کی جارحیت، عراق اور افغانستان میں امریکی مظالم، اور گوانتاناموبے جیسے عقوبت خانوں پر یہ ادارے خاموش نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر کسی غیر مغربی ملک میں معمولی واقعہ بھی ہو جائے تو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے نام پر اس پر دباؤ ڈالا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کے امن مشنز بھی استعماری طاقتوں کے آلہ کار کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ان امن مشنز کو زیادہ تر ان علاقوں میں تعینات کیا جاتا ہے جہاں مغربی مفادات کو تحفظ درکار ہو، جبکہ ایسے مقامات جہاں حقیقی بحران ہو، وہاں ان کی موجودگی کمزور یا غیر مؤثر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افریقہ، مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں کئی بحرانوں کے باوجود اقوام متحدہ کے مشنز محض علامتی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض اوقات ان کی موجودگی کے باوجود بدامنی جاری رہتی ہے۔

مغربی طاقتیں اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں کو اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ ادارے اکثر ایسے بیانیے کو فروغ دیتے ہیں جو مغربی نظامِ معیشت، جمہوریت اور عالمی نظام کو ایک "معیاری" ماڈل کے طور پر پیش کرے اور کسی بھی متبادل نظام یا خودمختار پالیسی کو غیر مؤثر بنائے۔ میڈیا، تعلیمی ادارے، اور تحقیقاتی تنظیمیں بھی اسی استعماری بیانیے کو مضبوط کرنے میں مدد دیتی ہیں تاکہ دنیا میں صرف وہی نکتہ نظر غالب رہے جو مغربی طاقتوں کے مفادات سے ہم آہنگ ہو۔

یہ تمام حقائق اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اقوام متحدہ اور دیگر عالمی ادارے صرف ظاہری طور پر "بین الاقوامی تعاون" اور "انصاف" کے اصولوں پر قائم کیے گئے ہیں، جبکہ درحقیقت یہ جدید استعماری نظام کے اہم ستون ہیں۔ ان کا مقصد کمزور ممالک کو ترقی اور خودمختاری کی راہ پر ڈالنے کے بجائے انہیں استعماری شکنجے میں جکڑے رکھنا ہے۔ اس لیے ان اداروں کے فیصلوں اور سرگرمیوں کو محض عالمی انصاف کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے ان کے پیچھے موجود طاقتور قوتوں اور ان کے مفادات کو سمجھنا ضروری ہے۔

عالمی مغربی نظام انصاف و قانون اور استعمار

عالمی عدالتیں اور مغربی قانون پر عملداری کا نظام دنیا میں انصاف اور قانون کی حکمرانی کے محافظ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن اگر ان اداروں کی تاریخ اور طرزِ عمل کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اکثر عالمی انصاف سے زیادہ استعماری مفادات کا تحفظ ہوتا ہے۔ ان عدالتوں کو مغربی طاقتوں کے سیاسی، اقتصادی اور عسکری اثرو رسوخ کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اور ان کے فیصلے اکثر طاقتور ممالک کے حق میں ہوتے ہیں، جبکہ کمزور اور ترقی پذیر اقوام کو سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بین الاقوامی عدالتِ انصاف (ICJ) اور بین الاقوامی فوجداری عدالت (ICC) جیسے ادارے بظاہر عالمی قوانین کے نفاذ کے لیے قائم کیے گئے ہیں، لیکن عملی طور پر یہ صرف ان ممالک یا رہنماؤں کے خلاف کارروائی کرتے ہیں جو مغربی طاقتوں کے مخالف ہوں۔ مثلاً، افریقی ممالک کے متعدد رہنماؤں کو جنگی جرائم کے الزام میں سزا دی گئی، لیکن امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل جیسے ممالک کی فوجی کارروائیوں پر کوئی سنجیدہ کارروائی نہیں کی جاتی۔ عراق، افغانستان، لیبیا اور شام میں لاکھوں افراد کی ہلاکت، مہاجرین کے بحران، اور جنگی مظالم کے باوجود کسی مغربی رہنما پر مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ اس کے برعکس، صدام حسین اور

معمر قذافی جیسے حکمرانوں کو عبرتناک انجام تک پہنچایا گیا، کیونکہ وہ مغربی مفادات کے خلاف کھڑے تھے۔

اسی طرح، جنگی جرائم کے مقدمات میں بھی دوہرا معیار واضح نظر آتا ہے۔ بوسنیا، روانڈا، اور دیگر افریقی ممالک میں ہونے والے جرائم کے خلاف فوری اور سخت کارروائی کی گئی، لیکن فلسطین میں اسرائیلی مظالم، یمن میں سعودی عرب کی بمباری، اور امریکہ کی طرف سے گوانتاناموبے میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں پر عالمی عدالتیں خاموش رہتی ہیں۔ مغربی ممالک کی خفیہ ایجنسیاں بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں اڑاتی ہیں، لیکن ان کے خلاف کبھی کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا جاتا۔

اس کے برعکس، جب کوئی غیر مغربی ملک اپنی خودمختاری اور قومی مفادات کے تحت کام کرتا ہے، تو بین الاقوامی عدالتوں کا نظام فوری حرکت میں آجاتا ہے۔ ایران، وینزویلا، اور روس جیسے ممالک کے خلاف قانونی کارروائیاں تیز کردی جاتی ہیں، جبکہ مغربی ممالک کے مظالم کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، امریکہ نے عالمی عدالت کے کئی فیصلوں کو ماننے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ ICC کے ججوں پر پابندیاں تک عائد کر دی گئیں، مگر اس کے باوجود یہ ادارے مغربی طاقتوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔

یہی رویہ تجارتی تنازعات میں بھی نظر آتا ہے۔ عالمی تجارتی تنظیم (WTO) اور دیگر قانونی ادارے اکثر مغربی کمپنیوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جب ترقی پذیر ممالک اپنے وسائل پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ان پر پابندیاں

عائد کر دی جاتی ہیں اور انہیں بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت ایران اور وینزویلا پر عائد معاشی پابندیاں ہیں، جنہیں قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے مغربی عدالتوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔

انصاف کے اس نام نہاد نظام کے خلاف جو حقائق ہیں، وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ بین الاقوامی عدالتیں اور قوانین صرف کمزور ممالک کے لیے نافذ کیے جاتے ہیں، جبکہ طاقتور ممالک ان سے آزاد ہیں۔ اگر واقعی انصاف کا یکساں اطلاق ہوتا، تو عراق پر غیر قانونی حملے کے ذمہ دار جارج بش، برطانیہ کے ٹونی بلیئر، اور اسرائیلی قیادت پر مقدمہ چلایا جاتا، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اس کے برعکس، جب کسی غیر مغربی رہنما کو سزا دینی ہو، تو قانونی کارروائیاں برق رفتاری سے انجام دی جاتی ہیں۔

یہ تمام حقائق اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عالمی عدالتوں کا مقصد انصاف کی بالادستی سے زیادہ استعماری طاقتوں کے مفادات کا تحفظ ہے۔ ان اداروں کے ذریعے ترقی پذیر ممالک پر دباؤ ڈالا جاتا ہے، انہیں مغربی قوانین کے تابع رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور وہ نظام نافذ کیا جاتا ہے جو استعماری عزائم کو تقویت دیتا ہے۔ اس لیے ان عدالتوں کے فیصلوں کو بلا تحقیق "عالمی انصاف" سمجھنے کے بجائے ان کے پس پردہ موجود استعماری مقاصد کو سمجھنا ضروری ہے۔

عالمی انعامات اور ایوارڈز کی حقیقت

عالمی انعامات اور ایوارڈز بظاہر علم، تحقیق، فنون، کھیل اور انسانی حقوق کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے دیے جاتے ہیں، لیکن ان کے پس پردہ طاقتور اقوام اور اداروں کے استعماری مفادات بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر ان ایوارڈز کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو کئی ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو ان کی غیر جانبداری پر سوالیہ نشان کھڑے کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ بین الاقوامی سطح پر دیے جانے والے انعامات کا نظم و نسق زیادہ تر مغربی طاقتوں کے زیر اثر ادارے سنبھالتے ہیں۔ نوبل انعام کو ہی دیکھ لیں، جو سائنسی ترقی اور امن کے فروغ کے نام پر دیا جاتا ہے، مگر اکثر اوقات اس کا فیصلہ سیاسی مفادات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، ہنری کسنجر کو ویتنام جنگ کے باوجود امن انعام سے نوازا گیا، جبکہ حقیقی مزاحمتی رہنماؤں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اسی طرح، پلٹزر پرائز بنیادی طور پر امریکی میڈیا اداروں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور وہی صحافت کو "معیاری" قرار دیا جاتا ہے جو مغربی بیانیے سے ہم آہنگ ہو۔

مغربی ممالک کے سامراجی جرائم کو بھی ان ایوارڈز کی سیاست کے ذریعے چھپایا جاتا ہے۔ رامون میگسیسے ایوارڈ، جو بظاہر ایشیائی سماجی کارکنوں اور رہنماؤں کے لیے مخصوص ہے، درحقیقت ان شخصیات کو نوازنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو امریکی اثرورسوخ کو تقویت دیں۔ اسی طرح، مو ابراہیم پرائز بظاہر افریقہ میں اچھی حکمرانی کے فروغ کے لیے ہے، مگر درحقیقت اس کے ذریعے ان رہنماؤں کی سرپرستی کی جاتی ہے جو مغربی اقتصادی نظام کے تابع رہتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ کے لیے بھی ان ایوارڈز کو ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ نوبل انعام برائے معاشیات عموماً ایسے ماہرین معیشت کو دیا جاتا ہے جو سرمایہ دارانہ ماڈل کو مستحکم کریں۔ مثلاً، ملٹن فریڈمین کو اس وقت انعام سے نوازا گیا جب نیولبرل ازم کو ترقی پذیر ممالک پر مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ ٹورنگ ایوارڈ اور دیگر سائنسی ایوارڈز بھی ان شعبوں میں دیے جاتے ہیں جو ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل کنٹرول کے مغربی غلبے کو مزید مستحکم کریں۔

ان ایوارڈز کے ذریعے علمی اور ثقافتی استعماریّت کو بھی فروغ دیا جاتا ہے۔ بوکر پرائز بنیادی طور پر ان مصنفین کو نوازتا ہے جو مغربی ثقافتی و سماجی نظریات کو فروغ دیں، جبکہ غیر مغربی افکار رکھنے والے ادیبوں کو کم اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی طرح، کانز فلم فیسٹیول میں ایسی فلموں کو زیادہ پذیرائی ملتی ہے جو مغربی اقدار کو پروموٹ کرتی ہوں یا ترقی پذیر ممالک کی منفی تصویر کشی کریں۔

کھیلوں میں بھی استعماری مفادات نمایاں نظر آتے ہیں۔ فیفا ایوارڈز میں اکثر مغربی ممالک کے کھلاڑیوں کو زیادہ پذیرائی دی جاتی ہے، جبکہ افریقی اور ایشیائی کھلاڑیوں کو کم مواقع ملتے ہیں۔ اولمپکس جیسے مقابلوں میں سیاسی مقاصد کے تحت بعض ممالک کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے، جیسا کہ روس اور چین کے خلاف اقدامات۔

یہ تمام ایوارڈز دراصل مغربی دنیا کی "نرم طاقت" کا ایک مؤثر ہتھیار ہیں۔ ان کے ذریعے مغربی تہذیب، نظریات اور سیاسی ایجنڈے کو عالمی سطح پر "معیاری" اور "مستند" قرار دیا جاتا ہے، جبکہ متبادل بیانیے اور غیر مغربی ماڈلز کو کمزور کیا جاتا ہے۔ اس لیے ان ایوارڈز کے پیچھے موجود استعماری مفادات کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ حقیقی علمی و سماجی ترقی کے لیے آزادانہ سوچ کو فروغ دیا جا سکے اور ان اعزازات کو محض "معیار" کی علامت سمجھنے کے بجائے ان کے پس پردہ عزائم کو بھی پہچانا جا سکے۔

مغربی چمک دمک اور تیسری دنیا کی احساس محرومیاں و کوتاہیاں

ہر دوسرا شخص آج تیسری دنیا کے ممالک سے مغرب کی طرف ہجرت کرنے کے لیے بے قرار نظر آتا ہے۔ مغربی ممالک کو ترقی، خوشحالی، آزادی اور مساوات کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی دنیا کی چمک دمک کے پیچھے ایک ایسا استعماری نظام کارفرما ہے جو صدیوں سے دیگر اقوام کو غلام بناتا آیا ہے۔ یہ وہی طاقتیں ہیں جو دوسروں کے وسائل لوٹ کر خود کو امیر اور باقی دنیا کو محتاج بنا چکی ہیں۔ ان کی معیشت ترقی پذیر ممالک کے سستے مزدوروں، استحصالی تجارتی معاہدوں اور مصنوعی معاشی بحرانوں پر کھڑی ہے۔

یہاں کی ظاہری خوشحالی اور چمک دمک کو دیکھ کر جو لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں، وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ ترقی کن قیمتوں پر حاصل کی گئی ہے۔ مغربی معاشرہ شدید اخلاقی انحطاط، خاندانی نظام کی تباہی، مادہ پرستی، فحاشی اور روحانی و اخلاقی بے راہ روی میں مبتلا ہے۔ یہاں کا نظام لوگوں کو انسانیت سے کاٹ کر ایک مشین میں بدل دیتا ہے، جہاں مقصد صرف دنیاوی مفادات کا حصول ہوتا ہے۔ ظاہری خوشحالی کے باوجود دل و دماغ میں سکون ناپید ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی قومیں ذہنی بیماریوں، خودکشی، ڈپریشن اور بے اطمینانی کا شکار ہیں۔

دینی اعتبار سے بھی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کرنا جہاں ظلم و فساد کے سرغنے بستے ہوں اور جہاں اسلامی اقدار پامال کی جاتی ہوں، جائز نہیں۔ قرآن اور حدیث میں بلادِ کفر کی طرف بلاضرورت ہجرت کو ناپسندیدہ اور بعض صورتوں میں حرام قرار دیا گیا ہے، خصوصاً جب وہاں دین پر عمل کرنا مشکل ہو جائے اور نسلیں ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ مغربی معاشروں میں مسلمانوں کو ایک سازشی انداز میں معاشرتی ہم آہنگی کے نام پر اپنے عقائد اور دینی تشخص سے دور کیا جاتا ہے۔ نئی نسل کو لبرل ازم اور سیکولرازم کی آڑ میں ایسا ذہنی غلام بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنے دین، ثقافت اور روایات سے نفرت کرنے لگتی ہے۔

مغرب کی چکاچوند میں کھو جانے والے یہ نہیں دیکھتے کہ یہی طاقتیں مسلم ممالک میں جنگوں، سازشوں، اقتصادی پابندیوں اور ثقافتی یلغار کے ذریعے مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہیں۔ ان کی پالیسیاں محض وسائل لوٹنے اور اسلامی ممالک کو کمزور رکھنے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ وہ ترقی پذیر ممالک کے ہنرمند افراد کو اچھی نوکریوں کا لالچ دے کر بلاتے ہیں تاکہ یہ دماغ ان کی معیشت کو مضبوط کریں، جبکہ ان کے اپنے ممالک میں تعلیمی اور معاشی ترقی کو روکنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل کامیابی اور سکون دین کی پیروی میں ہے، نہ کہ کسی ایسی دنیا میں جہاں روحانی و اخلاقی زوال انتہا پر ہو۔ جو لوگ مغرب کو اپنی زندگی کا خواب بناتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ حقیقت دیکھیں کہ وہاں پہنچ کر بھی لوگ بے سکونی، اجنبیت اور بے مقصدیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ اپنی پہچان کھو کر، اپنی نسلوں کو مغربی ثقافتی

یلغار کے حوالے کر کے، اور صرف دنیاوی فائدے کے لیے ایمان کو خطرے میں ڈال کر ملنے والی زندگی، حقیقت میں غلامی ہی کی ایک اور شکل ہے۔ اصل کامیابی دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں ہے، اور آخرت کی کامیابی صرف اسی میں ہے کہ ہم اپنے دین، اپنی اقدار اور اپنے تشخص کی حفاظت کریں، چاہے اس کے لیے دنیاوی مشکلات ہی کیوں نہ جھیلنی پڑیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ظلم کے خلاف قیام کا حکم دیا ہے، نہ کہ ظالموں کے درمیان جا کر ان کے رنگ میں رنگ جانے کا۔ مغرب کی طرف ہجرت کرنے کا رجحان درحقیقت اسی غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے جو استعماری طاقتوں نے ہم پر مسلط کی ہے۔ جب تک ہمارے ذہنوں سے یہ غلامی کا جال نہیں ٹوٹے گا، ہم اسی کشمکش میں رہیں گے کہ مغرب جائیں یا نہ جائیں۔

اس اضطراب سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے علاقوں میں استعمار مخالف تحریکیں منظم کریں اور اپنے نظام کو آزاد کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کریں۔ ہمیں ایک ایسا نظام حکومت قائم کرنے کے لیے کوشاں ہونا چاہیے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو اور جس میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو۔ یہ جدوجہد صرف ایک قومی یا علاقائی سطح پر نہیں، بلکہ ایک عالمی مہدوی نظام کے قیام کی طرف پہلا قدم ہے، جس میں ظالموں کے تسلط کا خاتمہ ہو گا اور دنیا حقیقی عدل و انصاف کے نور سے منور ہو گی۔

مغرب کی طرف ہجرت صرف دنیا کے سراب کے پیچھے بھاگنے کے مترادف ہے، لیکن جو شخص اللہ کے دین کے قیام کے لیے جدوجہد کرے گا، وہ نہ صرف دنیا میں عزت پائے گا بلکہ آخرت میں بھی کامیاب ہو گا۔ ہمیں دنیا پرستی کے اس جال کو توڑنا ہو گا اور اپنی آنے

والی نسلوں کے لیے ایسی راہ ہموار کرنی ہوگی جس میں وہ خودمختاری، عزت اور اسلامی اصولوں کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ یہی حقیقی کامیابی ہے، نہ کہ مغرب جا کر ان کی غلامی میں زندگی بسر کرنا۔

علی اور تنہائی

امام علیؑ کی تنہائی ایک ایسا پہلو ہے جو نہ صرف تاریخِ اسلام میں منفرد حیثیت رکھتا ہے بلکہ نفسیاتی اور روحانی لحاظ سے بھی گہرے معانی رکھتا ہے۔ ایک مردِ مومن کے لیے سب سے بڑی آزمائش یہی ہوتی ہے کہ جب سچائی کے راستے پر چلنے کی وجہ سے اسے تنہا کر دیا جائے، لیکن یہ تنہائی کسی کمزوری کی علامت نہیں بلکہ قربِ الٰہی کا ایک امتحان اور روحانی ترقی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

علمِ نفسیات کے مطابق، انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک سماجی تعلق ہے۔ جب انسان کو دوسروں کی طرف سے مسترد کر دیا جاتا ہے یا وہ خود کسی اعلیٰ مقصد کے تحت تنہائی اختیار کرتا ہے، تو اس پر نفسیاتی دباؤ آتا ہے۔ لیکن اگر یہ تنہائی کسی اعلیٰ مقصد کے تحت ہو اور انسان اپنے یقین میں مضبوط ہو، تو یہی تنہائی سکون، معرفت اور روحانی ترقی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ امام علیؑ کی زندگی میں یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ وہ حق کے ساتھ کھڑے رہے، چاہے لوگ ساتھ چھوڑ دیں، چاہے زمانہ ان کے خلاف ہو جائے۔ ان کی تنہائی کوئی کمزوری نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی طاقت تھی جو انہیں مزید بلند کرتی رہی۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: "فَإِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ" (الصف:4)۔ یعنی اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں

مضبوطی سے ڈٹے رہتے ہیں، گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ امام علیؑ کی شخصیت اسی قرآنی حقیقت کا عملی نمونہ تھی۔ وہ اپنے حق پر ثابت قدم رہے، چاہے لوگوں نے انہیں چھوڑ دیا، چاہے خلافت ان سے چھین لی گئی، چاہے انہیں جنگوں میں تنہا کر دیا گیا۔

امام علیؑ کی تنہائی کو دیکھیں تو وہ اس دنیا میں حق کی خاطر سب سے زیادہ اکیلے کھڑے نظر آتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں: ** "میں اس وادی میں اس طرح رہا جیسے پیاسا شخص جس کے گلے میں ہڈی اٹک گئی ہو، یا وہ شخص جو بیابان میں تنہا ہو۔" ** یہ الفاظ ایک ایسی داخلی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں جہاں انسان کو حق کا علم تو ہو مگر زمانہ اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دے۔ یہ وہی کیفیت ہے جسے علم نفسیات میں "Existential Loneliness" کہا جاتا ہے، یعنی وہ تنہائی جو کسی مادی چیز کے نہ ہونے سے نہیں بلکہ فکری اور روحانی بلندی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

روایات میں بھی امام علیؑ کی تنہائی کا ذکر ملتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: "علی وہ ہے جو میرے بعد حق پر ہو گا، چاہے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں۔" یعنی تنہائی امام علیؑ کی منزلت کو کم نہیں کرتی بلکہ ان کے حق پر ہونے کی دلیل بنتی ہے۔

امام علیؑ کی تنہائی صرف سیاسی یا سماجی نہیں تھی، بلکہ یہ وہ تنہائی تھی جو معرفت کی انتہائی منزل پر پہنچنے والے بندے کو محسوس ہوتی ہے۔ جب انسان اللہ کی معرفت میں اتنا آگے بڑھ جائے کہ دنیا کی ہر شے اس کے لیے بے معنی لگنے لگے، تو وہ اس دنیا میں خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے امام علیؑ فرماتے ہیں: "دنیا مجھے دھوکہ نہیں دے سکی، کیونکہ میں

نے اس کی حقیقت کو جان لیا ہے۔" ان کا یہ شعور انہیں ہر حال میں ثابت قدم رکھتا ہے، چاہے وہ محراب میں شہید ہوں، چاہے میدانِ جنگ میں تنہا کھڑے ہوں، چاہے حکومت کے باوجود مظلوم ہوں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں مردِ مومن کے لیے حقیقی تسلی صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر دنیا ساتھ چھوڑ دے، اگر لوگ حق کی راہ میں اس کا ساتھ نہ دیں، تب بھی اللہ اسے نہیں چھوڑے گا۔ امام علیؑ کی تنہائی دراصل ان کی سب سے بڑی طاقت تھی، کیونکہ وہ تنہا ہو کر بھی کبھی کمزور نہ ہوئے، بلکہ ہر حال میں حق پر ڈٹے رہے۔

اگر آج کوئی رہبر و قائد خدا کی خاطر تنہائی اختیار کرنے جا رہا ہو، تو یہ ہمارے لیے ایک بہت بڑی آزمائش اور موقع ہے کہ ہم اپنے ایمان، بصیرت اور کردار کو پرکھ سکیں۔ تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ جب بھی کوئی حق پرست قیادت ظلم اور باطل کے خلاف کھڑی ہوتی ہے، تو اکثر لوگ یا تو خاموش رہتے ہیں، یا وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ کر اسی نظام کا حصہ بن جاتے ہیں جو اس قیادت کو تنہا کرنے پر تلا ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنے عہد پر قائم رہتے ہیں، وہی وہ خوش نصیب ہوتے ہیں جو حق کے حقیقی محافظ کہلاتے ہیں۔

سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ ہم اپنے اندر وہ شعور اور بصیرت پیدا کریں جس سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ سچائی کہاں ہے اور باطل کس چال میں مصروف ہے۔ اگر ہم خود غفلت میں مبتلا ہوں، تو ہمیں سمجھ ہی نہیں آئے گی کہ ہمارا رہبر تنہائی میں جا رہا ہے یا وہ کن وجوہات کی بنا پر اس راستے پر گامزن ہوا ہے۔ ہمیں قرآن و حدیث، تاریخِ انبیاء اور امام علیؑ کی سیرت کا

مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ وہ کون سے اصول ہیں جن پر چلنے والا شخص تنہا ہو جاتا ہے، اور یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ کیا ہم بھی اس تنہائی کے ذمہ داروں میں شامل تو نہیں؟

اگر ہم واقعی اس رہبر کے ساتھ ہیں، تو ہمیں سب سے پہلے اپنی ذات میں وہ استقامت اور ہمت پیدا کرنی ہوگی جو آزمائش کے وقت ہمیں کمزور نہ ہونے دے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب رہبر و قائد کو تنہا کیا جا رہا ہو، تو اس کے ماننے والوں کو بھی مختلف آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ کیا ہم بھی دنیاوی خوف، مالی نقصان، سماجی دباؤ یا دیگر فتنوں کی وجہ سے اس رہبر کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہو سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہے، تو ہمیں اپنے اندر ایمانی قوت کو مضبوط کرنا ہوگا تاکہ کسی بھی صورت میں حق کا دامن نہ چھوڑیں۔

ہمیں اپنے کردار سے بھی ثابت کرنا ہوگا کہ ہم صرف زبانی دعوے نہیں کرتے بلکہ عملی طور پر اس رہبر کے ساتھ کھڑے ہیں۔ اگر وہ ظلم کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے، تو ہمیں بھی اپنی استطاعت کے مطابق اس کی حمایت کرنی چاہیے، چاہے وہ قلم سے ہو، زبان سے ہو، یا کسی اور عملی اقدام سے۔ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی کوئی سچا قائد اٹھا، تو اس کے ساتھ چند ہی لوگ تھے، لیکن وہی چند لوگ تاریخ کا رخ بدلنے میں کامیاب ہوئے۔ امام حسینؑ کے 72 ساتھی، حضرت ابراہیمؑ کے چند مخلص پیروکار، امام علیؑ کے حقیقی محبء یہ سب یہ ثابت کرتے ہیں کہ حق پرست ہمیشہ تعداد میں کم ہوتے ہیں، مگر ان کی استقامت انہیں کامیاب بنا دیتی ہے۔

سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ہم اس بات کو سمجھیں کہ اگر ہم خاموش رہے، اگر ہم اپنے فائدے کے لیے پیچھے ہٹ گئے، اگر ہم نے اس رہبر کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا، تو ہم خود بھی اس ظلم کا حصہ بن جائیں گے جو اسے تنہا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر کل جب تاریخ لکھی جائے گی، تو ہمارے نام بھی ان لوگوں میں شمار ہوں گے جنہوں نے سچائی کے سامنے خاموشی اختیار کی۔ اس لیے ہمیں خود سے سوال کرنا چاہیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ کیا ہم امام علیؑ کے ساتھیوں میں سے ہیں یا ان لوگوں میں شامل ہیں جو مصلحت پسندی اور دنیاوی مفادات کی وجہ سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں؟

اگر کوئی رہبر آج تنہائی کی راہ پر جا رہا ہے، تو ہمیں اسے یہ محسوس نہیں ہونے دینا چاہیے کہ وہ اکیلا ہے۔ ہمیں اس کی فکر کو سمجھنا ہو گا، اس کے پیغام کو عام کرنا ہو گا، اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کے مشن کا حصہ بننا ہو گا۔ کیونکہ حق پر چلنے والے تو ہر دور میں کم ہوتے ہیں، مگر جو لوگ ان کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، وہی خدا کے نزدیک کامیاب ہوتے ہیں۔

سامراجی سازشوں سے بچنے کیلئے کیا کیا جائے؟

ماضی میں بھی مختلف ادوار میں ایسے ایجنڈے پیش کیے جاتے رہے ہیں جو ترقی اور بہتری کے خوشنما نعروں کے ساتھ آتے ہیں، لیکن در حقیقت وہ استعماری طاقتوں کے مفادات کو تحفظ دینے اور ترقی پذیر اقوام کو تابع رکھنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ جیسے آج Sustainable Development Goals (SDGs) کے نام پر ایک مخصوص نظریاتی، معاشی اور تعلیمی ڈھانچہ مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اسی طرح مستقبل میں بھی اسی نوعیت کے نئے منصوبے پیش کیے جاتے رہیں گے۔ یہ ایجنڈے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے رنگ اور عنوانات بدلتے رہتے ہیں، لیکن ان کا اصل مقصد ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے: اقوام کو فکری، معاشی، تعلیمی اور سیاسی طور پر ایسا پابند کر دینا کہ وہ استعماری طاقتوں کی پالیسیوں سے باہر نہ نکل سکیں۔

قرآن کریم نے واضح طور پر یہود و نصاریٰ کی چالاکیوں اور فتنہ انگیزیوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ کبھی بھی مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے اور ہمیشہ فتنہ وفساد برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ مختلف حربے اختیار کرتے آئے ہیں تاکہ اقوامِ عالم کو اپنی مٹھی میں رکھ سکیں۔ کبھی جمہوریت اور انسانی حقوق کے نام پر، کبھی ترقی و معاشی استحکام کے عنوان سے، تو کبھی

تعلیم اور جدیدیت کی آڑ میں یہ اپنی پالیسیوں کو مسلط کرتے ہیں۔ سامراجی استعماری طاقتیں صرف وسائل پر قبضہ کرنے کی خواہاں نہیں ہوتیں بلکہ وہ ذہنی غلامی مسلط کرنا چاہتی ہیں تاکہ لوگ خود کو ان کے اصولوں اور افکار کا پابند محسوس کریں اور ان کے خلاف کسی بھی مزاحمت کو غیر منطقی یا بے فائدہ سمجھنے لگیں۔

ایسے ایجنڈوں سے ہوشیار رہنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ ان کے اصل مقاصد کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ ان کے منصوبوں کی گہرائی میں جا کر یہ دیکھا جائے کہ وہ کن بنیادی اصولوں پر کھڑے ہیں اور ان کے نتیجے میں کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ استعماری منصوبے ہمیشہ مخصوص اصطلاحات اور پیچیدہ زبان میں لپٹے ہوتے ہیں، جنہیں عام آدمی فوراً نہیں سمجھ پاتا، اس لیے ان کا تنقیدی تجزیہ ضروری ہے۔ ہر نئے بین الاقوامی معاہدے، پالیسی، یا تعلیمی نصاب کا بغور جائزہ لینا ہوگا کہ آیا یہ ہماری نظریاتی، ثقافتی اور معاشی خودمختاری کو کمزور تو نہیں کر رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی فکری بنیادوں کو مضبوط کرنا ہوگا۔ جب تک ایک قوم اپنی شناخت، عقیدے، ثقافت، اور معاشرتی اقدار کو پوری طرح نہیں سمجھتی، وہ دوسروں کی چالوں میں الجھتی رہے گی۔ اسلامی تعلیمات اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ دشمن نے کس طرح ماضی میں مختلف اقوام کو اپنا غلام بنایا اور کن طریقوں سے ان کے مزاحمتی جذبے کو کمزور کیا۔ جب ایک قوم اپنے دشمن کے حربے پہچاننے لگتی ہے تو وہ ان سے محفوظ بھی رہنے لگتی ہے۔

معاشی طور پر خود کفیل ہونا بھی انتہائی ضروری ہے کیونکہ استعماری طاقتیں زیادہ تر اقتصادی دباؤ کے ذریعے قوموں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان کے بنائے ہوئے نظام کو قبول کریں۔ اگر ترقی پذیر اقوام سودی قرضوں اور غیر ملکی امداد پر انحصار ختم کر دیں اور اپنے وسائل کو خود استعمال کرنے کی راہ اپنائیں، تو وہ سامراجی استعماری طاقتوں کے شکنجے سے آزاد ہو سکتی ہیں۔ تعلیم، صنعت، اور زراعت کے میدان میں ایسا نظام قائم کیا جائے جو بیرونی اثرات سے پاک ہو اور خود انحصاری کو فروغ دے۔

ذرائع ابلاغ کا کردار بھی بہت اہم ہے کیونکہ یہی وہ میدان ہے جہاں استعماری قوتیں سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ فلموں، خبروں، اور سوشل میڈیا کے ذریعے ایک مخصوص بیانیہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ عوامی رائے کو قابو میں رکھا جا سکے۔ اس پروپیگنڈا کے توڑ کے لیے ضروری ہے کہ ایک متبادل نظریاتی اور میڈیا نظام تشکیل دیا جائے جو استعماری سازشوں کو بے نقاب کرے اور عوام میں شعور پیدا کرے کہ وہ کس طرح ذہنی غلامی سے بچ سکتے ہیں۔

سامراجی استعماری طاقتیں کبھی بھی اپنے عزائم سے دست بردار نہیں ہوں گی کیونکہ ان کا وجود ہی دوسروں کے استحصال پر قائم ہے۔ اس لیے دنیا کی مظلوم اقوام کے پاس صرف ایک راستہ ہے: وہ اپنی فکری، تعلیمی، اور معاشی خود مختاری حاصل کریں، قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی سمت متعین کریں، اور ہر اس ایجنڈے کو مسترد کریں جو انہیں ایک

مخصوص عالمی طاقت کے تابع بنانے کی کوشش کرے۔ شعور، مزاحمت، اور خود انحصاری کے بغیر استعماری قوتوں کی غلامی سے نجات ممکن نہیں۔

سائنس و مذہب کی یکجائی

سائنس اور مذہب کے درمیان خلیج ڈالنے والے عام طور پر دو انتہاؤں پر پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو سائنسی حقیقتوں کو مذہب کے خلاف ایک حتمی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یوں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب محض ایک روایتی یا غیر سائنسی نظریہ ہے۔ یہ لوگ عموماً نیچر لزم یا سائنٹزم (Scientism) کے زیر اثر ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو چیز تجربے یا مشاہدے میں نہیں آتی، وہ حقیقت میں موجود ہی نہیں ہو سکتی۔

دوسری طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو مذہب کو ایک جامد اور غیر لچکدار تصور کر کے سائنسی ترقی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ سائنس کو ایک مخالف طاقت سمجھتے ہیں اور جدید سائنسی دریافتوں کو قبول کرنے کے بجائے انہیں مذہب کے خلاف ایک چیلنج تصور کرتے ہیں۔ نتیجتاً، وہ سائنسی ترقی سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور اپنے مخصوص مذہبی نظریات کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں، خواہ وہ زمانے کی روشنی میں نظر ثانی کے متقاضی ہی کیوں نہ ہوں۔

حالانکہ اگر غور کیا جائے تو سائنس اور مذہب میں کوئی حقیقی تضاد نہیں۔ سائنس کا دائرہ محدود ہے، یہ مادی اور تجرباتی حقائق تک رسائی رکھتی ہے، جبکہ مذہب ان حقائق کی تعبیر

فراہم کرتا ہے اور ان کی حتمی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جو لوگ ان دونوں کے درمیان خلیج ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ یا تو سائنس کو اس کی حدود سے بڑھا کر مذہب کا متبادل سمجھنے لگتے ہیں یا پھر مذہب کی اصل حکمت کو نظر انداز کر کے سائنس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ درحقیقت، سائنس اور مذہب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، نہ کہ ایک دوسرے کی نفی۔

سائنس اور مذہب کی تکمیل کو سمجھنے کے لیے ہمیں دونوں کے دائرہ کار اور مقاصد پر غور کرنا ہوگا۔ سائنس فطری قوانین کو دریافت کرتی ہے، مظاہرِ قدرت کی وضاحت پیش کرتی ہے اور دنیا کے مادی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے تجرباتی طریقے اپناتی ہے۔ دوسری طرف، مذہب انسان کو کائنات کی غائی حقیقت، اخلاقیات، روحانیت اور حیات بعد الموت جیسے امور پر رہنمائی فراہم کرتا ہے، جو سائنسی دائرہ کار سے باہر ہیں۔

یہ دونوں ایک دوسرے کی نفی کرنے کے بجائے حقیقت کی تکمیل کرتے ہیں کیونکہ سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ کائنات کیسے کام کرتی ہے، جبکہ مذہب اس کے "کیوں" کا جواب دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ انسان ارتقائی مراحل سے گزر کر موجودہ شکل میں آیا، لیکن یہ نہیں بتا سکتی کہ اس کے پیچھے مقصد کیا ہے۔ یہ سوال مذہب اٹھاتا ہے اور وضاحت کرتا ہے کہ انسان صرف ایک حیاتیاتی اتفاق نہیں، بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کے تحت تخلیق کیا گیا ہے۔

اسی طرح، سائنسی ترقی نے ہمیں فطرت کے اصولوں کو زیادہ گہرائی سے سمجھنے میں مدد دی، لیکن یہ اصول قرآن و حدیث میں دی گئی حقیقتوں کی تائید کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، قرآن میں کئی ایسے سائنسی حقائق کا ذکر ہے جو جدید سائنس نے صدیوں بعد دریافت کیے، جیسے کائنات کی توسیع (الذاریات: 47) اور انسان کی تخلیق میں مرحلہ وار ارتقاء (المومنون:12-14)۔

مزید برآں، سائنسی تحقیق کی بنیاد مشاہدہ اور تجربہ ہے، جبکہ مذہب کا دائرہ اس سے آگے بڑھ کر غیبی حقائق تک پہنچتا ہے، جنہیں سائنس اپنے موجودہ آلات اور تجربات سے ثابت نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر، روح، دعا کے اثرات، وحی اور قیامت جیسے موضوعات وہ ہیں جنہیں سائنسی طریقہ کار کے ذریعے مکمل طور پر جانچنا ممکن نہیں، لیکن مذہب ان کی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عظیم مسلم سائنسدان جیسے ابن سینا، ابن الہیثم، الرازی اور الخوارزمی نہ صرف سائنسی علوم میں مہارت رکھتے تھے، بلکہ مذہبی علوم سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے سائنس اور مذہب کو متضاد نہیں سمجھا، بلکہ دونوں کو ایک مکمل حقیقت کے مختلف زاویے قرار دیا۔

چنانچہ، جب سائنس اور مذہب کو ایک دوسرے کا حریف بنانے کے بجائے ان کے اصل دائرہ کار میں دیکھا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ سائنس مادی حقائق کو واضح کرتی ہے اور انسان کو تحقیق پر مائل کرتی ہے، جبکہ مذہب ان

حقائق کے پیچھے کار فرما حکمت کو بیان کرتا ہے اور تحقیق کو اخلاقی اور بامقصد سمت عطا کرتا ہے۔

جو مذہبی امور سائنس ثابت کرنے سے قاصر ہے، وہاں انسان کو سب سے پہلے سائنسی محدودیت کو سمجھنا چاہیے۔ سائنس کا دائرہ صرف مادی اور تجرباتی حقائق تک محدود ہے، جبکہ مذہب ان حقائق کے پیچھے کار فرما حکمت اور روحانی پہلوؤں کو واضح کرتا ہے۔ سائنس ان چیزوں کو ثابت نہیں کر سکتی جو اس کے دائرۂ تحقیق سے باہر ہیں، جیسے روح، وحی، آخرت، ملائکہ، تقدیر اور دعا کے اثرات۔ اگر سائنس کسی چیز کو ثابت نہ کر پائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حقیقت میں موجود نہیں، بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سائنسی طریقۂ تحقیق اسے ناپنے اور پرکھنے کے قابل نہیں۔

مذہب کی سچائی کو سمجھنے کے لیے محض سائنسی تجربے پر انحصار ضروری نہیں، بلکہ عقل، منطق، تاریخی شواہد، نقلی دلائل اور ذاتی و اجتماعی تجربات بھی اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کئی مذہبی تصورات ایسے ہیں جو سائنسی تجربات کے بجائے منطقی استدلال سے ثابت ہوتے ہیں، جیسے اللہ کے وجود کا عقلی اثبات۔ اسی طرح، انبیاء کی پیشین گوئیاں، معجزات اور الہامی کتب میں دیے گئے بیانات جو بعد میں سچ ثابت ہوئے، اس بات کا ثبوت ہیں کہ دین کا دائرہ سائنسی مشاہدے سے کہیں وسیع ہے۔ مزید برآں، انسان کی ذاتی زندگی میں بھی روحانی تجربات اور دعا کی قبولیت جیسے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں، جو کسی نہ کسی درجے میں مذہب کی سچائی کی گواہی دیتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ کئیوں سائنسی دریافتیں وقت کے ساتھ ثابت ہوئی ہیں۔ ماضی میں کچھ ایسے حقائق جنہیں غیر سائنسی سمجھا جاتا تھا، بعد میں جدید سائنس نے ان کی تصدیق کر دی، جیسے قرآن میں پانی کو ہر جاندار کی بنیاد قرار دینا اور جدید بایولوجی کا یہ ثابت کرنا کہ تمام خلیے پانی پر انحصار کرتے ہیں۔ اس لیے اگر آج سائنس کسی مذہبی حقیقت کو نہیں سمجھ پا رہی، تو یہ ممکن ہے کہ مستقبل میں تحقیق اس کی تصدیق کر دے۔

ایمان اور سائنسی ثبوت میں ایک توازن ضروری ہے۔ دین کا مقصد سائنسی تصدیق کروانا نہیں بلکہ ہدایت دینا ہے۔ کچھ امور ایسے ہیں جو خالصتاً ایمان پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا سائنس سے ثابت ہونا ضروری نہیں، جیسے آخرت، فرشتے اور روحانی اثرات۔ جب کافی دلائل ہو جائیں، تو دیگر غیر مرئی حقائق کو قبول کرنا عقل کا تقاضا ہے، کیونکہ یہی توکل اور تسلیم و رضا کی بنیاد ہے۔ اگر کسی مذہبی حقیقت کو سائنس ثابت کرنے سے قاصر ہو، تو انسان کو بے یقینی میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے فہم کو وسیع کرنا چاہیے، سائنسی ترقی کے ممکنہ پہلوؤں کو دیکھنا چاہیے اور ایمان کی گہرائی میں جا کر حقیقت کی تلاش کرنی چاہیے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس وقت تک سائنس کو مستند مانتے ہیں جب تک وہ ان کے نظریاتی یا فکری ڈھانچے سے متصادم نہ ہو، لیکن جیسے ہی سائنس کسی مذہبی حقیقت کی تائید کرنے لگتی ہے، وہ فوراً اسے "سوڈو سائنس" قرار دے دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی سائنس وہی ہے جو مذہب سے الگ ہو اور اگر کسی سائنسی تحقیق سے کسی دینی تصور کی تصدیق ہونے لگے تو وہ اسے غیر معتبر، مشکوک یا سائنسی دائرہ کار سے باہر قرار دینے لگتے

ہیں۔ یہ رویہ دراصل تعصب اور نظریاتی جمود کی علامت ہے، جس کی جڑیں یا تو غیر شعوری طور پر مذہب سے گریز میں ہوتی ہیں یا پھر اس خوف میں کہ کہیں سائنسی بنیادوں پر مذہب کی سچائی کا کوئی ایسا ثبوت نہ مل جائے جسے رد کرنا مشکل ہو جائے۔

ایسے افراد عموماً اس فکر کے حامل ہوتے ہیں کہ سائنس اور مذہب دو الگ دنیائیں ہیں اور ان کا کسی بھی سطح پر آپس میں میل ممکن نہیں۔ ان کے ذہن میں یہ تصور مضبوط ہوتا ہے کہ سائنسی تحقیق کا مطلب مذہبی عقائد کی نفی کرنا ہے، اور اگر کسی سائنسی دریافت سے دینی تعلیمات کی تصدیق ہو جائے تو وہ اسے سائنسی طریقۂ تحقیق کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سائنس کو صرف ایک ایسے نظریے کے طور پر دیکھا جائے جو مذہب سے بالکل آزاد ہو، کیونکہ اگر سائنس مذہب کی سچائی کی گواہی دینے لگے تو انہیں اپنے فکری موقف میں تبدیلی لانی پڑے گی، جو ان کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

یہ مائنڈ سیٹ عموماً نیچر لزم یا سائنٹزم سے متاثر ہوتا ہے، جس میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ صرف وہی چیز حقیقت ہے جسے سائنسی تجربے سے ثابت کیا جا سکے۔ اس سوچ کا ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ سائنس کو محض مادی اور تجرباتی معاملات تک محدود رکھا جائے اور غیر مادی یا غیبی حقائق کے دائرے میں اسے داخل نہ ہونے دیا جائے، کیونکہ اس سے سائنس کے "روایتی نیوٹرل موقف" کو چیلنج لاحق ہو سکتا ہے۔

اس رویے کا تضاد یہ ہے کہ جب سائنس مذہب کے خلاف کوئی نظریہ پیش کرے تو وہ اسے کھلے دل سے قبول کر لیتے ہیں، چاہے وہ نظریہ ابھی محض ایک مفروضہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن

جب وہی سائنس مذہبی عقائد کی تصدیق کرنے لگے تو وہ فوراً اس پر سوالات کھڑے کر دیتے ہیں اور اسے سوڈو سائنس کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں۔ اس رویے کی اصل بنیاد نظریاتی تعصب ہے، جو تحقیق پر نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ سوچ پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر وہ واقعی سچائی کی تلاش میں ہوتے تو وہ ہر سائنسی دریافت کو اس کے علمی اصولوں کے مطابق پرکھتے، بجائے اس کے کہ وہ نتائج کو پہلے سے طے شدہ فکری سانچے میں فٹ کرنے کی کوشش کرتے۔

سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ حقیقت کے مختلف زاویے ہیں، جہاں سائنس مادی قوانین کو واضح کرتی ہے اور مذہب ان کے پیچھے کارفرما حکمت اور غائی مقصد کو بیان کرتا ہے۔ اگر کوئی مذہبی حقیقت سائنسی دائرۂ تحقیق سے باہر ہو تو اس کا انکار کرنا سائنسی محدودیت کو نہ سمجھنے کے مترادف ہے۔ جو لوگ مذہب کے حق میں آنے والے سائنسی شواہد نہیں مانتے، وہ دراصل تعصب کا شکار ہوتے ہیں اور پہلے سے طے شدہ نظریات کو محفوظ رکھنے کے لیے تحقیق کو قبول یا مسترد کرتے ہیں۔ سچائی کی تلاش تبھی ممکن ہے جب کھلے ذہن اور دیانت داری کے ساتھ ہر علمی ذریعے کو اس کے اصولوں پر پرکھا جائے، بجائے اس کے کہ کسی ایک نظریے کو مطلق مان کر باقی تمام امکانات کو رد کر دیا جائے۔

سچائی و بناوٹ کا متوازن اصول

معاشرتی زندگی کا ایک المیہ یہ ہے کہ لوگ حقیقت اور سچائی کو نظر انداز کر کے بناوٹ اور ریاکاری کو زیادہ پسند کرنے لگے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنی اصلیت کے ساتھ جیتا ہے، اپنے خیالات اور نظریات کو بغیر کسی خوف کے بیان کرتا ہے، تو اکثر اسے مخالفت، تنقید اور حتیٰ کہ نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف، وہ لوگ جو دوسروں کو خوش کرنے کے لیے بناوٹی مسکراہٹیں سجاتے ہیں، مصنوعی عاجزی اختیار کرتے ہیں، اور موقع پرستی کا سہارا لیتے ہیں، انہیں زیادہ مقبولیت، تعریف اور محبت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے تاریخ، نفسیات اور اسلامی تعلیمات ہر سطح پر واضح کرتی ہیں۔

انسانی نفسیات کے مطابق، لوگ اکثر وہی باتیں سننا پسند کرتے ہیں جو ان کے خیالات اور جذبات سے ہم آہنگ ہوں، چاہے وہ حقیقت پر مبنی نہ بھی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بناوٹی باتیں، خوشامد اور چاپلوسی زیادہ مقبول ہوتی ہیں، جبکہ سچائی تلخ محسوس ہوتی ہے۔ ایک تجربہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے: اگر کسی محفل میں کوئی شخص کسی کے غلط عمل پر نرمی اور مصلحت پسندی سے پردہ ڈالے تو اسے عقلمند اور شائستہ سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص حقیقت کو بلا کم و کاست بیان کرے تو اسے سخت گیر اور غیر سماجی تصور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح، ایک ادارے میں اگر ایک ملازم ایمانداری سے اپنی رائے دے تو اسے ناپسند کیا جاتا

ہے، جبکہ وہی ملازم اگر بناوٹی تعریفی جملے ادا کرے تو اسے مزید مواقع ملنے لگتے ہیں۔ یہ رجحان معاشرتی اصولوں کے بگاڑ کی ایک واضح علامت ہے۔

اسلامی تعلیمات میں اس رویے کی سختی سے مذمت کی گئی ہے اور حقیقت پسندی کو ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے " :اور سچ کہو، اگرچہ وہ تمہارے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ "یہ حکم ہمیں اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ سچائی وقتی مخالفت کا سامنا کر سکتی ہے، مگر یہی وہ اصول ہے جو حقیقی کامیابی اور عزت کا باعث بنتا ہے۔ امام حسینؑ نے بھی کربلا کے میدان میں یہی پیغام دیا کہ وقتی پذیرائی کی خاطر مصلحتوں میں پڑ جانا بزدلی ہے، جبکہ سچائی پر ثابت قدم رہنا ہی اصل جرات ہے، چاہے اس کے نتیجے میں قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

آج کے دور میں سوشل میڈیا نے اس مسئلے کو مزید بڑھا دیا ہے۔ یہاں لوگ حقیقت کو نظر انداز کر کے اپنی زندگی کا ایک ایسا پہلو دکھاتے ہیں جو حقیقت میں موجود نہیں ہوتا۔ چمک دمک، خوشحالی اور مصنوعی خوشیوں کی نمائش کر کے وہ مقبولیت حاصل کرتے ہیں، جبکہ جو لوگ سچائی اور حقیقی زندگی کی مشکلات کو بیان کرتے ہیں، وہ کم تر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ رویہ لوگوں میں احساسِ کمتری کو جنم دیتا ہے اور معاشرے میں ریاکاری اور دوغلے پن کو فروغ دیتا ہے۔

حقیقت پسند افراد اگرچہ ابتدا میں مخالفت اور تنقید کا سامنا کرتے ہیں، مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ طویل المدت میں عزت اور سچائی انہی کے حصے میں آتی ہے۔ سقراط کو زہر کا پیالہ

اس لیے دیا گیا کہ وہ بناوٹ اور جھوٹ کے خلاف تھا، مگر آج وہ علم و حکمت کی علامت ہے۔ ابنِ ملجم نے حضرت علیؑ کو شہید کر دیا، مگر علیؑ کا نام آج بھی عدل، حکمت اور سچائی کا استعارہ ہے، جبکہ ابنِ ملجم صرف نفرت کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وقتی مقبولیت کی خاطر جھوٹ اور بناوٹ کا سہارا لینا وقتی کامیابی تو دے سکتا ہے، مگر دائمی عزت اور حقیقی کامیابی ہمیشہ سچائی اور اخلاص کے لیے ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ وقتی ستائش یا ناپسندیدگی کی پرواہ کیے بغیر سچائی پر ثابت قدم رہے۔ جو لوگ حقیقت کے ساتھ جیتے ہیں، وہ وقتی طور پر الگ تھلگ ہو سکتے ہیں، مگر آخر میں کامیابی انہی کے قدم چومتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی محبوب وہی ہے جو حقیقت پر قائم رہے، چاہے اسے دنیا میں مخالفت اور آزمائشوں کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

البتہ ایک نہایت اہم نکتہ ہے یہ بھی ہے کہ اگر ہر انسان اپنی مرضی سے، بغیر کسی اخلاقی اور سماجی اصول کے، وہ سب کچھ کہنے اور کرنے لگے جو اس کے دل میں آئے تو یقیناً معاشرے میں انتشار، بدامنی اور منفی جذبات کا فروغ ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اور دیگر الہامی تعلیمات نے انسان کو آزادی اور سچائی کے ساتھ جینے کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ حکمت، بصیرت اور اخلاقیات کا دامن بھی تھامنے کا حکم دیا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو انسان کو سچائی اور حقیقت پسندی کا حکم ضرور دیا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سکھایا گیا ہے کہ سچ کہنے کا طریقہ اور وقت بھی اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے " :وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا "یعنی"لوگوں سے بھلے انداز

میں بات کرو۔" اس آیت سے یہ اصول واضح ہوتا ہے کہ سچائی کی تبلیغ اور اظہار میں حسنِ اخلاق اور نرمی کو اپنانا ضروری ہے، تاکہ سچائی بگاڑ اور تصادم کا سبب نہ بنے بلکہ اصلاح کا ذریعہ بنے۔

نبی اکرمؐ کی سیرت میں ہمیں بے شمار مثالیں ملتی ہیں جہاں آپؐ نے سچائی اور انصاف پر مبنی گفتگو کو نہایت حکمت اور بصیرت کے ساتھ پیش کیا، تاکہ وہ لوگوں کے دلوں میں اتر سکے۔ آپؐ نے فرمایا" : جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، وہ یا تو اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔ "اس فرمان میں وہ اصولی گائیڈ لائن موجود ہے جو سچائی اور سماجی استحکام کے درمیان ایک متوازن راستہ فراہم کرتی ہے۔

اسی طرح، امام علیؑ نے بھی حق گوئی کی تلقین کی، لیکن اس کے ساتھ تدبر، مصلحت اور حالات کے ادراک کو بھی ضروری قرار دیا۔ آپؑ کا قول ہے" : ہر سچ کہنے والا عقل مند نہیں ہوتا۔ "**اس** سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سچائی اگرچہ ایک اعلیٰ صفت ہے، مگر اسے بیان کرنے کے لیے حکمت اور موقع شناسی بھی ضروری ہے۔ وہ سچ جو نرمی اور اخلاق کے بغیر کہہ دیا جائے، وہ بسا اوقات اصلاح کے بجائے فساد کا باعث بن جاتا ہے۔

علم نفسیات بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے کہ ہر خیال اور ہر جذبہ فوری طور پر ظاہر کر دینا ہمیشہ مثبت نتائج پیدا نہیں کرتا۔ اگر کوئی شخص اپنے تمام خیالات اور احساسات بے روک ٹوک دوسروں پر ظاہر کرنے لگے تو اس سے تعلقات میں کشیدگی اور معاشرتی انتشار بڑھ سکتا ہے۔ جدید نفسیاتی تحقیق ہمیں سکھاتی ہے کہ خود اظہاری (Self-Expression)

اور خود ضبطی (Self-Control) کے درمیان ایک متوازن رویہ اپنانا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص محض اپنی ذاتی سچائی کو ہر حال میں فوقیت دے اور دوسروں کے جذبات و احساسات کا خیال نہ رکھے تو وہ معاشرتی ربط و تعلقات کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

لہٰذا، حقیقت پسندی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ہر وقت، ہر جگہ اور ہر شخص کے سامنے بلا جھجک اور بغیر سوچے سمجھے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ بلکہ حقیقت پسندی اس بات کا نام ہے کہ انسان اپنے اصولوں پر قائم رہے، سچائی کو اپنائے، مگر ساتھ ہی ساتھ حکمت اور اخلاق کے تقاضوں کو بھی مد نظر رکھے۔ بہترین راستہ وہی ہے جو قرآن، حدیث اور نفسیات کے اصولوں کے مطابق ہو، یعنی سچائی کو اخلاقِ حسن، نرمی اور تدبر کے ساتھ بیان کیا جائے تاکہ وہ اصلاح اور خیر کا سبب بنے، نہ کہ فتنہ و فساد کا۔

سختی و جبر انسان کو منافق وریاکار بنادیتا ہے

سختی اور جبر کے اثرات انسان کی شخصیت پر گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ جب انسان کو مسلسل دباؤ یازبردستی کا سامنا کرنا پڑے تو اس کی فطری آزادی، خود اعتمادی اور صداقت متاثر ہوتی ہے۔ یہ کیفیت آہستہ آہستہ انسان کو ایسے رویے اپنانے پر مجبور کر دیتی ہے جو منافقت اور ریاکاری کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ظاہری طور پر وہ احکامات کی پیروی کرتا دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کا دل ان کی گہرائی میں یقین نہیں رکھتا۔ یہ رویہ نہ صرف انفرادی طور پر نقصان دہ ہے بلکہ معاشرتی اقدار اور تعلقات کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

سختی اور جبر کا انسان کی نفسیات پر گہرا اثر پڑتا ہے، جو بالآخر منافقت اور دو عملی جیسے رویوں کو جنم دیتا ہے۔ جب کسی فرد پر مسلسل دباؤ ڈالا جاتا ہے اور اسے اپنی رائے یا احساسات کے آزادانہ اظہار کی اجازت نہیں دی جاتی، تو اس کی شخصیت میں ایک واضح تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی اصل سوچ اور جذبات کو چھپانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ظاہری طور پر وہی ظاہر کرتا ہے جو جبر کرنے والا چاہتا ہے، لیکن اندرونی طور پر اس کے خیالات اور احساسات کچھ اور ہوتے ہیں۔

جبر اور سختی کی فضا میں پلنے والا انسان عموماً دو طرح کے ردِ عمل دیتا ہے۔ یا تو وہ مکمل طور پر اطاعت گزار بن جاتا ہے، لیکن اس کی اطاعت میں خلوص نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف حالات

کے تحت مجبور ہو کر یہ روش اپناتا ہے۔ جیسے ہی اسے آزادی یا موقع ملے، وہ اپنی اصل فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے، جو اکثر بغاوت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ منافقت اختیار کر لیتا ہے، جہاں اس کا ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ وہ بظاہر خود کو فرماں بردار اور تابع دار ثابت کرتا ہے، لیکن درحقیقت وہ اپنے اندر ایک ایسی دنیا بسا لیتا ہے جہاں وہ خود کو آزاد تصور کرتا ہے۔

جب انسان کو مسلسل دباؤ اور سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو اس کے اندر ایک نفسیاتی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ خود کو سماج اور اپنے اصل خیالات کے درمیان ایک جنگ میں محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ اپنے خیالات اور جذبات کا کھل کر اظہار کرے تو اسے سزا یا مخالفت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، اور اگر وہ ظاہری طور پر حالات کے مطابق خود کو ڈھالے تو وہ اپنے ضمیر کے خلاف چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کشمکش میں وہ ایک ایسا طرزِ عمل اپناتا ہے جو اسے بقا کی ضمانت دے، اور یہی طرزِ عمل اکثر نفاق کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

یہ رویہ نہ صرف فرد کی اپنی شخصیت کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ پورے معاشرتی نظام میں بھی عدم توازن پیدا کر دیتا ہے۔ سخت قوانین اور جبر کے ذریعے جب کوئی فرد یا معاشرہ اصلاح کی کوشش کرتا ہے، تو اس کا نتیجہ عموماً دوہری شخصیت، خوف اور جھوٹ کی صورت میں نکلتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جہاں زبردستی اصلاح کی کوشش کی گئی، وہاں یا تو لوگ بغاوت پر اتر آئے یا انہوں نے بظاہر احکام مان لیے لیکن اندرونی طور پر ان کے خلاف نفرت اور مزاحمت کے جذبات پالتے رہے۔

نرمی، محبت اور حکمت وہ طریقے ہیں جو انسان کی اصل شخصیت کو سنوارنے میں مدد دیتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں بھی ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ جہاں بھی اصلاح کا معاملہ درپیش ہوا، وہاں نرمی اور محبت سے کام لیا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی سیرت میں ہمیں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں جہاں برائی کے خلاف سختی کرنے کے بجائے حکمت اور نرم رویہ اختیار کیا گیا، اور اس کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں حقیقی تبدیلی آئی۔ یہی وجہ ہے کہ نصیحت کا مقصد لوگوں کو شرمندہ کرنا یا ان پر زبردستی اپنی بات منوانا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ حکمت، نرمی اور محبت کے ذریعے دلوں کو جیتنا اور انسان کو حقیقتاً نیکی کی طرف مائل کرنا اصل کامیابی ہے۔

سختی اور جبر کا نتیجہ اکثر نفاق کی صورت میں نکلتا ہے، کیونکہ یہ انسان کے خلوص اور سچائی کو دبا دیتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں سختی کو اصلاح کا ذریعہ سمجھا جاتا ہو، وہاں لوگ ظاہری طور پر تو تابع نظر آسکتے ہیں، لیکن اندرونی طور پر وہ یا تو بغاوت پر آمادہ ہوتے ہیں یا نفاق کے شکار ہو جاتے ہیں۔ حقیقی اصلاح کے لیے محبت، نرمی اور حکمت کا راستہ اپنانا ضروری ہے، کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جو انسان کے دل میں حقیقی تبدیلی لاتا ہے اور اسے سچائی اور خلوص کی طرف لے جاتا ہے۔

یہی اصول حکومتوں، انتظامیہ اور مذہبی رہنماؤں کے طرز عمل پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اگر قوانین یا اخلاقی اصولوں کے نفاذ میں نرمی اور حکمت سے کام نہ لیا جائے تو عوام میں

مزاحمت پیدا ہو سکتی ہے۔ انسان فطرتاً محبت اور نرمی سے متاثر ہوتا ہے، جبکہ سختی اسے یا تو ضد میں مبتلا کر دیتی ہے یا پھر اس کے اندر ایک پوشیدہ باغی پیدا کر دیتی ہے۔

قرآن اور احادیث ہمیں یہ درس دیتے ہیں کہ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعے اصلاح کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی زندگیوں میں ہمیں یہ اصول بار بار نظر آتا ہے کہ وہ برائیوں کو ختم کرنے کے لیے نرم دلی اور صبر کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بعض اوقات، اگر کوئی شخص یا قوم اصلاح کے لیے تیار نہ ہوتی، تو وہ سختی کے بجائے خاموشی اختیار کرتے تھے تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت اور احترام قائم رہے۔

اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہر موقع پر برائی کو روکنا ضروری نہیں ہوتا۔ بعض حالات میں برائی کو نظر انداز کرنا زیادہ مناسب ہو سکتا ہے تاکہ کوئی بدگمانی یا دوری پیدا نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نصیحت کرنے کا انداز ایسا ہو جو دل کو چھو لے، انسان کے اندر خلوص پیدا کرے اور اسے نیکی کی طرف راغب کرے، نہ کہ اسے مزید دور کر دے۔ نصیحت کا مقصد اصلاح ہے، نہ کہ لوگوں کو شرمندہ یا متنفر کرنا۔

اسلامی تعلیمات ہمیں اعتدال، نرمی اور حکمت کا راستہ دکھاتی ہیں۔ لہٰذا، اگر ہم واقعی معاشرے میں برائیوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو نیکی کی طرف لانا چاہتے ہیں تو

ہمیں اپنے الفاظ اور رویے میں محبت، صبر اور حکمت کو شامل کرنا ہو گا۔ سختی اور جبر کے بجائے محبت اور خلوص وہ راستہ ہے جو انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔

شعور عُمر کا محتاج نہیں ہوتا

عمر کا بڑھ جانا لازمی طور پر عقل و شعور اور پختگی کی ضمانت نہیں دیتا، کیونکہ ذہنی اور فکری بالیدگی کا تعلق صرف گزرتے ہوئے وقت سے نہیں بلکہ تجربات، سیکھنے کی صلاحیت، حالات سے نبرد آزما ہونے کی استعداد، اور شعوری ارتقا سے ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ سالہا سال جیتے ہیں، مگر ان کی سوچ اور فہم ایک محدود دائرے میں مقید رہتی ہے، جبکہ کچھ لوگ کم عمری میں بھی ایسی سمجھداری اور بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہیں جو بڑی عمر کے افراد میں بھی نظر نہیں آتی۔

حقیقی پختگی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنی غلطیوں سے سیکھے، اپنے جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا کرے، دوسروں کے نظریات کو احترام دے، اور ہر معاملے میں حکمت اور بردباری کا مظاہرہ کرے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص عمر میں بڑا ہو، وہ لازمی طور پر زیادہ سمجھدار ہو، کیونکہ بعض اوقات زندگی کی مشکلات اور تجربات کسی نوجوان کو وہ شعور اور ادراک عطا کر دیتے ہیں جو کئی دہائیوں کی زندگی گزارنے کے باوجود کچھ افراد حاصل نہیں کر پاتے۔

اسلامی تعلیمات بھی ہمیں یہی درس دیتی ہیں کہ عقل و دانش کا دارومدار صرف عمر پر نہیں بلکہ علم، تقویٰ اور تجربے پر ہوتا ہے۔ قرآن میں حضرت لقمانؑ کی حکمت کو ایک مثال کے

طور پر پیش کیا گیا ہے، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حقیقی دانائی وہی ہے جو انسان کی سوچ اور عمل میں نظر آئے، نہ کہ صرف عمر کے سالوں میں۔ اسی طرح امام علیؑ کا فرمان ہے کہ عقل تجربات سے حاصل ہوتی ہے، اور تجربہ وہی کرتا ہے جو سیکھنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں کئی نوجوانوں نے اپنے فہم و فراست سے ایسے فیصلے کیے جو بہت سے عمر رسیدہ افراد بھی نہ کر سکے۔

اگر کوئی شخص عمر کے اضافے کو ہی پختگی کی علامت سمجھ کر اپنی عقل کو استعمال نہ کرے اور سیکھنے کی جستجو نہ رکھے، تو وہ ظاہری طور پر بڑا ہونے کے باوجود اندرونی طور پر ناپختہ ہی رہے گا۔ جبکہ جو شخص اپنی ہر غلطی کو سیکھنے کا ذریعہ بنائے، اپنی سوچ کو وسعت دے، اور معاملات میں گہرائی سے غور کرے، وہ چاہے کم عمر ہی کیوں نہ ہو، حقیقی معنوں میں باشعور اور بالغ نظر بن جاتا ہے۔

باشعور اور بالغ نظری کی سب سے نمایاں مثالیں ہمیں تاریخ، معاشرت اور روزمرہ زندگی میں ملتی ہیں۔ حضرت علیؑ کی زندگی حکمت اور شعور کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ آپؑ کی دانشمندی صرف الفاظ تک محدود نہیں تھی بلکہ آپ کے فیصلے، معاملات کی گہرائی میں جا کر دیکھنے کی صلاحیت، اور مشکلات میں صبر و حکمت سے کام لینا حقیقی بالغ نظری کا مظہر تھا۔ جب ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ عقل کیا ہے، تو آپؑ نے فرمایا: "ہر چیز کو اس کی حقیقت کے مطابق رکھنا۔ "یعنی باشعور انسان وہی ہوتا ہے جو چیزوں کو محض سطحی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ اس کے پس منظر اور نتائج کو بھی سمجھتا ہے۔

تاریخ میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی علمی بصیرت بھی بالغ نظری کی مثال ہے۔ آپؑ نے ایسے نظریات اور اصول پیش کیے جو اس وقت کے معاشرے کے لیے انقلابی تھے اور آج بھی سائنسی و فکری ترقی کی بنیاد بنتے ہیں۔ اسی طرح، نوجوانانِ کربلا جیسے حضرت قاسمؑ اور حضرت علی اکبرؑ کی مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ کم عمری کے باوجود اگر انسان حقیقت کو سمجھنے، قربانی دینے اور حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو وہ باشعور اور بالغ نظر کہلاتا ہے۔

معاشرتی زندگی میں بھی باشعور افراد وہ ہوتے ہیں جو جلد بازی سے فیصلے نہیں کرتے، ہر معاملے میں انصاف اور دیانت کو مد نظر رکھتے ہیں، اور جذباتی ردِ عمل دینے کے بجائے عقلی اور حکمت پر مبنی طرزِ عمل اپناتے ہیں۔ ایسے افراد دوسروں کے نظریات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اختلاف کو دشمنی میں نہیں بدلنے دیتے، اور ہر معاملے کو حقیقت پسندانہ زاویے سے دیکھتے ہیں۔

باشعور اور بالغ نظری کے حصول کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلے، علم حاصل کرنا اس کا بنیادی ذریعہ ہے۔ جو شخص سیکھنے کی جستجو رکھتا ہے، تحقیق کرتا ہے، اور مختلف خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ زیادہ سمجھدار بنتا ہے۔ تجربات بھی اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، کیونکہ ہر تجربہ ایک نئی بصیرت دیتا ہے، بشرطیکہ انسان اس سے سبق حاصل کرے۔ خود احتسابی بھی ایک ضروری عنصر ہے، یعنی اپنی غلطیوں پر غور کرنا، اپنی کمزوریوں کو پہچاننا اور انہیں دور کرنے کی کوشش کرنا۔

روحانی تربیت اور اللہ سے تعلق بھی بالغ نظری پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جو شخص دین کی گہرائی کو سمجھتا ہے اور اپنی زندگی کو صرف مادی فوائد کے بجائے اخلاقی و روحانی ترقی کے لیے وقف کرتا ہے، وہ زیادہ باشعور ہوتا ہے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: "جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔" یعنی خود شناسی اور اپنے اندر غور و فکر کرنا، شعور کو بڑھاتا ہے۔

اسی طرح، صبر اور برداشت بھی بالغ نظری کے بنیادی اسباب میں شامل ہیں۔ جلد بازی، غصہ اور بے صبری ناپختگی کی علامات ہیں، جبکہ تحمل، بردباری اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنا دانشمندی کی نشانی ہے۔ جو شخص ہر حال میں جذبات کو قابو میں رکھ کر سوچتا اور عمل کرتا ہے، وہ حقیقی معنوں میں باشعور اور بالغ نظر کہلاتا ہے۔

باشعور اور بالغ نظری کا حصول محض عمر کے اضافے سے ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے علم، تجربہ، خود احتسابی، صبر، اور روحانی تربیت ضروری ہے۔ حقیقی شعور اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنی ذات کا گہرا مشاہدہ کرے، اپنی غلطیوں سے سیکھے، اور زندگی کے معاملات کو حکمت و تدبر کے ساتھ سمجھے۔ جو لوگ صرف اختلافات پر توجہ دیتے ہیں اور دوسروں کو بدلنے میں اپنی توانائیاں صرف کرتے ہیں، وہ ہمیشہ بے چینی اور اضطراب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کے برعکس، جو لوگ مشترکہ خوبیوں کو نکھارنے پر توجہ دیتے ہیں، وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے سکون اور بہتری کا باعث بنتے ہیں۔

انسان جب فطرتِ سلیمہ کے مطابق پیشہ یا طرزِ زندگی اختیار کرتا ہے، تو اس کے اندر ذہنی اور روحانی سکون پیدا ہوتا ہے، اور وہ ایک طویل، متوازن اور بامقصد زندگی گزارتا ہے۔ لیکن جو شخص ناپسندیدہ کام یا ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے، وہ ہمیشہ ذہنی دباؤ، بے چینی اور اضطراب میں مبتلا رہتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی زندگی قلیل اور مشکلات سے بھرپور ہو جاتی ہے۔ حقیقی کامیابی اسی میں ہے کہ انسان اپنی توانائی ان امور پر صرف کرے جو مثبت اور تعمیری ہوں، تاکہ نہ صرف اس کی اپنی زندگی سنورے بلکہ دوسروں کے لیے بھی فائدہ مند ثابت ہو۔

عبادات اور دینی احکام: وسیلہ یا مقصد؟

اسلام میں عبادات اور احکام کو ایک وسیلہ قرار دیا گیا ہے، جو انسان کو اس کے حقیقی مقصد یعنی قربِ الٰہی اور رضائے الٰہی تک پہنچاتے ہیں۔ اگر ان وسیلوں کو ہی مقصود بنا لیا جائے تو انسان اپنے اصل ہدف سے بھٹک جاتا ہے اور شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح طور پر فرمایا: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" (المائدہ: 35)۔ اس آیت میں وسیلے کو مقصد نہیں بلکہ ذریعہ قرار دیا گیا ہے، جس کے ذریعے انسان فلاح تک پہنچ سکتا ہے۔

نماز، روزہ، حج، زکات، خمس، جہاد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تولا اور تبرا جیسے احکام فروعِ دین میں شامل ہیں، جو انسان کی روحانی، سماجی اور اخلاقی ترقی کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "الصَّلَاةُ قُرْبَانُ كُلِّ تَقِيٍّ" یعنی نماز ہر متقی کے لیے قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ نماز بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ اللہ سے قربت کا وسیلہ ہے۔ اسی طرح، امام علیؑ فرماتے ہیں: "إِنَّكُمْ إِنْ لَمْ تَعْمَلُوا لِلْآخِرَةِ لَمْ تَكُنْ دُنْيَاكُمْ تَضُرُّ بِكُمْ عَلَى خَيْرٍ" یعنی اگر تم آخرت کے لیے عمل نہ کرو تو تمہاری دنیا بھی تمہارے لیے خیر و برکت والی نہیں ہو گی۔ اس قول میں عبادات اور دینی احکام کو اس نظر سے دیکھنے

کی ترغیب دی گئی ہے کہ ان کا نتیجہ صرف دنیاوی فوائد تک محدود نہ ہو، بلکہ آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنے۔

ان عبادات کا نفسیاتی پہلو بھی بہت اہم ہے۔ نماز انسان کے شعور میں ایک مسلسل خود احتسابی اور بندگی کی کیفیت پیدا کرتی ہے، جو اسے غرور و تکبر سے محفوظ رکھتی ہے۔ روزہ نفس کی تربیت کرتا ہے، خواہشات پر قابو پانے کی قوت عطا کرتا ہے اور صبر و استقامت سکھاتا ہے۔ حج اجتماعیت کا درس دیتا ہے اور انسان کو مساوات و اخوت کی عملی مشق سکھاتا ہے۔ زکات اور خمس مالی ایثار اور سماجی عدل کی بنیاد فراہم کرتے ہیں، جو معاشرے میں طبقاتی تقسیم کے خاتمے اور اجتماعی فلاح کے لیے ضروری ہیں۔ جہاد ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جو صرف جنگ تک محدود نہیں بلکہ ہر وہ جدوجہد جو حق کے قیام اور باطل کے خاتمے کے لیے ہو، اس میں شامل ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک ذمہ داری ہے، جو معاشرتی اصلاح کے لیے ناگزیر ہے۔ تولا اور تبرا قلبی اور عملی سطح پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کو واضح کرتے ہیں، تاکہ انسان اپنے عقائد و نظریات میں کسی شک و شبہ کا شکار نہ ہو۔

اسی طرح تلاوتِ قرآن، دعا، توسل، عزاداری اور دیگر اسلامی ثقافتی رسمیں اور شعائر بھی وسیلہ ہیں جو انسان کو دین کی روح تک پہنچنے اور واجباتِ دین کی انجام دہی کی طرف رغبت دلانے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ قرآن کی تلاوت اللہ کے کلام سے جُڑنے اور ہدایت کے نور کو اپنے قلب میں جگہ دینے کا ذریعہ ہے۔ دعا بندے اور خدا کے درمیان ایک روحانی پل ہے، جو اللہ پر مکمل بھروسے اور اس کی رحمت کی امید کو مضبوط کرتا ہے۔ توسل

اہلِ بیتؑ کی سیرت اور ان کے وسیلے سے اللہ کے قرب کو طلب کرنے کا ایک ذریعہ ہے، جو انسان کے اندر اخلاص اور توکل کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ عزاداری سید الشہداء امام حسینؑ کی قربانی کو یاد رکھنے اور ظلم کے خلاف قیام کے عزم کو زندہ رکھنے کا ایک عظیم ذریعہ ہے، جو ایمان کی تازگی اور روحانی بیداری پیدا کرتی ہے۔

تھوڑا کھلے الفاظ میں دینی حکومت کیلئے فروع دین کو سبب کے طور پر دیکھا جائے تو سمجھ آتا ہے کہ کس طرح یہ فروعات حکومت دینی اور پھر الٰہی رضا کے حصول میں معاون ہے۔ فروعِ دین، جو اسلام کے عملی پہلو کو بیان کرتے ہیں، نہ صرف فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ ایک مضبوط، باشعور اور بیدار معاشرہ تشکیل دینے میں بھی بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ جب ایک مسلمان ان فرائض کو شعوری طور پر اپناتا ہے تو اس کی نفسیات ایسی تربیت حاصل کرتی ہے جو اسے دشمن کی سازشوں سے محفوظ رکھتے ہوئے ایک عالمی عادلانہ نظامِ حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کا اہل بناتی ہے۔

نماز فرد کے اندر خود احتسابی، ضبطِ نفس اور روحانی بیداری پیدا کرتی ہے، جس کے ذریعے وہ کسی بھی باطل نظریے یا فکری یلغار کا شکار ہونے سے بچتا ہے۔ روزہ انسان کو خواہشات پر قابو پانے اور مشکلات میں صبر و استقامت اختیار کرنے کی تربیت دیتا ہے، جو دشمن کی سازشوں اور آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے کے لیے ضروری ہے۔ زکوٰۃ اور خمس جیسے مالی واجبات ایک فرد کی ذہنیت کو ایثار و قربانی کی طرف مائل کرتے ہیں، جس سے وہ اجتماعی

بہبود اور ایک ایسے اقتصادی نظام کے قیام کے لیے کام کرتا ہے جو ظلم و استحصال سے پاک ہو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم ایک ایسی نفسیاتی اور سماجی مزاحمت پیدا کرتا ہے جو ظلم و ناانصافی کے خلاف جدوجہد کو ناگزیر بنا دیتی ہے۔ جب ایک قوم ان احکام پر عمل پیرا ہوتی ہے تو اس میں فکری بیداری اور اجتماعی شعور پیدا ہوتا ہے، جو کسی بھی استعماری یا طاغوتی قوت کی ذہنی و عملی غلامی قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اسی طرح جہاد، جو ہر قسم کی باطل قوتوں کے خلاف کھڑے ہونے کا درس دیتا ہے، افراد کے اندر خوف کو ختم کر کے انہیں ایک عادلانہ نظام کے قیام کے لیے متحرک اور بے باک بناتا ہے۔

تولّی اور تبرّی کی تعلیمات ایک ایسی نظریاتی بصیرت عطا کرتی ہیں جو فرد کو دوست اور دشمن کی پہچان عطا کرتی ہے۔ جب کوئی شخص اور معاشرہ حق کے حامیوں سے محبت اور باطل کے پیروکاروں سے بیزاری کو ایمان کا حصہ سمجھتا ہے تو اس میں استعماری قوتوں کی چالوں کو سمجھنے اور ان کا توڑ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

یہ تمام احکام ایک فرد اور سماج کی نفسیات کو اس انداز میں تیار کرتے ہیں کہ وہ دشمن کی ہر فکری اور عملی یلغار کا سامنا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی، وہ اپنے اندر ایک ایسا انقلابی شعور پیدا کرتا ہے جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک عادلانہ نظام کے قیام کی جدوجہد کو ضروری سمجھتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جو اسلامی معاشروں کو ظلم، ناانصافی اور

استبداد سے نجات دلا کر عدل و انصاف پر مبنی عالمی حکومت کی راہ ہموار کرتی ہے، جو امام مہدی (عج) کے عادلانہ نظام کی تیاری کا عملی مرحلہ بھی ہے۔

اگر ان عبادات کو محض رسمی اور روایتی اعمال کی حیثیت سے انجام دیا جائے تو یہ اپنی روحانی تاثیر کھو دیتی ہیں۔ امام حسینؑ نے فرمایا: "إِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْإِصْلَاحِ فِي أُمَّةِ جَدِّي، أُرِيدُ أَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ" یعنی میرا قیام صرف اس لیے ہے کہ میں امتِ محمدیہ میں اصلاح کروں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انجام دوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں عملی جدوجہد کا عنصر کتنا اہم ہے اور کس طرح اسلامی احکام کا اصل مقصد سماجی اصلاح اور اللہ کی رضا ہے، نہ کہ محض اعمال کا ظاہری پہلو۔

عقل بھی اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ وسیلہ کو مقصد بنالینا ایک فکری مغالطہ ہے۔ اگر کوئی شخص طبی تعلیم حاصل کرے لیکن اس کا مقصد محض ڈگری کا حصول ہو، نہ کہ خدمتِ خلق، تو اس کا علم بیکار ہو جائے گا۔ اسی طرح، اگر کوئی عبادات کو محض ایک رسم کے طور پر انجام دے اور اس کے اثرات اس کی شخصیت میں ظاہر نہ ہوں، تو وہ اپنے مقصد سے محروم رہ جائے گا۔ امام زین العابدینؑ کی دعا میں ملتا ہے: "اللهم لا تجعل مصيبتي في ديني" یعنی اے اللہ! میرے دین میں مجھے مصیبت میں مبتلا نہ کرنا۔ اس دعا میں دین کے اصل مقصد کو کھونے کو سب سے بڑی مصیبت قرار دیا گیا ہے۔

لہٰذا یہ حقیقت سمجھنا ضروری ہے کہ فروعِ دین اور اسلامی شعائر وہ ذرائع ہیں جو ہمیں اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی تک لے جانے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اگر ان وسیلوں کو ہی

مقصد بنالیا جائے تو انسان دین کے اصل روحانی اور فکری پہلو کو نظر انداز کر بیٹھتا ہے۔ جو بھی وسیلے کو مقصد بنالیتا ہے، وہ اپنے فکری اور عملی راستے میں بھٹک جاتا ہے اور حقیقی کامیابی سے محروم ہو جاتا ہے۔ وسیلے کو وسیلہ ہی رہنے دیں اور اصل مقصد یعنی قربِ الٰہی اور نظامِ عدل کے قیام کے لیے اپنی توانائیاں صرف کریں۔

اسلام میں عبادات اور دینی احکام کو وسیلہ قرار دیا گیا ہے، نہ کہ مقصد۔ انسان کی حقیقی منزل اللہ کا قرب اور اس کی رضا ہے، اور یہ تمام اعمال اس تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ ذرائع ہی مقصد بن جائیں تو انسان اپنے اصل ہدف سے بھٹک جاتا ہے۔ قرآن مجید میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو۔ اس کا مطلب ہے کہ وسیلہ محض ایک ذریعہ ہے، نہ کہ منزل۔

ہماری موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہم شعائر میں ہی مصروف رہتے ہیں، یا پھر عبادات کو ہی اپنا ہدف بنالیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تقویٰ کے حصول کی کوشش کرتے ہیں، مگر یہ جامعیت نہیں رکھتے جو ظہور امامؑ کے لیے ضروری ہے۔ عالمی نظام عدل کے قیام کے لیے عملی کوشش ہونی چاہیے اور اس حکومت کو بھی رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھنا چاہیے۔ ہم چھوٹے چھوٹے مقاصد بنا کر وسیلوں کو ہی ہدف سمجھ لیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ سوچ بدلنی ہو گی تا کہ دین کے اصل مقصد، یعنی اللہ کی رضا اور عالمی نظامِ عدل کے قیام کی طرف سفر کیا جاسکے۔

اگر ہم دین کو اس کے اصل ہدف یعنی قربِ الٰہی اور نظامِ عدل کے قیام سے ہٹا دیں اور محض وسیلوں کو ہی ہدف بنا لیں، تو اس کے کئی سنگین نقصانات ہوں گے۔ سب سے پہلے، دین کی روحانی گہرائی ختم ہو جائے گی، اور عبادات محض رسمی اور روایتی اعمال کی صورت اختیار کر لیں گی، جن میں اخلاص اور اثر پذیری کی کمی ہو گی۔ یہ صورتحال انسان کو ایسی عبادات میں مشغول کر دے گی جو اس کی زندگی اور کردار میں حقیقی تبدیلی نہیں لاتیں، بلکہ صرف ایک مذہبی رسم کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔

اس رویے کا ایک اور نقصان یہ ہو گا کہ لوگ دین کے عملی اور سماجی پہلو سے غافل ہو جائیں گے، جس کے نتیجے میں معاشرتی عدل، اخلاقی اصلاح، اور حقیقی اسلامی طرزِ حیات پسِ پشت چلا جائے گا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے فرائض نظر انداز ہو جائیں گے، اور امت محض ظاہری عبادات میں سکون تلاش کرے گی، جبکہ ظلم، ناانصافی، اور برائیوں کے خلاف جدوجہد ترک کر دی جائے گی۔ جب دین کا اصل ہدف بھلا دیا جائے تو امت جمود کا شکار ہو جاتی ہے اور عملی جدوجہد سے کترانے لگتی ہے، جس کے نتیجے میں ظلم کو ختم کرنے کے بجائے اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جاتا ہے۔

ایسی سوچ کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ افراد اور معاشرے میں ایک قسم کی خود ساختہ دینداری پروان چڑھتی ہے، جس میں انسان عبادات کی ظاہری ادائیگی کو ہی اپنی نجات کے لیے کافی سمجھنے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرتی ذمہ داریوں، حقوق العباد، اور عدل و انصاف کے قیام جیسے بنیادی دینی اصول پسِ پشت چلے جاتے ہیں۔ اس رویے کے

تحت لوگ اپنے کردار کی اصلاح سے زیادہ عبادات کی کثرت پر توجہ دینے لگتے ہیں، حالانکہ قرآن اور احادیث بارہا یہ واضح کرتے ہیں کہ اصل کامیابی اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گزارنے میں ہے، نہ کہ محض رسمی عبادات کے انبار لگانے میں۔

جب وسیلوں کو ہی مقصد بنا لیا جائے تو امت میں فرقہ واریت، تعصبات اور غیر ضروری اختلافات جنم لیتے ہیں، کیونکہ لوگ دین کے حقیقی پیغام پر غور کرنے کے بجائے ظاہری اعمال اور عبادات کے طریقوں پر الجھ جاتے ہیں۔ نتیجتاً، دین ایک عملی نظام کے بجائے محض رسومات اور عقائد کی بحثوں میں محدود ہو جاتا ہے، اور مسلمان آپس میں الجھ کر اپنی اجتماعی قوت کھو بیٹھتے ہیں۔

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ امام زمانہؑ کے ظہور کے لیے جو فکری، روحانی، اور سماجی تیاری درکار ہے، وہ متاثر ہوتی ہے۔ اگر امت ظہورِ امامؑ کے عالمی مشن کو سمجھنے کے بجائے صرف ظاہری عبادات میں مصروف رہے گی، تو وہ اس عظیم الٰہی انقلاب کے لیے مطلوبہ عملی اقدامات نہیں کر سکے گی۔ نتیجتاً، مسلمانوں کی اجتماعی کوششیں بکھر جائیں گی اور وہ اپنے حقیقی ہدف، یعنی عدل و انصاف کے قیام سے غافل ہو جائیں گے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ دین کو اس کے اصل مقصد، یعنی قربِ الٰہی، نظامِ عدل کے قیام، اور انسان کی فکری و عملی اصلاح کی طرف واپس لایا جائے۔ وسیلوں کو ان کے اصل مقام پر رکھا جائے اور انہیں منزل سمجھنے کی غلطی سے بچا جائے، تاکہ دین کی حقیقی روح برقرار رہے اور امت ایک جامع اسلامی طرزِ حیات کی طرف سفر کر سکے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی وسیلوں کو ہدف بنالیا گیا اور دین کے اصل مقصد کو پس پشت ڈال دیا گیا، امتِ مسلمہ کو ناقابلِ تلافی نقصانات اٹھانے پڑے۔ ایک واضح مثال جنگِ صفین کی ہے، جہاں لشکرِ امام علیؑ حق پر تھا، مگر جب دشمن نے قرآن کے اوراق نیزوں پر بلند کیے تو بعض کمزور فہم افراد نے وسیلے کو اصل ہدف سمجھ لیا۔ وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ اصل ہدف قرآن کی تعلیمات اور اس کا عدل و انصاف پر مبنی نظام ہے، نہ کہ محض کاغذ کے صفحات۔ نتیجتاً، وہ فریب میں مبتلا ہو گئے، امام علیؑ کی حکمت کو چھوڑ کر جنگ روک دی، اور پھر تحکیم کے فریب میں آکر نہ صرف اپنی ہی حکومت کو نقصان پہنچایا بلکہ امت کی اجتماعی قوت کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔

ایک اور تاریخی مثال واقعہ کربلا ہے، جہاں یزیدی حکومت نے دین کو وسیلوں تک محدود کر دیا اور اسلام کے اصل مقصد، یعنی عدل، حق پرستی، اور انسانی وقار کے تحفظ کو ختم کر دیا۔ یزید کا دربار عبادات، اذان، اور ظاہری دینی علامات سے بھرا ہوا تھا، مگر اس کا نظام ظلم، جبر اور فسق و فجور پر مبنی تھا۔ امت کی ایک بڑی تعداد نے دین کو ظاہری رسوم میں قید کر کے حقیقی اسلامی جدوجہد سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اور اسی رویے نے امام حسینؑ جیسے عظیم رہنما کو شہادت پر مجبور کر دیا۔ اگر لوگ سمجھتے کہ دین کا اصل مقصد حق کے قیام اور ظلم کا خاتمہ ہے، تو وہ یزیدی حکومت کے خلاف قیام میں امام حسینؑ کا ساتھ دیتے، مگر وسیلوں کو ہدف بنانے کی غلطی نے انہیں خاموش کر دیا۔

بعد کے ادوار میں بھی یہی غلطی جاری رہی۔ عباسی خلفاء، خاص طور پر ہارون الرشید اور مامون، بظاہر دینی شخصیات کو اپنے دربار میں رکھتے تھے اور اسلامی علوم و فنون کی سرپرستی کا ڈھونگ رچاتے تھے، مگر ان کا طرزِ حکومت ظلم و استبداد پر مبنی تھا۔ لوگوں کی توجہ اصل ہدف، یعنی عادلانہ نظامِ حکومت، سے ہٹادی گئی اور دینی علوم کی سرپرستی اور مساجد کی تعمیر کو ہی کامیابی سمجھ لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علمی ترقی کے باوجود امت عملی طور پر زوال کا شکار رہی، کیونکہ دین کے سماجی اور عدالتی پہلو کو پسِ پشت ڈال دیا گیا تھا۔

اسی طرح برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب بھی یہی تھا کہ وہ دین کو صرف عبادات اور ظاہری رسوم میں محدود کر بیٹھے۔ ایک طرف انگریز سامراج پورے خطے پر قابض ہو رہا تھا، دوسری طرف علماء کی ایک بڑی تعداد مدارس، خانقاہوں، اور ذکر و اذکار کی محافل میں مصروف تھی۔ دین کا اصل ہدف، یعنی ظلم کے خلاف قیام اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ، پسِ پشت چلا گیا۔ کچھ علماء اور رہنماؤں نے مزاحمت کی، مگر اکثریت نے عملی میدان کو ترک کر دیا، اور نتیجتاً مسلمان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے۔

اسی غیر منطقی رویے کی ایک اور مثال خلافتِ عثمانیہ کا زوال ہے۔ یہ خلافت بظاہر دین کا علمبردار تھی، مگر اصل میں اس کا نظام ملوکیت، ناانصافی، اور داخلی کمزوریوں کا شکار تھا۔ جب امت کو قیادت کی ضرورت تھی، تب خلافت محض ظاہری مذہبی علامات پر اکتفا کر رہی تھی، اور اسی وجہ سے یورپی استعمار نے آسانی سے اسے شکست دے دی۔ اگر خلافت

نے اسلام کے اصل اصولوں پر عمل کرتے ہوئے عدل و مساوات کا نظام قائم کیا ہوتا، تو شاید یہ زوال اتنی تیزی سے نہ آتا۔

یہ تمام مثالیں یہی بتاتی ہیں کہ جب وسیلے کو اصل ہدف بنا لیا جائے اور دین کے بنیادی مقاصد یعنی عدل، اصلاح، اور قربِ الٰہی کو نظر انداز کر دیا جائے، تو امت کمزور، منتشر، اور زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ یہی غلطی بار بار دہرائی گئی ہے، اور جب تک امت اپنی فکری غلطیوں کو درست نہیں کرتی، یہ نقصانات جاری رہیں گے۔

عبادات کو مقصدِ حیات سمجھنے کی سوچ بظاہر نیکی اور قربِ الٰہی کا ذریعہ معلوم ہوتی ہے، مگر جب یہ سوچ عملی زندگی میں متوازن نہ رہے تو کئی نقصانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ جدید دور میں، جہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں میں توازن ضروری ہے، وہاں اگر عبادات کو مقصدِ حیات بنا کر دیگر ذمہ داریوں سے غفلت برتی جائے تو فرد اور معاشرہ دونوں متاثر ہو سکتے ہیں۔

اس طرزِ فکر کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان دنیاوی فرائض کو کمتر سمجھنے لگتا ہے اور اپنے معاشرتی، معاشی اور علمی فرائض سے کٹنے لگتا ہے۔ حالانکہ اسلام میں عبادات کا تصور ظاہری طور پر اعمال انجام دے لینے تک محدود نہیں، بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں توازن کا متقاضی ہے۔ اگر عبادات کو مقصد بنالیا جائے اور دین کے دیگر شعبے نظر انداز ہو جائیں تو نتیجتاً فرد اپنی عملی زندگی میں کامیابی کے اصولوں سے دور ہو جاتا ہے، جو کہ اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں۔

اس سوچ کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے عبادات کے حقیقی مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ عبادت محض چند مخصوص اعمال کا نام نہیں بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں اللہ کی رضا کو پیشِ نظر رکھنا ہی اصل بندگی ہے۔ جب کوئی شخص عبادات کو زندگی کی راہنمائی کا ذریعہ بناتا ہے، بجائے اس کے کہ انہیں مقصدِ حیات سمجھے، تو وہ دین اور دنیا کے درمیان ایک متوازن راستہ اختیار کرتا ہے۔ عبادات کا اثر زندگی میں عملاً نظر آنا چاہیے، جس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں کو بھی اسی جذبے کے ساتھ ادا کرے جیسے نماز، روزہ یا دیگر عبادات کو ادا کرتا ہے۔

معاشرتی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم و تربیت میں عبادات کے مقصود کو عملی زندگی سے جوڑا جائے۔ جب عبادت کی حقیقت کو اس کی اصل روح کے ساتھ سمجھا جائے گا تو فرد عبادت کو ایک ذریعہ سمجھ کر اپنی تمام تر توانائیوں کو خیر اور اصلاح کی راہ میں استعمال کرے گا، نہ کہ وہ ایک الگ دنیا بسائے جس میں باقی معاملاتِ زندگی بے معنی محسوس ہوں۔ عبادت کا مقصد اللہ کے قریب ہونا ہے، اور اللہ کے قریب وہی ہوتا ہے جو بندوں کے حقوق ادا کرے، علم حاصل کرے، سماج میں بہتری کے لیے کوشاں رہے اور دین کی روح کو عملی طور پر اپنائے۔

لہٰذا، عبادات کو مقصد بنانے کے بجائے ان کو ایک ذریعے کے طور پر اختیار کرنا ہی درست حکمتِ عملی ہے، جو انسان کو متوازن اور مکمل شخصیت بننے میں مدد دیتی ہے۔ اس سے فرد کی ذاتی زندگی، معاشرتی کردار اور دین سے تعلق سب مضبوط ہوتے ہیں اور عبادات حقیقی

معنوں میں انسان کو اللہ کے قریب لے جاتی ہیں، نہ کہ اسے عملی دنیا سے کاٹ کر محض رسمی اعمال تک محدود کر دیتی ہیں۔

غلامی کی زنجیر کی بنیادی کڑی

جدید غلامی کی پوری عمارت جس بنیادی ستون پر کھڑی ہے، وہ تعلیم اور ذہنی کنٹرول کا شعبہ ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے باقی تمام شعبہ جات میں غلامی کو حقیقت بنایا جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کی تعلیم اور ذہنی تربیت کو ایک خاص سمت میں موڑ دیا جائے تو وہ خود بخود استحصالی نظام کا حصہ بن جاتی ہے، چاہے اسے اس نظام کی حقیقت کا شعور ہو یا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ استعماری قوتیں سب سے زیادہ سرمایہ اور محنت اسی میدان میں خرچ کرتی ہیں تاکہ غلامی کو شعوری طور پر قبول کروایا جا سکے اور افراد کو اس حد تک مجبور کر دیا جائے کہ وہ جانتے ہوئے بھی اس سے نکلنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

تعلیم کو ایسے مرتب کیا جاتا ہے کہ یہ ایک آزاد، خود مختار، اور تخلیقی ذہن پیدا کرنے کے بجائے ایک ایسا ذہن تشکیل دے جو پہلے سے بنائے گئے نظریاتی اور عملی ڈھانچوں میں خود کو فٹ کرنے پر مجبور ہو۔ جدید تعلیمی نظام میں ایسے نصاب اور تربیتی ماڈلز شامل کیے جاتے ہیں جو تنقیدی سوچ کو دبانے، استعماری بیانیے کو تقویت دینے، اور طالب علم کو محض ایک کارپوریٹ یا ریاستی مشین کا پرزہ بنانے پر مرکوز ہوتے ہیں۔ تعلیم کے ذریعے نہ صرف تاریخ کو مسخ کیا جاتا ہے بلکہ مستقبل کے امکانات کو بھی ایک محدود دائرے میں قید کر دیا

جاتا ہے، جہاں افراد کو یہی باور کروایا جاتا ہے کہ دنیا کا موجودہ نظام ہی واحد ممکنہ نظام ہے اور اس سے باہر کچھ سوچنا یا کرنا ناممکن ہے۔

ذہنی کنٹرول کا ایک اور بڑا ذریعہ میڈیا اور سوشل میڈیا ہے، جو تعلیم سے جڑے ہوئے افراد کو مسلسل ایک مخصوص بیانیے میں قید رکھتا ہے۔ جب ایک شخص تعلیمی نظام میں ایک خاص ذہنی ساخت لے کر نکلتا ہے، تو میڈیا اس ذہنیت کو مزید تقویت دیتا ہے اور اسے اس حد تک کنٹرول میں رکھتا ہے کہ وہ کسی بھی مزاحمتی سوچ یا حقیقی آزادی کی جدوجہد کی طرف مائل نہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر کسی کو حقیقت کا علم بھی ہو جائے، تو وہ عملی طور پر اس کے خلاف کچھ کرنے کے بجائے، یا تو مایوسی اور بے بسی کا شکار ہو جاتا ہے، یا پھر خود اسی نظام کا ایک سرگرم محافظ بن جاتا ہے۔

تعلیم کے میدان میں ذہنی غلامی کو مضبوط کرنے کے بعد اسے باقی تمام شعبہ جات میں نافذ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو تعلیمی نظام کے ذریعے ذہنی طور پر قابو میں آ چکا ہو، وہ معیشت میں بھی سرمایہ دارانہ اور سودی نظام کو ناگزیر سمجھے گا، وہ سیاست میں بھی عالمی طاقتوں کے تسلط کو فطری مانے گا، وہ سماجی زندگی میں بھی صارفیت اور غیر فطری رویوں کو قبول کرے گا، اور اگر وہ مذہب کی طرف مائل ہو بھی جائے، تو وہ ایسا مذہبی بیانیہ اپنائے گا جو اس کے عملی میدان میں غلامی سے نجات کا ذریعہ نہ بن سکے۔ یوں تعلیم ہی وہ بنیادی شعبہ ہے جو ہر دوسرے شعبے میں غلامی کو ایک مستقل حقیقت بنا کر پیش کرتا ہے،

اور ایک بار اگر ذہنیت غلام بنادی جائے، تو جسمانی، معاشی، سماجی، اور سیاسی غلامی خود بخود نافذ ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی قوم حقیقی آزادی کے لیے کھڑی ہوتی ہے، تو وہ سب سے پہلے تعلیمی میدان میں انقلاب لاتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں بھی جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی، تو سب سے پہلے مسجد نبوی میں ایک ایسا تعلیمی مرکز قائم کیا جہاں صحابہ کرام کی ذہنی تربیت کی گئی اور انہیں غلامی سے نکلنے کے لیے فکری آزادی دی گئی۔ یہی حکمت عملی ہر بڑی انقلابی تحریک میں نظر آتی ہے، چاہے وہ امام خمینیؒ کا ایرانی انقلاب ہو، الجزائر کی آزادی کی تحریک ہو، یا برصغیر میں استعمار کے خلاف جدوجہد ہو۔ اس کے برعکس، اگر کوئی قوم تعلیمی میدان میں مغلوب ہو جائے تو وہ باقی تمام شعبوں میں خود بخود غلامی کے شکنجے میں آ جاتی ہے، اور پھر وہ جانتے ہوئے بھی ہاتھ پیر نہیں مار پاتی کیونکہ اس کی سوچ کو پہلے ہی محدود کر دیا گیا ہوتا ہے۔

البتہ یہ درست ہے کہ بھوک اور افلاس ایک انسان کو سب سے زیادہ بے بس کر دیتے ہیں، اور جب پیٹ میں روٹی نہ ہو تو کسی بھی اعلیٰ نظریے یا علم کی جستجو ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ تاہم، اگر معیشت کو تعلیم پر فوقیت دے دی جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ پہلے روٹی کا بندوبست کیا جائے، پھر علم کی طرف آیا جائے گا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ معیشت کو تعلیم سے علیحدہ کر دیا گیا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک مضبوط معیشت کی بنیاد بھی درحقیقت تعلیم ہی پر ہوتی ہے۔

روٹی کی بھوک فوری اور ظاہری مسئلہ ہے، جبکہ علم کی بھوک ایک دیرپا اور گہرا مسئلہ ہے جو اگر حل نہ ہو تو نسلوں کو غلامی میں جکڑ دیتا ہے۔ دنیا کی تمام استعماری قوتوں نے کبھی بھی ترقی پذیر اقوام کو اقتصادی لحاظ سے آزاد نہیں ہونے دیا بلکہ ان کی معیشت کو ہمیشہ ایسے جال میں جکڑے رکھا کہ وہ تعلیم کی طرف بڑھنے کے قابل ہی نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ نیوکالونیل ازم کے تحت اکثر ترقی پذیر ممالک کو ایسے قرضوں اور تجارتی معاہدوں میں جکڑ دیا جاتا ہے جو انہیں غربت سے نکلنے نہیں دیتے، تاکہ وہ ہمیشہ بنیادی ضروریات میں الجھے رہیں اور تعلیمی ترقی کی طرف قدم نہ بڑھا سکیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کئی اقوام نے انتہائی بدترین معاشی حالات میں بھی تعلیم کو فوقیت دی اور پھر انہی تعلیم یافتہ افراد نے معیشت کی بہتری کے لیے انقلاب برپا کیا۔ مثال کے طور پر جاپان دوسری جنگ عظیم میں مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا، لیکن انہوں نے اپنی تعمیر نو کا آغاز تعلیم سے کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی ایک بڑی اقتصادی طاقت بن گئے۔ اسی طرح، ایران میں انقلاب کے بعد معاشی پابندیاں اور جنگیں مسلط کی گئیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے تعلیمی میدان میں خود کفالت حاصل کی، جس کی بدولت آج وہ جدید سائنسی اور صنعتی ترقی میں آگے نکل چکے ہیں۔

تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو معیشت کو آزاد کرنے کے قابل بناتی ہے۔ اگر کوئی قوم غربت کے جال میں پھنسی ہوئی ہو، لیکن اس کے افراد تعلیم یافتہ اور باشعور ہوں، تو وہ ایسے راستے نکال سکتے ہیں جو انہیں استعماری معیشت سے باہر نکال سکیں۔ اگر صرف معیشت کو بنیاد بنایا

جائے اور تعلیم کو پس پشت ڈال دیا جائے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ قوم ہمیشہ دوسروں کی دی ہوئی روٹی پر گزارا کرتی رہے گی اور کبھی خود کفیل نہیں ہو سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ استعماری قوتیں ہمیشہ تعلیمی میدان میں غلامی کو پہلے یقینی بناتی ہیں تاکہ ان کی اقتصادی غلامی کا جواز ہمیشہ باقی رہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ روٹی کی بھوک اور علم کی بھوک کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی قوم کو صرف پیٹ بھرنے کے لائق بنایا جائے، لیکن اس کی فکری آزادی سلب کر لی جائے، تو وہ ہمیشہ دوسروں کی دی ہوئی روٹی کھانے پر مجبور رہے گی۔ لیکن اگر وہ اپنی تعلیمی اور فکری آزادی حاصل کر لے، تو وہ خود اپنی روٹی پیدا کرنے اور دوسروں کے استحصال سے بچنے کے قابل ہو جائے گی۔ یہی فرق ہے ایک وقتی حل اور ایک دیرپا انقلاب میں۔

استحصال اور انقلاب

استحصال انسانی تاریخ کا ایک ایسا المیہ ہے جو ہمیشہ طاقتور اور کمزور کے درمیان کشمکش کی صورت میں موجود رہا ہے۔ استحصال کنندہ اپنی دانست میں اپنے مفادات، اپنی ترقی اور اپنی برتری کے نشے میں مست رہتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ جس کا استحصال کر رہا ہے، وہ ہمیشہ کمزور اور محکوم رہے گا اور وہ خود ہمیشہ غالب رہے گا۔ مگر تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ یہ ایک عارضی اور وقتی مفاد ہے۔

جب کسی شخص، گروہ یا قوم کا استحصال کیا جاتا ہے تو وہ مشکلات و مصائب کی بھٹی میں جلنے لگتے ہیں۔ ابتدا میں شاید وہ بے بس محسوس کریں، لیکن رفتہ رفتہ ان کی قوت برداشت میں اضافہ ہوتا ہے، ان کے شعور میں بیداری آتی ہے اور وہ باہمت بن جاتے ہیں۔ یہی شعور اور ہمت وہ عناصر ہیں جو بالآخر استحصال کے خلاف بغاوت اور انقلاب کی بنیاد رکھتے ہیں۔ جو استحصال کا شکار ہوتے ہیں، وہ اپنی حالت زار کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کرتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ان میں وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے جو انہیں اپنی غلامی سے نجات دلا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ استحصال کرنے والا درحقیقت خود اپنے زوال کی بنیاد رکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ جسے دبا رہا ہوتا ہے، اسی کو ایک ایسا دشمن بنا رہا ہوتا ہے جو ایک دن اس کے خلاف کھڑا ہو جائے گا۔ جب مظلوم اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو تاریخ گواہ ہے کہ ظالم کے تخت و تاج لرزنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ استحصال کو اکثر انقلاب کا پیش خیمہ کہا جاتا ہے۔ وہ خون جو مظلوم کی رگوں سے بہایا جاتا ہے، رائیگاں نہیں جاتا بلکہ تاریخ میں اس کا اثر کسی نہ کسی صورت میں نظر آتا ہے۔ دنیا کی عظیم انقلابات کی کہانیاں اس حقیقت کی واضح مثالیں ہیں کہ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو وہ خود اپنے خاتمے کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔

مگر استحصال کرنے والا اس حقیقت سے غافل ہوتا ہے۔ وہ طاقت اور دولت کے نشے میں مست ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ اس کی حکمرانی ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس کی آنکھوں پر لالچ اور ہوس کی پٹی بندھی ہوتی ہے، جو اسے مستقبل کے خطرات سے اندھا کر دیتی ہے۔ وہ دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور اپنی طاقت کے زعم میں وہ فیصلے کر بیٹھتا ہے جو بالآخر اس کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔ وہ اپنی قبر خود کھودتا ہے اور جب اسے ہوش آتا ہے، تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

استحصال کی تاریخ میں ہمیں بے شمار مثالیں ملتی ہیں جہاں ظالم نے اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کو دبانے کی کوشش کی، مگر بالآخر اسی کے سبب اس کا زوال ہوا۔ فرعون، نمرود، یزید اور بہت سے دوسرے جابر حکمرانوں کی کہانیاں اس امر کی شاہد ہیں کہ ظلم کا انجام ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہ حقیقت ہر دور کے انسان کے لیے ایک سبق ہے کہ ظلم اور استحصال کسی بھی شکل میں ہو، وہ ایک دن اپنے انجام کو ضرور پہنچتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ حقیقت میں خود کو تباہی کے دہانے پر لے جاتے ہیں۔ وقت اور حالات گواہ ہیں کہ استحصال ہمیشہ ایک نئے انقلاب کو جنم دیتا ہے، اور مظلوم کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔

رومی سلطنت کی تاریخ استحصال کی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک نمایاں مثال اسپارٹاکس کی بغاوت ہے۔ اسپارٹاکس ایک غلام تھا جسے رومی اشرافیہ نے دوسرے غلاموں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا نشانہ بنایا۔ تاہم، جب ظلم حد سے بڑھ گیا تو انہی غلاموں نے اسپارٹاکس کی قیادت میں بغاوت کر دی اور روم کے خلاف کئی سال تک جنگ لڑی۔ اگرچہ بالآخر یہ بغاوت دبا دی گئی، لیکن اس نے روم کے استحصالی نظام کی کمزوریوں کو بے نقاب کر دیا اور آنے والے وقتوں میں اس کے زوال کی راہ ہموار کی۔

فرانس میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہونے والا انقلاب بھی استحصال کے نتیجے میں برپا ہوا۔ بادشاہ لوئی شانزدہم اور ملکہ ماری انٹونیٹ کی شاہ خرچیاں، جاگیرداروں اور پادریوں کی زیادتیاں، اور عام عوام پر بھاری ٹیکسوں کا بوجھ ایک ایسا ماحول پیدا کر چکا تھا جہاں غریب عوام بدترین بدحالی کا شکار تھے۔ جب غربت، بھوک اور نابرابری اپنی انتہا کو پہنچی تو عوامی غصہ لاوے کی مانند پھٹ پڑا اور سترہ سو نواسی میں ایک عظیم انقلاب نے صدیوں پرانے بادشاہی نظام کا خاتمہ کر دیا۔ استحصال کنندگان نے اپنے وقتی مفاد کو دیکھتے ہوئے رعایا کو دباتے رہنے کی کوشش کی، لیکن یہی دباؤ ان کے مکمل خاتمے کا سبب بنا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں روس کے زاروں نے کسانوں اور مزدوروں کا بے رحمانہ استحصال کیا۔ زمین داروں، صنعت کاروں اور شاہی خاندان نے اپنے عیش و عشرت کے لیے عوام کو سخت ترین غربت میں دھکیل دیا۔ مزدوروں کی تحریکیں بار بار ابھرتی رہیں، لیکن حکومت نے انہیں دبانے کی کوشش کی۔ تاہم انیس سو سترہ میں بولشیوک انقلاب کے نتیجے میں زار شاہی کا خاتمہ ہو گیا اور وہی عوام جو صدیوں سے استحصال کا شکار تھے، ایک نئی انقلابی طاقت بن کر ابھرے۔

برصغیر میں برطانوی سامراج کی حکمرانی بھی استحصال کی بنیاد پر قائم تھی۔ انگریزوں نے ہندوستانی وسائل کو لوٹا، کسانوں اور مزدوروں پر بھاری ٹیکس عائد کیے اور ان کی معیشت کو اپنی صنعتی ترقی کے لیے استعمال کیا۔ تاہم، جیسے جیسے ظلم بڑھتا گیا، عوام میں بیداری آتی گئی۔ اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی اور بعد میں گاندھی، قائداعظم اور دیگر رہنماؤں کی قیادت میں چلنے والی تحریکوں نے برطانوی تسلط کو کمزور کر دیا، یہاں تک کہ انیس سو سینتالیس میں انہیں برصغیر چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ استحصال کے ذریعے طاقت قائم رکھنے والے آخرکار خود ہی اپنی قبر کھود بیٹھے۔

بیسویں صدی میں جنوبی افریقہ میں سفید فام حکمرانوں نے سیاہ فام عوام پر بے انتہا ظلم ڈھایا۔ انہیں بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا، زمینوں سے بے دخل کیا گیا اور ہر طرح کے معاشی و سیاسی مواقع سے محروم رکھا گیا۔ تاہم، نیلسن منڈیلا اور ان کے ساتھیوں نے جدوجہد جاری رکھی، جیلیں کاٹیں، مظالم سہے، لیکن استحصال کے خلاف مزاحمت نہ

چھوڑی۔ بالآخر انیس سو نوے کی دہائی میں جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کا نظام ختم ہو گیا اور استحصال کرنے والے حکمرانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ تاریخی مثالیں واضح کرتی ہیں کہ استحصال وقتی فائدے کے لیے کیا جاتا ہے، لیکن اس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ظالم اپنی عیاری اور طاقت کے نشے میں اندھا ہو کر سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ غالب رہے گا، مگر وقت اس کے خلاف کام کرتا ہے۔ مظلوم کا صبر، اس کی جدوجہد اور مشکلات میں اس کا کندن بننا بالآخر اسے ایک ناقابل تسخیر قوت میں بدل دیتا ہے جو استحصال کرنے والوں کے زوال کا سبب بنتی ہے۔ تاریخ ہمیں یہی سبق دیتی ہے کہ ظلم کی رات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، سحر ضرور ہوتی ہے۔

آج کے جدید دور میں صہیونی استعماری نظام نے پوری دنیا پر اپنے اثرات مرتب کر رکھے ہیں۔ طاقت، معیشت اور ذرائع ابلاغ پر اس کا تسلط قائم ہے، اور وہ اپنی چالاکیوں، سازشوں اور جبر کے ذریعے کمزوروں اور مظلوموں کو اپنا شکار بنائے ہوئے ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں اس کے ایجنٹ موجود ہیں، جو اس کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے کام کرتے ہیں۔ کبھی اقتصادی غلامی کے ذریعے، کبھی فکری استحصال کے ذریعے اور کبھی براہ راست جنگ و جارحیت کے ذریعے وہ انسانیت کو اپنے شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مظلوموں کی سرزمینوں پر قبضہ، ان کے وسائل کی لوٹ مار، ان کے حقوق کی پامالی اور ان پر زندگی تنگ کر دینا اس کے استحصالی نظام کے بنیادی ستون ہیں۔

لیکن تاریخ ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ کوئی بھی استحصالی نظام ہمیشہ قائم نہیں رہتا۔ وہ لوگ جو ظاہری طاقت کے نشے میں چور ہو کر دوسروں کو کچلنے کی کوشش کرتے ہیں، خود اپنی ہی چالوں میں پھنس جاتے ہیں۔ فرعون کی سلطنت ہو یا نمرود کی، رومی حکمران ہوں یا برطانوی استعمار، ہر ایک نے اپنے وقت میں خود کو ناقابل شکست سمجھا، مگر وقت نے ان کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ آج صہیونی استعمار اور اس کے آلہ کار اسی راستے پر گامزن ہیں، اور تاریخ کے اس سبق سے کوئی عبرت حاصل نہیں کر رہے۔ انہیں یہ گمان ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے غالب رہیں گے، مگر وہ یہ بھول رہے ہیں کہ ظلم کے خلاف مزاحمت بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر دور کی طرح آج بھی کمزوروں اور مظلوموں کے اندر بیداری کی ایک لہر پیدا ہو رہی ہے، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔

یہ استحصالی بساط اب زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ جلد ہی یہ سب کچھ لپیٹ دیا جائے گا اور وہ دن آنے والا ہے جب الٰہی نیابت میں معصوم قیادت اور اس کا عظیم لشکر غالب آئے گا۔ وہ دن جب عدل کا پرچم بلند ہو گا اور ظلم کی جڑیں کاٹ دی جائیں گی۔ اس وقت استحصال کرنے والوں کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہو گی، کوئی موقع نہیں ہو گا کہ وہ اپنے دفاع میں بول سکیں یا خود کو بچا سکیں۔ مکافات عمل کا وقت آ چکا ہو گا اور ہر ظالم کو اپنے اعمال کا پورا پورا حساب دینا ہو گا۔

ابھی وقت باقی ہے، اور یہی موقع ہے کہ جو ظلم اور استحصال کے راستے پر چل رہے ہیں، وہ توبہ کر لیں۔ وہ اپنے گناہوں سے رجوع کریں اور عدل و انصاف کے نظام کی طرف پلٹ

آئیں۔ ورنہ جب مکافات عمل کا سلسلہ شروع ہو گا، تو کوئی تدبیر انہیں نہیں بچا سکے گی۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ ضرور ملتا ہے، اور یہ وعدہ بھی ہے کہ وہ وقت جلد آئے گا جب حق اور عدل کا بول بالا ہو گا اور باطل ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔

نکاحِ مؤقت (متعہ) آج کی اہم ضرورت

نکاحِ متعہ، جو ایک شرعی اور وقتی ازدواجی معاہدہ ہے، اسلامی فقہ میں ہمیشہ ایک جائز اور مستند طریقہ رہا ہے، لیکن جدید دور میں اس کی ضرورت اور اہمیت مزید نمایاں ہو گئی ہے۔ بدلتے ہوئے معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی حالات نے ایسے مسائل کو جنم دیا ہے جن کا حل نکاحِ موقت کے ذریعے ممکن ہے۔ مغربی اور مشرقی دنیا میں خاندانی نظام کی بدلتی ہوئی ساخت، دیر سے شادی کرنے کا رجحان، اور غیر شرعی تعلقات کی بڑھتی ہوئی شرح اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ متعہ جیسا ایک معتدل اور متوازن حل کس قدر ضروری ہو چکا ہے۔

معاشرتی پہلو سے دیکھا جائے تو جدید دنیا میں نوجوانوں کو مختلف وجوہات کی بنا پر دیر سے شادی کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ تعلیم، کیریئر اور معاشی استحکام حاصل کرنے کے دوران ایک فرد کی فطری اور جذباتی ضروریات کو مکمل نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے یا تو وہ ناجائز تعلقات کی طرف مائل ہوتا ہے یا نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ نکاحِ موقت اس مسئلے کا ایک عملی حل فراہم کرتا ہے، کیونکہ یہ شرعی دائرے میں رہتے ہوئے ایک ایسا معاہدہ ہے جو انسان کی فطری ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ عزت و وقار کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔ اگر اس کو سماجی سطح پر قبولیت حاصل ہو جائے تو معاشرے میں پھیلتی ہوئی بے راہ روی، زنا، اور غیر شرعی تعلقات کی شرح میں واضح کمی آ سکتی ہے۔

معاشی لحاظ سے بھی متعہ کی ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔ جدید دور میں شادی کے اخراجات ایک عام فرد کی استطاعت سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ مہنگے رسم و رواج، جہیز، اور دیگر سماجی دباؤ کی وجہ سے شادی کرنا ایک مشکل مرحلہ بن چکا ہے، جس کے باعث نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد مجرد زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی ہے۔ نکاحِ موقت ان افراد کے لیے ایک ایسا راستہ فراہم کرتا ہے جو نکاحِ دائم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے لیکن اپنی فطری ضروریات کو شرعی اور اخلاقی طریقے سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔

نفسیاتی پہلو سے بھی دیکھا جائے تو جدید دور میں تنہائی، ڈپریشن، اور ذہنی دباؤ جیسے مسائل میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے۔ انسانی تعلقات کے ختم ہوتے ہوئے رجحانات نے جذباتی خلا کو بڑھا دیا ہے، جس کے نتیجے میں لوگ یا تو شدید نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں یا غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ نکاحِ موقت ایک ایسا متوازن راستہ ہے جو افراد کو جذباتی سہارا دیتا ہے، ان کی ذہنی صحت کو بہتر کرتا ہے، اور انہیں ایک منظم اور پاکیزہ زندگی گزارنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

دینِ اسلام ہمیشہ ایک ایسا نظام فراہم کرتا ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہو۔ نکاحِ متعہ کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام نے ہر دور کے انسان کے لیے ایک مناسب اور قابلِ عمل حل پیش کیا ہے۔ اگر اسے صحیح طور پر سمجھا اور اس پر عمل کیا جائے تو نہ صرف بے راہ روی اور ناجائز تعلقات کی روک تھام ممکن ہو سکتی ہے بلکہ افراد کی عزت و احترام کے ساتھ ان کی ضروریات بھی پوری کی جا سکتی ہیں۔

یہ تعلق جب شریعت کی نسبت سے قائم ہوتا ہے تو یہ پاکیزگی، تقوااور اعتدال کی راہ بن جاتا ہے، جس میں روحانیت اور نفسیات دونوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ حلال لذت، جو شریعت کے دائرے میں رہ کر حاصل کی جائے، انسان کے جسم اور روح دونوں کے لیے توانائی فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ صرف فطری تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے بلکہ انسان کو دیگر اہم امور اور ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے بھی انرجی اور طاقت فراہم کرتی ہے، جو کسی اور شعبے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نکاحِ موقت کو ہمیشہ غلط فہمیوں اور منفی پروپیگنڈے کا سامنا رہا ہے، لیکن جدید معاشرتی مسائل اور انسانی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ اگر مسلم معاشرے میں اس کے بارے میں درست آگاہی پیدا کی جائے اور اسے ایک شرعی، سماجی اور عملی حل کے طور پر تسلیم کیا جائے، تو یہ بہت سے مسائل کا ایک مؤثر حل ثابت ہو سکتا ہے۔

متعہ کو اوقات کے تعین کی بنا پر "رنڈی بازی" سے تعبیر کرنا ایک سطحی اور غیر منصفانہ موازنہ ہے جو نہ صرف علمی دیانت کے خلاف ہے بلکہ انسانی فطرت، معاشرتی تقاضوں اور اسلامی تعلیمات کی گہرائی کو بھی نظر انداز کرتا ہے۔ اگر اس مسئلے کو فلسفی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی زاویوں سے دیکھا جائے تو متعہ کی حقیقت بالکل مختلف نظر آتی ہے۔

فلسفی اعتبار سے نکاح، خواہ دائم ہو یا موقت، انسانی فطرت کی تکمیل اور اخلاقی دائرے میں صنفی تعلقات کے استحکام کا ذریعہ ہے۔ نکاح کا بنیادی فلسفہ فطری انسانی ضرورت کو ایک

منظم اور شرعی دائرے میں رکھنا ہے تاکہ فرد اور سماج دونوں کی فلاح ممکن ہو۔ اگر نکاحِ موقت کو فقط وقت کے تعین کی وجہ سے غیر اخلاقی سمجھا جائے تو پھر دنیا میں موجود ہر معاہدہ جس میں وقت کی حد بندی ہو، وہ بھی اسی بنیاد پر مشکوک ٹھہرے گا۔ یہاں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ نکاحِ دائم میں بھی عملی طور پر ایک غیر متعین مدت ہی ہوتی ہے، جو بسا اوقات طلاق یا کسی اور وجہ سے محدود ہو جاتی ہے۔

سماجی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نکاحِ موقت ایک ایسا حل فراہم کرتا ہے جو ان افراد کے لیے مفید ہے جو مختلف وجوہات کی بنا پر نکاحِ دائم نہیں کر سکتے، جیسے کہ تعلیم، معیشت، یا جنگی حالات میں موجود افراد۔ اگر اس اختیار کو ممنوع قرار دیا جائے تو معاشرے میں زنا اور غیر شرعی تعلقات بڑھنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں غیر قانونی بچوں کی پیدائش، خاندانی نظام کی شکستگی، اور اخلاقی بگاڑ عام ہو سکتا ہے۔ اسلامی تعلیمات نے ہمیشہ ایسے متبادل فراہم کیے ہیں جو انسان کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک پاکیزہ اور نظم و ضبط والا معاشرہ تشکیل دے سکیں۔

معاشی اعتبار سے بھی اس مسئلے کو دیکھا جائے تو نکاحِ موقت کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ ان افراد کو تحفظ فراہم کرتا ہے جو معاشی طور پر نکاحِ دائم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر صرف نکاحِ دائم ہی واحد راستہ ہو، تو کئی افراد خاص طور پر نوجوان طبقہ طویل عرصے تک نکاح سے محروم رہ سکتا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرتی بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس، متعہ ایک ایسا راستہ فراہم کرتا ہے جس میں فریقین باہمی رضامندی سے شرعی

حدود میں رہ کر ایک معاہدہ کرتے ہیں، جو ان کی ضروریات اور حالات کے مطابق ہوتا ہے۔

نفسیاتی زاویے سے دیکھیں تو انسانی جذبات اور فطری تقاضوں کو دبانا یا ان کے لیے کوئی منظم راستہ فراہم نہ کرنا ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کو جنم دیتا ہے۔ مرد و عورت دونوں کے جذباتی اور جسمانی تقاضے ہوتے ہیں، اور اگر ان کے لیے شرعی اور محفوظ دائرہ فراہم نہ کیا جائے تو وہ ناجائز اور غیر اخلاقی راستوں کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ نکاحِ موقت ان افراد کے لیے ایک ایسا حل ہے جو وقتی طور پر جذباتی استحکام اور نفسیاتی سکون کا ذریعہ بن سکتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ دیگر سماجی اور ذاتی معاملات میں بہتر کارکردگی دکھا سکتے ہیں۔

لہٰذا، متعہ کو "رنڈی بازی" سے تشبیہ دینا علمی بددیانتی کے سوا کچھ نہیں۔ رنڈی بازی ایک ایسا عمل ہے جس میں محض جسمانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کاروباری لین دین ہوتا ہے، جہاں نہ تو عزت و احترام ہوتا ہے، نہ ہی شرعی حدود کی پاسداری، اور نہ ہی کوئی خاندانی و سماجی پہلو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، نکاحِ موقت ایک شرعی، سماجی، اور فطری معاہدہ ہے جس میں دونوں فریقین کی عزت اور وقار کا مکمل تحفظ موجود ہوتا ہے۔ اس کا مقصد فحاشی کو فروغ دینا نہیں بلکہ معاشرتی نظم و ضبط کو برقرار رکھنا اور انسانی فطرت کے تقاضوں کو شریعت کے دائرے میں حل کرنا ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ کوئی بھی چیز اگر حد سے تجاوز کر جائے تو اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جائز اور حلال ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اسے عادت بنا لیا جائے یا

اس میں افراط کیا جائے۔ نکاحِ متعہ اگرچہ ایک شرعی اور سماجی حل ہے، لیکن اگر اسے غیر ضروری حد تک اپنایا جائے اور اسے ایک معمول بنالیا جائے تو اس کے نتائج مثبت کے بجائے منفی ہو سکتے ہیں۔ اسلام کا بنیادی اصول توازن ہے، جہاں ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھا جاتا ہے۔ افراط اور تفریط دونوں ہی نقصان دہ ہیں، کیونکہ ایک طرف مکمل اجتناب فطری ضروریات کو دبا کر ناجائز راستوں کی طرف لے جا سکتا ہے، تو دوسری طرف بے جا رغبت انسان کو اخلاقی اور سماجی طور پر غیر ذمہ دار بنا سکتی ہے۔

انسان کی دنیا اور آخرت کی سعادت کا دار و مدار بھی اسی توازن پر ہے۔ اگر وہ کسی چیز میں حد سے تجاوز کرتا ہے تو نہ صرف اس کی زندگی میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں بلکہ اس کی روحانی ترقی بھی متاثر ہوتی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں ہر چیز کے لیے اعتدال اور میانہ روی کو بنیادی اصول قرار دیا گیا ہے۔ عبادات، معاملات، تعلقات، اور حتیٰ کہ حلال و مباح امور میں بھی ایک خاص حد بندی ضروری ہے تاکہ انسان دین اور دنیا دونوں میں کامیاب ہو سکے۔ اگر اس اصول کو نکاحِ متعہ پر بھی لاگو کیا جائے تو اس کا مقصد کسی مخصوص طبقے کی خواہشات کی تکمیل نہیں بلکہ سماجی نظم و ضبط اور اخلاقی اقدار کا فروغ ہونا چاہیے۔

حق کو حق کی نشانیوں سے پہچانیں

حق کی پہچان ہمیشہ آسان نہیں ہوتی، کیونکہ دنیا میں مختلف افراد اور گروہ اپنے نظریات کو حق کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ امام علیؑ کا فرمان ہمیں ایک بنیادی اصول سکھاتا ہے کہ حق کو اس کی نشانیوں سے پہچانا جائے، نہ کہ کسی فرد یا گروہ کے دعوے کی بنیاد پر۔ یہ بصیرت ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم حق اور باطل کے درمیان فرق کر سکیں اور محض کسی کی شخصیت سے متاثر ہو کر غلط راستے پر نہ چلیں۔

جب ہم تاریخ میں جھانکتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ حق کے دعوے دار بنے، مگر ان کے اعمال نے ان کے دعووں کو جھوٹا ثابت کر دیا۔ اسی طرح، بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے کبھی اپنی زبان سے حق کا دعویٰ نہیں کیا، مگر ان کے کردار نے انہیں حق کا علمبردار ثابت کیا۔ امام علیؑ ہمیں اسی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ جب حق واضح ہو گا تو حق پر چلنے والے بھی خود بخود پہچانے جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ حق کو بنیاد بنانا چاہیے، نہ کہ کسی فرد یا گروہ کی وابستگی کو۔

شخصیت پرستی ایک ایسا زہر ہے جو انسان کے شعور کو مفلوج کر دیتا ہے۔ جب لوگ کسی شخص کو ہر حال میں برحق مان لیتے ہیں، تو وہ اس کے ہر عمل کو بھی درست تسلیم کر لیتے ہیں، چاہے وہ باطل ہی کیوں نہ ہو۔ یہی روش نفاق اور جہالت کو فروغ دیتی ہے، کیونکہ جب

انسان اپنی عقل اور بصیرت کا استعمال ترک کر دیتا ہے، تو وہ سچائی اور فریب میں فرق کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات ہمیں شخصیت پرستی کے بجائے اصولوں کو اپنانے کی تلقین کرتی ہیں۔

قرآن مجید بھی ہمیں بارہا یہی پیغام دیتا ہے کہ انسان کو آنکھیں بند کر کے کسی کی پیروی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ دلیل اور حقائق کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہیے۔ حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے، جب انہوں نے اپنی قوم کی اندھی تقلید کو رد کر دیا اور صرف اسی کو حق مانا جو عقل اور وحی سے ثابت ہو۔ یہی اصول ہمیں امام علیؑ کے فرمان میں نظر آتا ہے، جہاں وہ ہمیں سکھاتے ہیں کہ اگر ہم حق کو اس کی نشانیوں سے پہچانیں گے، تو ہم کبھی بھی دھوکے میں نہیں آئیں گے۔

مومن وہ ہوتا ہے جو حق کے لیے اپنی عقل و بصیرت کا استعمال کرے، جبکہ منافق وہ ہوتا ہے جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے حق اور باطل کو خلط ملط کرتا ہے۔ منافقین ہمیشہ شخصیات کے گرد ہالہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ عوام ان کی حقیقت کو نہ پہچان سکیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ سچائی کو زیادہ دیر تک دبایا نہیں جا سکتا۔ جب بھی حق نمایاں ہوتا ہے، تو اس کے پیروکار بھی دنیا کے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہیں، چاہے وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔

لہٰذا، ہمیں چاہیے کہ ہم شخصیت پرستی کی اندھی تقلید سے بچیں اور اپنی بصیرت کو مضبوط کریں تاکہ ہم ہر دور میں حق اور باطل میں فرق کرنے کے قابل ہو سکیں۔ حق کو پہچاننے کا

بہترین ذریعہ قرآن، سنت اور عقل سلیم ہے، اور جو بھی شخص یا گروہ ان بنیادوں پر پورا اترے گا، وہی حقیقی معنوں میں حق کا نمائندہ ہو گا۔

حق کسی خارجی دلیل یا کسی اور کے سمجھانے کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ انسانی فطرت اور ضمیر خود اس کی گواہی دیتا ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی اور تپش کو محسوس کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی طرح حق کی روشنی بھی اتنی واضح ہوتی ہے کہ دل خود بخود اسے قبول کر لیتا ہے۔ پانی کی تری کو کوئی ثابت نہیں کرتا، بلکہ جیسے ہی ہاتھ پانی میں جاتا ہے، اس کا بھیگنا اس بات کی دلیل بن جاتا ہے۔ اسی طرح، حق بھی ایسا ہی ہے کہ جو بھی اس کے قریب آتا ہے، اس کا وجود خود بخود اسے تسلیم کر لیتا ہے۔

انسان جب ظلم دیکھتا ہے تو اس کا ضمیر اسے بغاوت پر اکساتا ہے، جب انصاف دیکھتا ہے تو سکون پاتا ہے، جب جھوٹ سنتا ہے تو بے چینی محسوس کرتا ہے اور جب سچائی سامنے آتی ہے تو دل میں اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمام احساسات انسان کے اندرونی شعور سے جنم لیتے ہیں اور کسی خارجی تصدیق کے محتاج نہیں ہوتے۔ محبت، نفرت، خوف، خوشی اور غم کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے کسی نبی یا استاد کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ یہ احساسات خود اپنے وجود کی شہادت دیتے ہیں۔

حق کی پہچان بھی ایسے ہی کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی چیز دل میں اطمینان پیدا کرے، ضمیر اسے قبول کر لے اور عقل بھی اس کی سچائی کو تسلیم کرے، تو وہ حق ہے۔ اگر کوئی چیز اضطراب،

بے چینی اور الجھن پیدا کرے، تو وہ باطل ہے۔ جیسے روشنی کو دیکھ کر آنکھیں خود بخود اسے پہچان لیتی ہیں اور اندھیرے میں راستہ کھو جاتا ہے، اسی طرح حق کی روشنی دل کو یقین کی طرف لے جاتی ہے اور باطل کی تاریکی شک اور بے یقینی میں ڈال دیتی ہے۔

انسان کی فطرت حق کو پہچاننے کے لیے کافی ہے، بشرطیکہ اس پر خواہشات اور تعصبات کے پردے نہ پڑے ہوں۔ جو شخص اپنی عقل اور ضمیر کو آزاد رکھے، وہ بغیر کسی بیرونی مداخلت کے حق کو پہچان سکتا ہے، جیسے ایک نوزائیدہ بچہ محبت اور ماؤں کے لمس کی حقیقت کو پہچان لیتا ہے، جیسے ایک پیاسا پانی کی قدر جان لیتا ہے، جیسے ایک زخمی درد کی شدت کو خود محسوس کرتا ہے۔ یہ سب خارجی تعلیم کے بغیر انسان کی فطری پہچان کا حصہ ہے، اور یہی فطری شعور حق کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

باطل کی شناخت

باطل کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نشانیوں کو سمجھا جائے، کیونکہ جس طرح حق اپنی علامتوں سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح باطل بھی اپنی حقیقت کو خود ظاہر کر دیتا ہے۔ جیسے حق روشنی کی مانند ہوتا ہے جو اندھیروں کو ختم کر دیتا ہے، باطل بھی ایک تاریکی ہے جو روشنی کے سامنے زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتا۔ حق اگر سچائی، عدل اور فطری اصولوں پر قائم ہوتا ہے تو باطل ان سب کے برعکس دھوکہ، فریب اور ظلم کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔

باطل کی پہلی اور سب سے نمایاں نشانی یہ ہے کہ وہ وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ جو چیز دیرپا نہ ہو، جو اپنی اصلیت کو چھپانے کے لیے نت نئے طریقے اپناتی رہے، اور جسے بار بار بدلنا پڑے، وہ کبھی حق نہیں ہو سکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ باطل جتنی بھی طاقتور نظر آئے، ایک وقت آتا ہے جب اس کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے اور وہ خود بخود مٹ جاتا ہے۔ فرعون کی بادشاہت، نمرود کا غرور، اور یزید کی حکومت اس کی واضح مثالیں ہیں۔

باطل کی دوسری نشانی یہ ہے کہ وہ دھوکہ اور فریب کے ذریعے خود کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اہلِ باطل ہمیشہ میٹھے الفاظ، چالاکی، اور مکارانہ دلائل سے حق کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو ایسے جال میں پھنساتے ہیں کہ باطل انہیں پرکشش اور فائدہ مند لگنے لگے، جبکہ درحقیقت وہ تباہی اور بربادی کی طرف لے جا رہا ہوتا ہے۔ جیسے

منافقین اپنی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے تھے مگر ان کے اعمال ان کے نفاق کی گواہی دیتے تھے۔

باطل کی ایک اور پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ظلم اور ناانصافی کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ جہاں کہیں بھی ناانصافی، حق تلفی، جبر اور استحصال ہو، وہاں باطل موجود ہوتا ہے۔ تاریخ میں جتنے بھی ظالم حکمران اور جابر قوتیں گزری ہیں، وہ سب اپنی طاقت کے زور پر دوسروں کے حقوق غصب کرتی رہیں۔ ان کے نظام کا بنیادی اصول ہی ظلم پر استوار ہوتا تھا۔ اگر کسی نظریے، حکومت، یا شخصیت کے پیچھے ظلم اور جبر کی چھاپ ہو، تو وہ باطل کی علامت ہے۔

باطل کی ایک اور نشانی اس کی بے چینی اور عدم استحکام ہے۔ اہلِ باطل کبھی بھی سکون اور اطمینان میں نہیں ہوتے، بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی خوف، بے یقینی اور اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سازشوں، دھوکہ دہی، اور جھوٹ کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں، اس لیے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے انہیں دوسرا جھوٹ بولنا پڑتا ہے، اور یوں ان کا سارا نظام خود ایک وقت پر ان کے لیے بوجھ بن جاتا ہے۔

باطل کے پیروکاروں میں ایک اور نشانی شخصیت پرستی اور اندھی تقلید ہے۔ وہ کسی نظریے یا اصول کے بجائے افراد کو مقدس بنا کر ان کی اندھی تقلید کرتے ہیں، چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کے پاس دلیل کی قوت نہیں ہوتی، اس لیے وہ ہمیشہ تعصب، ضد اور شدت

پسندی کو اپناتے ہیں۔ حق دلیل کا محتاج ہوتا ہے، مگر باطل نعرے بازی اور دھونس سے اپنی برتری ثابت کرنا چاہتا ہے۔

باطل کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نتائج پر غور کیا جائے۔ اگر کوئی نظریہ یا عمل معاشرے میں فساد، بگاڑ، نفرت اور بدامنی کو فروغ دے رہا ہو، تو وہ ہرگز حق نہیں ہو سکتا۔ باطل ہمیشہ انسانیت کو نقصان پہنچاتا ہے، جبکہ حق انسانیت کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔ اگر کوئی چیز بظاہر اچھی لگ رہی ہو لیکن اس کے نتیجے میں انسانوں کی اخلاقی، روحانی یا معاشرتی تباہی ہو رہی ہو، تو وہ درحقیقت باطل ہے، چاہے وہ کتنی ہی خوشنما نظر آئے۔

جس طرح حق کو اس کی روشنی سے پہچانا جاتا ہے، باطل کو اس کے اندھیرے سے پہچاننا ممکن ہوتا ہے۔ جو چیز انسان کو اندرونی بے چینی، گناہ، ظلم، فریب، اور فساد کی طرف لے جائے، وہ باطل ہے۔ اور جب باطل کی نشانیاں واضح ہو جاتی ہیں، تو اہلِ باطل خودبخود پہچانے جانے لگتے ہیں، جیسے کثیف پانی کی بدبو اسے الگ کر دیتی ہے اور جیسے جھوٹے چہروں پر بے چینی ان کے جھوٹ کی گواہی دے دیتی ہے۔

شیطانی عرفان اور اس کے مغالطے

"سیٹنک تھیوسوفی (Satanic Theosophy) " ایک ایسا نظریہ ہے جو بظاہر روحانیت، عرفان اور باطنی حکمت کے نام پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت یہ شیطانی اثرات سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس کا مقصد عام طور پر حق اور باطل کے درمیان ایک ایسی مبہم سرحد کھینچنا ہوتا ہے کہ ایک عام فرد حقیقت اور گمراہی کے درمیان فرق کرنے سے قاصر ہو جائے۔ یہ نظریہ عام طور پر انسان کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ روحانی سطح پر فائز ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ تمام روایتی دینی اصولوں اور اخلاقی ضابطوں سے آزاد ہو جائے۔ بظاہر یہ فلسفہ حکمت اور معرفت کا داعی نظر آتا ہے، مگر اس کی بنیاد ایسے عقائد پر رکھی گئی ہے جو اسلامی تعلیمات کے بالکل برعکس ہیں۔

اس نظریے کی شناخت کا ایک بنیادی طریقہ یہ ہے کہ یہ دین کے بنیادی اصولوں کو یا تو بالکل رد کر دیتا ہے یا پھر ان کی ایسی تعبیر پیش کرتا ہے جو اصل مفہوم سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ یہ اکثر "روحانی آزادی" اور "باطنی علم" کے نام پر ایسے خیالات کی تبلیغ کرتا ہے جو انسان کو وحی اور الٰہی ہدایت کے بجائے اپنی عقل اور خواہشات کا غلام بنا دیتے ہیں۔ ایک عام فریب جو "سیٹنک تھیوسوفی" دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر انسان خود سے خیر اور شر کی تعریف متعین کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور کسی بھی خارجی مذہبی ہدایت کی ضرورت نہیں۔ یہ وہی مغالطہ

ہے جو شیطان نے حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو دیا تھا، جب اس نے درخت کھانے کے لیے یہ جواز دیا کہ اس سے وہ ہمیشہ کی زندگی پالیں گے اور انہیں فرشتوں جیسا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ قرآن مجید نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ شیطان کا سب سے بڑا حربہ یہی ہے کہ وہ انسان کو فریب میں مبتلا کر کے نافرمانی کی راہ پر لے جائے۔

یہ فلسفہ اپنے پیروکاروں کو قائل کرنے کے لیے علمی مغالطے (logical fallacies) پیدا کرتا ہے اور مذہبی تعلیمات کو اس انداز میں مسخ کرتا ہے کہ انسان کو وہ مکمل طور پر ایک نئے زاویے سے نظر آنے لگتی ہیں۔ اس کی ایک عام مثال یہ ہے کہ حقیقی اسلامی عرفان (Islamic Mysticism) وہ ہوتا ہے جو بندے کو اللہ کی معرفت، بندگی اور قرب کی طرف لے جائے، لیکن "سیٹنک تھیوسوفی" میں عرفان کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ انسان اپنی خواہشات کے تابع ہو اور کسی بھی خارجی الہامی ہدایت کو رد کر دے۔ اس میں "باطنی حکمت (Esoteric Wisdom) "کا ایسا تصور دیا جاتا ہے جو انسان کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ "حقیقی علم "وہی ہے جو اس کے اپنے تجربات اور داخلی کشف پر مبنی ہو، جبکہ قرآن واضح طور پر کہتا ہے کہ حقیقی علم وہی ہے جو اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہو۔

یہ فلسفہ حق و باطل کو خلط ملط کرنے کے لیے مختلف طریقے اپناتا ہے۔ بعض اوقات یہ انبیاء اور اولیاء کے اقوال کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ کسی مخصوص معنوی پیرائے میں بظاہر درست محسوس ہوں، مگر ان کی اصل تشریح کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کے پیروکار

بعض قرآنی آیات اور احادیث کو سیاق وسباق سے ہٹا کر پیش کرتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ اسلام میں بھی ان کے نظریات کی گنجائش موجود ہے۔ درحقیقت، وہ آیات اور احادیث کو ان کے حقیقی معانی سے ہٹا کر ایک ایسے زاویے سے پیش کرتے ہیں جو نفس پرستی (Ego Worship) اور خواہشات کی پیروی کی حمایت کرتا ہو۔

"سیٹنک تھیوسوفی" ایک اور خطرناک علمی مغالطہ یہ دیتی ہے کہ "باطن (Inner Reality) " کو ہر حال میں "ظاہر (External Reality) "پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جو کچھ ایک انسان کو اپنے باطن میں محسوس ہوتا ہے، وہی سچ ہے، چاہے وہ کسی بھی الہامی ہدایت کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جبکہ اسلامی تعلیمات میں باطن کی تلاش کا مقصد یہ ہے کہ ظاہر کو مزید مضبوط اور مکمل کیا جائے، نہ کہ اسے ترک کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی عرفان میں تصوف اور سلوک کا ہر مرحلہ شریعت اور وحی کے تابع ہوتا ہے، جبکہ "سیٹنک تھیوسوفی" کے پیروکار شریعت کو محض ایک ظاہری حد بندی قرار دے کر اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

یہ نظریہ بعض اوقات "روشنی (Light) "کے ایک ایسے تصور کو فروغ دیتا ہے جو حقیقت میں "اندھیرے (Darkness) "کی نمائندگی کرتا ہے۔ مغربی لوسیفیرین (Luciferian) عقائد میں "لوسیفر (Lucifer) "کو روشنی، علم اور آزادی کا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے، جبکہ اسلامی عقیدہ واضح کرتا ہے کہ شیطان صرف اور صرف گمراہی اور تاریکی کی طرف لے کر جاتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے "نور (Divine Light) " اور

"ظلمات (Darkness) "کے درمیان واضح فرق رکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ حقیقی روشنی وہی ہے جو اللہ، اس کے رسولؐ اور معصومین علیہم السلام کے ذریعے عطا کی گئی ہے۔ "سیٹنک تھیوسوفی" کے ماننے والے اسی روشنی کے تصور کو الٹ کر پیش کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان اگر "شیطانی حکمت (Satanic Wisdom) "کو سمجھے تو وہ حقیقی آزادی اور خودشناسی حاصل کر سکتا ہے۔

یہ فلسفہ تصوف اور روحانی علوم (Spiritual Sciences) کے نام پر بھی فروغ پاتا ہے، جہاں مخصوص عملیات، منتر (Mantras) اور باطنی ریاضتوں Occult) (Practicesکے ذریعے "روحانی ترقی (Spiritual Enlightenment) "کے دعوے کیے جاتے ہیں۔ جبکہ حقیقی اسلامی روحانیت تزکیۂ نفس-Self) (Purification، تقویٰ (God-Consciousness) اور الٰہی ہدایت پر مبنی ہے، "سیٹنک تھیوسوفی" میں خودپرستی(Self-Worship)،طاقت کے حصولPower) (Seekingاور مادی فوائد (Material Gains) کو "روحانیت" کے نام پر بیچا جاتا ہے۔ اس نظریے کے ماننے والے اکثر کھل کر شیطانی طاقتوں کی پیروی کا اعلان نہیں کرتے، بلکہ اپنی باتوں کو اس انداز میں ترتیب دیتے ہیں کہ وہ ایک "عالی فکری سفر " (Intellectual Enlightenment)معلوم ہو، حالانکہ اس کا اصل مقصد انسان کو دین اور فطری ہدایت سے ہٹا کر شیطانی اثرات کے قریب لے جانا ہوتا ہے۔

یہ فلسفہ جدید سیکولر نظریات (Modern Secular Ideologies) کے ساتھ مل کر بھی کام کرتا ہے، جہاں "تنقیدی نظر (Critical Thinking) "کے نام پر فطری اخلاقی اصولوں کو کمزور کر دیا جاتا ہے۔ یہ علمی مغالطہ دیا جاتا ہے کہ تمام حقائق نسبتی (Relative Truth)ہیں اور کوئی چیز قطعی (Absolute) نہیں، یہاں تک کہ خیر (Good)اور شر (Evil) کی تعریف بھی ذاتی پسند و ناپسند پر منحصر ہونی چاہیے۔ جبکہ اسلامی عقیدہ یہ واضح کرتا ہے کہ خیر و شر کی بنیاد الٰہی ہدایت (Divine Guidance) پر ہے، نہ کہ انسانی خواہشات پر۔

"سیٹنک تھیوسوفی "کا سب سے بڑا ہتھیار یہی علمی مغالطے ہیں، جو عام انسان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ وہ کسی اعلیٰ روحانی یا فکری مقام پر پہنچ رہا ہے، حالانکہ درحقیقت وہ گمراہی میں مبتلا ہو رہا ہوتا ہے۔ اسلام میں روحانیت کا راستہ تزکیۂ نفس، تقویٰ اور الٰہی ہدایت پر مبنی ہے، جبکہ "سیٹنک تھیوسوفی" انسان کو ایک ایسے راستے پر ڈالتی ہے جو بظاہر روشنی کی طرف لیکن حقیقت میں تاریکی کی طرف جاتا ہے۔

"سیٹنک تھیوسوفی (Satanic Theosophy) "کی جڑیں انیسویں صدی کے تھیوسوفیکل موومنٹ (Theosophical Movement) میں ملتی ہیں، جسے روسی نژاد خاتون "میڈم ہیلینا پیٹروونا بلاواٹسکی(Madame Helena Petrovna Blavatsky) "نے شروع کیا۔ یہ تحریک اصل میں ہندو، بدھ مت، مغربی فلسفے، اور خفیہ روحانی علوم (Occultism) کا ایک مرکب تھی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں

خالصتاً شیطانی عناصر بھی شامل ہوتے گئے۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد "خفیہ حکمت" (Esoteric Wisdom) کی تلاش اور ایک ایسی عالمی روحانی تحریک کو فروغ دینا تھا جو مذہب کے عام فہم نظریات سے بالاتر ہو۔ بلاواٹسکی نے اپنی کتاب "The Secret Doctrine" میں دعویٰ کیا کہ انسان کو حقیقی آزادی حاصل کرنے کے لیے مذہبی قیود سے آزاد ہونا ضروری ہے، اور اسے "خودشناسی (Self-Realization) " کے ذریعے اپنی روحانی طاقتوں کو بیدار کرنا چاہیے۔

اس تحریک کی بعض شاخیں بعد میں "لوسیفیرین ازم (Luciferianism) " اور جدید "سیٹنزم (Satanism) " کی بنیاد بنیں۔ "لوسیفیرین ازم" میں "لوسیفر" کو روشنی، علم اور آزادی کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی عبادت یا کم از کم اس کے نظریات کی پیروی کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس "سیٹنزم" مکمل طور پر شیطانی عبادت اور اس کی قوتوں کو حاصل کرنے پر مبنی ہے۔ "سیٹینک تھیوسوفی" انہی عقائد کا ایک نرم اور فلسفیانہ ورژن ہے جو انسان کو دھوکے سے اس سمت لے جاتی ہے۔

اس کے ماننے والے دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں، خاص طور پر مغربی ممالک میں جہاں "تھیوسوفیکل سوسائٹیز (Theosophical Societies) " اور خفیہ روحانی گروہ سرگرم ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، جرمنی، روس، اور کچھ دیگر یورپی ممالک میں ان کے مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ ان کے خیالات کو عام کرنے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کیے

جاتے ہیں، جن میں خفیہ تنظیمیں، علمی و فلسفیانہ حلقے، اور خاص طور پر جدید پاپ کلچر (Pop Culture) کے ذریعے اثر ورسوخ پیدا کیا جاتا ہے۔

"سیٹنک تھیوسوفی" کی بعض خاص رسومات (Rituals) بھی ہوتی ہیں، جو مختلف سطحوں پر انجام دی جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ پوشیدہ اور خفیہ طور پر انجام دی جاتی ہیں، جبکہ کچھ کو "روحانی ترقی" کے عام اصولوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تاکہ عام انسانوں کو اس طرف مائل کیا جا سکے۔ سب سے عام رسم "باطنی مراقبہ (Esoteric Meditation) " ہے، جس میں مخصوص منتر (Mantras) پڑھے جاتے ہیں تاکہ شیطانی قوتوں یا "اعلیٰ مخفی ہستیوں (Higher Occult Beings) " سے رابطہ کیا جا سکے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ ان مراقبات کے ذریعے ایک شخص خفیہ علم حاصل کر سکتا ہے جو عام لوگوں کی پہنچ سے باہر ہوتا ہے۔

ایک اور رسم "شیطانی قوتوں کی رضا حاصل کرنا (Appeasement of Satanic Forces) " ہے، جو کبھی کبھار علامتی قربانی (Symbolic Sacrifice) یا کسی خاص "شیطانی ماسٹر (Satanic Master) " کی بیعت کے ذریعے کی جاتی ہے۔ کچھ شدت پسند گروہوں میں خون کی قربانی یا غیر اخلاقی اعمال کو بھی "روحانی تجربے" کا حصہ سمجھا جاتا ہے، لیکن عام طور پر "سیٹنک تھیوسوفی" اپنے پیروکاروں کو اس حد تک نہیں لے جاتی بلکہ ان کے ذہنوں میں صرف وہ نظریاتی مغالطے داخل کرتی ہے جو بعد میں انہیں عملی طور پر گمراہی میں دھکیل دیتے ہیں۔

"روشنی کے دائرے میں داخلہ (Initiation into the Circle of Light) "ایک اور اہم رسم ہے، جس میں نئے پیروکار کو ایک خفیہ قسم دی جاتی ہے کہ وہ "حقیقی روشنی" کی تلاش کے لیے ہر قسم کی مذہبی حدود اور روایتی تعلیمات کو ترک کر دے گا۔ یہ عمل عام طور پر خاص تقاریب میں انجام دیا جاتا ہے، جہاں مخصوص علامتی اشیاء جیسے کہ الٹی صلیب (Inverted Cross)، مثلث کی آنکھ(Eye of the Triangle) ، یاپانچ کونوں ولا ستارہ (Pentagram) استعمال کیے جاتے ہیں۔

"شیطانی مراقبے اور دعا (Satanic Prayers and Meditations) "بھی بعض حلقوں میں انجام دی جاتی ہیں، جن میں کچھ مخصوص الفاظ اور آیات پڑھی جاتی ہیں جو براہ راست شیطان یا اس کے "خفیہ نمائندوں (Hidden Masters) "کو مخاطب کرتی ہیں۔ بعض لوگ ان رسومات کو "ذہنی آزادی" اور "روحانی بالیدگی" کے نام پر اختیار کرتے ہیں، جبکہ حقیقت میں یہ انسان کو نفس پرستی، تکبر، اور الٰہی ہدایت سے انحراف کی راہ پر ڈال دیتی ہیں۔

"سیٹنک تھیوسوفی" بنیادی طور پر ایک فکری جال (Intellectual Trap) ہے جو روحانیت، عرفان، اور باطنی علوم کے نام پر انسانی ذہن کو دھوکا دیتی ہے۔ اس کے ماننے والے عام طور پر خود کو "روشن خیال (Enlightened) "اور "حقیقی حقیقت کے متلاشی (Seekers of True Reality) "کہتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں وہ ایک ایسے راستے پر چل رہے ہوتے ہیں جو انہیں تاریکی اور گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

فطرت سے قریب روزگار

انسان کی زندگی میں روزگار ایک لازمی عنصر ہے، لیکن اس کا اصل مقصد صرف پیسہ کمانا نہیں بلکہ ایک ایسی مصروفیت اپنانا ہے جو اس کی طبیعت اور رجحان کے مطابق ہو۔ اگر کوئی شخص محض دولت کے حصول کے لیے ایسا کام کرتا ہے جو اسے پسند نہیں، تو وہ بظاہر مادی لحاظ سے کامیاب ہو سکتا ہے، لیکن اندرونی طور پر وہ ہمیشہ بے چینی، عدم اطمینان اور ذہنی دباؤ کا شکار رہے گا۔ حقیقی خوشی اور سکون تب ہی حاصل ہوتا ہے جب انسان وہ کام کرے جس سے اسے لگاؤ ہو، کیونکہ پسندیدہ کام میں نہ صرف جذبہ اور لگن شامل ہوتی ہے بلکہ اس میں ترقی اور تخلیقی صلاحیتوں کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

ایسے لوگ جو محض مالی فائدے کی خاطر ناپسندیدہ پیشہ اختیار کرتے ہیں، وہ اکثر تھکاوٹ اور بیزاری محسوس کرتے ہیں اور ان کی زندگی میں مسرت اور طمانیت کی کمی رہتی ہے۔ وہ ہر روز اپنے کام کو بوجھ سمجھ کر کرتے ہیں، جس کا اثر نہ صرف ان کی ذہنی صحت پر پڑتا ہے بلکہ ان کے مجموعی طرزِ زندگی پر بھی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، جو لوگ اپنے پسندیدہ کام کو روزگار کا ذریعہ بناتے ہیں، وہ زیادہ خوش اور مطمئن رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے کام کو بوجھ نہیں بلکہ ایک شوق اور مقصد کے طور پر دیکھتے ہیں۔

محبت اور شوق سے کیا جانے والا کام صرف فرد کے لیے ہی نہیں بلکہ معاشرے کے لیے بھی زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ ایسے لوگ نہ صرف اپنی صلاحیتوں کو بہتر طریقے سے استعمال کرتے ہیں بلکہ اپنے شعبے میں نمایاں کارکردگی بھی دکھاتے ہیں۔ ان کا کام محض ایک ذریعۂ معاش نہیں بلکہ ان کی شخصیت اور کردار کا اظہار بن جاتا ہے، جس کی بدولت وہ خود کو زیادہ مطمئن اور کامیاب محسوس کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے کام سے محبت کرتے ہیں، وہ خود کو مسلسل سیکھنے اور بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اپنی فیلڈ میں دوسروں کے لیے ایک مثال بن جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی ناپسندیدہ کام میں محض دولت کے لیے مشغول ہو جائے تو وہ اندرونی اضطراب اور بے سکونی کا شکار ہو سکتا ہے، اور جب کوئی انسان اندر سے مطمئن نہ ہو تو اس کی دولت بھی اسے خوشی نہیں دے سکتی۔ حقیقی کامیابی اور خوشحالی تب حاصل ہوتی ہے جب انسان ایسا پیشہ اختیار کرے جو اس کے دل کے قریب ہو، کیونکہ دولت وقتی خوشی تو دے سکتی ہے، لیکن وہ طمانیت اور سکون نہیں دے سکتی جو ایک پسندیدہ اور بامقصد کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں محض دولت کے حصول کو زندگی کا مقصد نہیں بنایا گیا، بلکہ ایسا کام کرنے کی ترغیب دی گئی ہے جو نیک نیتی، اخلاص اور شوق کے ساتھ کیا جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے " : وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ "(النجم:39) یعنی انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اس آیت میں عمل اور محنت کی اہمیت کو اجاگر کیا

گیا ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں یہ حکمت بھی چھپی ہے کہ انسان جس چیز کی سعی کرے گا، وہی اس کے نصیب میں آئے گی۔ اگر وہ صرف دولت کو سامنے رکھ کر کام کرے گا تو وہ ایک مادی مقصد میں محدود ہو جائے گا، لیکن اگر وہ اپنے کام میں اخلاص، شوق اور نیک نیتی کو شامل کرے گا تو اس کا رزق بھی بابرکت ہو گا اور اس کی روح کو بھی تسکین حاصل ہو گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" :إن الله يحب إذا عمل أحدكم عملاً أن يتقنه" یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ جب کوئی کام کرے تو اسے خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ کرے۔ یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ اسلام میں محض کام کرنا مقصود نہیں، بلکہ دل جمعی، مہارت اور محبت کے ساتھ کام کرنا پسندیدہ ہے۔ جب انسان اپنے کام سے محبت کرے گا تو وہ اس میں بہتری لانے کی کوشش کرے گا، اور یہی رویہ نہ صرف اس کے لیے بلکہ معاشرے کے لیے بھی فائدہ مند ہو گا۔

امام علیؑ فرماتے ہیں" : الكاسب حبيب الله "یعنی محنت سے روزی کمانے والا اللہ کا محبوب ہے۔ لیکن اس محنت میں نیک نیتی اور پسندیدگی شامل ہونا ضروری ہے، کیونکہ اگر انسان کسی ایسے کام میں لگا رہے جو اس کے مزاج اور فطرت کے خلاف ہو، تو وہ بظاہر دولت تو کمائے گا، لیکن وہ روحانی اور نفسیاتی سکون سے محروم ہو جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں روزگار کے انتخاب میں صرف مالی فائدے کو معیار نہیں بنایا گیا، بلکہ اسے ایک عبادت کا درجہ دیا گیا ہے، جس میں نیت اور محبت کا عنصر بھی شامل ہونا ضروری ہے۔

حضرت علیؑ ہی کا ایک اور قول ہے " :لا تکن عبد غیرك وقد جعلك الله حرا "یعنی کسی اور کا غلام مت بنو، کیونکہ اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی پسند کے خلاف محض دولت کی خاطر کوئی کام کرتا ہے، تو وہ درحقیقت اپنی آزادی کھو دیتا ہے اور مادی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔ حقیقی آزادی تب حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنی صلاحیتوں، دلچسپیوں اور رجحانات کے مطابق کوئی کام کرے، کیونکہ تب ہی وہ اس میں خوشی اور برکت محسوس کرے گا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایک ایسا پیشہ اختیار کرنا جو دل کو خوشی اور روح کو سکون دے، نہ صرف فرد کے لیے فائدہ مند ہے بلکہ یہ ایک عبادت کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا کام جس میں نیت خالص ہو، جسے محبت اور لگن کے ساتھ کیا جائے، وہ نہ صرف دنیا میں کامیابی کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ آخرت میں بھی باعثِ اجر و ثواب بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رزقِ حلال کے ساتھ ساتھ کام میں سچائی، محنت، اور شوق کو بھی بنیادی اہمیت دی گئی ہے تاکہ انسان نہ صرف مالی طور پر خوشحال ہو بلکہ روحانی طور پر بھی مطمئن رہے۔

انسان کی فطرت سلیم اور اس کے اندر ودیعت کردہ رجحانات اسے ایک متوازن اور بامقصد زندگی گزارنے کی راہ دکھاتے ہیں۔ جب کوئی شخص ایسا پیشہ اختیار کرتا ہے جو اس کی فطرت، مزاج اور اندرونی صلاحیتوں سے ہم آہنگ ہو اور جو حلال و جائز ذرائع پر مبنی ہو، تو وہ کام اس کے لیے محض ذریعہ معاش نہیں رہتا بلکہ ایک روحانی تسکین اور قلبی راحت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایسا انسان اپنے کام میں خوشی محسوس کرتا ہے، اپنی ذمہ داریوں کو بوجھ

کے بجائے ایک نعمت سمجھ کر ادا کرتا ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے اندر ترقی، سکون اور طمانیت کا احساس پاتا ہے۔ اس کا دل مطمئن ہوتا ہے، اس کی زندگی میں ایک مقصدیت ہوتی ہے، اور وہ اپنے پیشے سے محبت کے باعث اپنی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرتا ہے۔

حلال روزگار کے ذریعے کمائی گئی دولت میں برکت ہوتی ہے، اور اس کی بدولت زندگی میں نہ صرف معاشی استحکام حاصل ہوتا ہے بلکہ سکون اور خوشحالی بھی نصیب ہوتی ہے۔ ایسے افراد اپنی زندگی کے ہر لمحے میں ایک خاص قسم کی خوشی محسوس کرتے ہیں، ان کے دن چین و سکون سے گزرتے ہیں اور وہ ہر حال میں اللہ کی رضا کو مد نظر رکھتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی طویل، صحت مند اور بامقصد ہوتی ہے، کیونکہ ان کے دل میں نہ کسی قسم کا دباؤ ہوتا ہے، نہ ضمیر کی خلش، اور نہ ہی ذہنی پریشانیوں کا بوجھ۔

اس کے برعکس، اگر کوئی شخص اپنی فطری صلاحیتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسا پیشہ اختیار کرلے جو اس کی طبیعت کے خلاف ہو، یا ایسا کام کرے جو حرام یا ناجائز ذرائع سے جڑا ہو، تو وہ ہمیشہ بے چینی، اضطراب اور ذہنی دباؤ کا شکار رہتا ہے۔ اسے اپنا کام محض ایک زبردستی کا بوجھ محسوس ہوتا ہے، اور اس کے دل میں کبھی بھی حقیقی خوشی پیدا نہیں ہوتی۔ ناجائز طریقوں سے کمائی گئی دولت ظاہری طور پر سہولتیں تو فراہم کر سکتی ہے، لیکن وہ دل کا سکون اور روح کی راحت کبھی نہیں دے سکتی جو ایک جائز اور پسندیدہ پیشے کے ذریعے نصیب ہوتی ہے۔ ایسا انسان ہمیشہ ایک اندرونی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ

نہ صرف ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار ہونے لگتا ہے بلکہ اس کے تعلقات بھی متاثر ہوتے ہیں اور وہ ایک بے مقصد اور بے سکون زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

حرام کمائی اور ناجائز پیشہ اختیار کرنے والے افراد اکثر زندگی میں شدید ذہنی دباؤ، خوف اور بے چینی کے شکار رہتے ہیں۔ وہ مستقل پریشان رہتے ہیں، کبھی اس فکر میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کا راز فاش نہ ہو جائے، کبھی اس خوف میں کہ دولت ضائع نہ ہو جائے، اور کبھی اس احساس جرم میں کہ ان کے اعمال کا انجام برا نہ ہو۔ ان کی راتیں بے سکونی میں گزرتی ہیں، ان کے رشتے تناؤ کا شکار ہو جاتے ہیں، اور ان کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایسے افراد عام طور پر زیادہ عرصے تک نہیں جی پاتے اور ان کی زندگی میں حقیقی خوشی اور سکون ناپید ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنی فطرت سلیم کے مطابق، حلال اور جائز ذرائع سے روزی کماتا ہے، وہ ہمیشہ مطمئن اور خوشحال زندگی بسر کرتا ہے، اس کے دل میں امن ہوتا ہے، اور وہ اپنی عمر طویل اور بامقصد طریقے سے گزارتا ہے۔ جبکہ جو شخص اپنی فطرت کے خلاف یا ناجائز طریقے سے دولت کمانے کا راستہ اختیار کرتا ہے، وہ ہمیشہ بے چین، مضطرب اور ذہنی دباؤ میں رہتا ہے، اور اس کی زندگی اکثر قلیل اور بے مقصد ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ انسان ایسا پیشہ اختیار کرے جو اس کی فطرت، صلاحیتوں اور اخلاقی اقدار سے ہم آہنگ ہو، تاکہ اس کی دنیا بھی سنورے اور آخرت بھی کامیاب ہو۔

معاشی زندگی کی حدود

انسانی زندگی میں معیشت کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے انسانی جسم میں پیروں کی۔ جس طرح ایک انسان کے لیے چلنے پھرنے، آگے بڑھنے اور متوازن زندگی گزارنے کے لیے اس کے پیر ضروری ہوتے ہیں، اسی طرح ایک فرد یا معاشرے کے لیے ترقی، استحکام اور خوشحالی کے لیے معیشت کی اہمیت بنیادی اور ناگزیر ہے۔ معیشت کے بغیر زندگی کا تسلسل مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ بنیادی ضروریات کی تکمیل، بہتر معیارِ زندگی، تعلیمی و سماجی ترقی اور عزت و وقار کے ساتھ جینے کا دار و مدار اسی پر ہوتا ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ معیشت نہ تو ایسی چیز ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے اور نہ ہی اسے ہر چیز پر فوقیت دے کر مقصدِ حیات بنا لینا چاہیے۔ اس حوالے سے ایک دلچسپ مثال حضرت امام علیؑ کے قول سے لی جا سکتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے امام سے سوال کیا کہ انسان کتنا آزاد ہے اور کتنا مجبور؟ امام نے اس شخص کو حکم دیا کہ وہ اپنی ایک ٹانگ اٹھائے، اس شخص نے فوراً ایک ٹانگ اٹھالی۔ پھر امام نے فرمایا کہ اب دوسری ٹانگ بھی اٹھاؤ۔ اس پر وہ شخص حیران ہو گیا اور کہا کہ اگر دوسری ٹانگ بھی اٹھاؤں گا تو گر جاؤں گا۔ امام نے فرمایا کہ بس انسان اتنا ہی آزاد ہے اور اتنا ہی مجبور۔

یہی اصول معیشت پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی میں معیشت اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کے بعد دوسری ٹانگ کی۔ اگر کوئی شخص اپنی روزمرہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے معیشت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دے تو وہ زندگی میں بے یقینی اور مشکلات کا شکار ہو جائے گا، جس طرح کوئی شخص ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر متوازن نہیں رہ سکتا۔ دوسری جانب اگر کوئی شخص معیشت کو ہی سب کچھ سمجھ لے اور ساری زندگی دولت اکٹھی کرنے میں گزار دے، تو یہ بھی ایک انتہائی نامناسب رویہ ہو گا، کیونکہ زندگی کا اصل مقصد صرف معاشی ترقی نہیں بلکہ روحانی، اخلاقی اور فکری ترقی بھی ہے۔

یوں معیشت کو نہ مکمل نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے انسان کی کل زندگی بنا لینا چاہیے۔ ایک متوازن زندگی وہی ہے جس میں معیشت کو ایک وسیلہ سمجھا جائے، نہ کہ زندگی کا حتمی ہدف۔ معیشت کو اتنی ہی اہمیت دی جانی چاہیے جتنی ضروریاتِ زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لیے درکار ہو، لیکن اسے اپنی اخلاقی اور روحانی ترقی پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ یہی وہ نقطہ ہے جو امام علیؑ کی اس حکمت بھری مثال سے ہمیں سمجھنے کو ملتا ہے۔

معاشی زندگی کی حدود کا تعین ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ہمیشہ غور و فکر کی ضرورت رہتی ہے، کیونکہ انسان کی زندگی دو پہلوؤں پر مشتمل ہے: مادی اور روحانی۔ اگر ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا نہ کی جائے تو زندگی یا تو دنیاوی حرص و طمع میں الجھ کر بے مقصد ہو جاتی ہے یا پھر

محض روحانی خیالات میں گم ہو کر عملیت سے خالی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے معیشت کو ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر تسلیم کیا لیکن اسے مقصدِ حیات بنانے سے روکا۔

انسانی زندگی میں معیشت کی حیثیت ایک ذریعہ کی سی ہے نہ کہ مقصد کی۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے: وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا(القصص: 77) یعنی جو کچھ اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے، اس کے ذریعے آخرت کی بہتری تلاش کرو اور دنیا میں اپنا حصہ بھی فراموش نہ کرو۔ یہ آیت اس بنیادی حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ معیشت کو زندگی میں ایک معاون اور سہارا سمجھنا چاہیے، نہ کہ اس کی غلامی میں مبتلا ہو کر اپنی حقیقت کو فراموش کر دینا چاہیے۔

معاشی ترقی کا مقصد انسان کو ایک باوقار، خوددار اور پرسکون زندگی فراہم کرنا ہے، لیکن اگر یہی معیشت انسانی اخلاقیات، سماجی انصاف اور روحانی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بننے لگے، تو پھر یہ زندگی کے لیے ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں" :دنیا کی حرص سب سے بڑی غربت ہے۔ "یعنی اگر انسان محض دولت جمع کرنے کے پیچھے بھاگتا رہے تو وہ کبھی بھی حقیقی طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس جو شخص معیشت کو اپنی ضروریات تک محدود رکھتا ہے اور دولت کو وسیلہ سمجھ کر اپنے اخلاقی اور روحانی اقدار کو اولیت دیتا ہے، وہی حقیقی طور پر امیر اور خوشحال ہوتا ہے۔

دنیاوی اور اخروی زندگی کے درمیان توازن قائم کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص صرف دنیاوی مال و دولت کے پیچھے دوڑتا رہے اور اپنی روحانی ترقی کو نظر انداز کر دے، تو وہ ایک

بے قرار اور غیر مطمئن زندگی گزارے گا۔ دوسری جانب، اگر کوئی شخص دنیاوی اسباب کو بالکل ترک کر کے محض عبادت اور روحانی مشاغل میں مشغول ہو جائے اور اپنی بنیادی ضروریات کو بھی پورا نہ کرے، تو یہ بھی ایک غیر متوازن طرزِ زندگی ہو گا۔ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں" :جو شخص دنیا کے لیے کام نہ کرے، وہ آخرت کے لیے بھی کمزور ہو جائے گا۔ "اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات دنیا اور آخرت کے درمیان ایک اعتدال پسند راہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

معیشت کی حدود کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی ضروریات، خواہشات اور اخلاقیات کے درمیان فرق کرے۔ ضروریات کو پورا کرنا فطری اور مطلوب ہے، خواہشات کو کنٹرول میں رکھنا عقلمندی ہے، اور اخلاقیات پر سمجھوتہ کرنا سراسر نقصان دہ ہے۔ جو لوگ جائز اور حلال ذرائع سے رزق کماتے ہیں اور اسے معتدل انداز میں خرچ کرتے ہیں، وہی حقیقی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے :وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان:67) یعنی وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں، بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

زندگی کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ انسان مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی کو بھی مد نظر رکھے، دولت کو اپنا غلام بنائے نہ کہ خود اس کا غلام بن جائے، اور معاشی وسائل کو اس طرح استعمال کرے کہ نہ صرف اس کی دنیا بہتر ہو بلکہ آخرت میں بھی کامیابی اس کا مقدر

بنے۔ ایک متوازن معیشت ہی حقیقی خوشحالی کی ضمانت دے سکتی ہے، جو نہ صرف جسمانی ضروریات کو پورا کرے بلکہ ذہنی سکون اور روحانی طمانیت بھی فراہم کرے۔

مغرب کی سادگی اور مشرق کی اشرافیہ — حقیقت یا مغالطہ؟

اکثر پاکستانی سوشل میڈیا پر ایسی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں مغربی ممالک کے طاقتور افراد کی سادگی کو ہمارے اشرافیہ کے تکبر اور شان و شوکت سے جوڑا جاتا ہے۔ بل گیٹس کا برگر کے لیے قطار میں کھڑا ہونا، امریکی صدور کا خود گاڑی چلانا، یا یورپی وزرائے اعظم کا سائیکل پر دفتر جانا، ان تمام مثالوں کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے جیسے مغرب کی ترقی کا راز ان کی سادگی میں پوشیدہ ہو اور ہمارے زوال کا سبب صرف حکمران طبقے کی شاہانہ طرزِ زندگی ہو۔ یہ بیانیہ بظاہر دلکش لگتا ہے، لیکن حقیقت اس سے کہیں زیادہ گہری اور پیچیدہ ہے۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ طاقت اور اثر و رسوخ کے اظہار کے طریقے مختلف معاشروں میں مختلف ہوتے ہیں۔ مغرب میں طاقتور طبقہ عوام کی نظر میں خود کو ایک عام شہری کے طور پر پیش کرتا ہے، لیکن اس کے اثرات اور پالیسیوں کا دائرہ پوری دنیا تک پھیلا ہوتا ہے۔ بل گیٹس جیسے افراد، جو بظاہر ایک عام شہری کی طرح قطار میں کھڑے ہوتے ہیں، درحقیقت عالمی سطح پر پالیسیوں، معیشت، ٹیکنالوجی اور صحت کے نظام پر وہ اختیار رکھتے ہیں جو کسی بادشاہ یا آمر کے پاس بھی نہیں۔ وہ عالمی اداروں، این جی اوز، فارماسیوٹیکل کمپنیوں اور ڈیجیٹل معیشت کے ذریعے دنیا کی سمت متعین کرتے ہیں۔ ان کی سادگی درحقیقت ایک

سوشل کنسٹرکشن ہے، جو عوام میں قبولیت حاصل کرنے کے لیے تیار کی جاتی ہے، تاکہ ان کے استعماری عزائم اور سرمایہ دارانہ تسلط کو انسانی ہمدردی، خیرات اور ترقی کے نام پر چھپایا جاسکے۔

دوسری طرف، پاکستان جیسے ممالک میں طاقت کا اظہار مختلف انداز میں ہوتا ہے۔ یہاں کے حکمران اور اشرافیہ بڑے قافلوں، سیکورٹی پروٹوکول، اور عوام سے الگ تھلگ طرزِ زندگی کے ذریعے اپنے اثر و رسوخ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ استحصالی نظام کی ایک اور شکل ہے، جہاں طاقتور طبقہ اپنی برتری عوام کو باور کرانے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کرتا ہے۔ پاکستانی وڈیروں، جاگیرداروں اور سیاستدانوں کا اندازِ زندگی دراصل اُس طبقاتی تقسیم کا عکاس ہے جو نوآبادیاتی دور سے چلی آرہی ہے۔ ان کے لیے طاقت کا اظہار ضروری ہے، کیونکہ عوام کو دباکر رکھنے کے لیے خوف اور مرعوبیت کو برقرار رکھنا لازم ہے۔

مغربی اور پاکستانی طاقتور طبقے میں فرق صرف طریقہ کار کا ہے، مقصد ایک ہی ہے: عوام کو ایک ایسے نظام میں جکڑ کر رکھنا جہاں وہ کبھی بھی ان کے اثر و رسوخ کو چیلنج نہ کرسکیں۔ مغربی طاقتور طبقہ ذہنوں کو قابو کرنے کے لیے میڈیا، تعلیم، اور "نرم طاقت (Soft Power)" کا سہارا لیتا ہے، جبکہ پاکستانی اشرافیہ طاقت، خوف، تعلقات اور ادارہ جاتی کنٹرول کے ذریعے عوام پر اپنا تسلط قائم رکھتی ہے۔ دونوں جگہوں پر طاقت کے کھیل کا اصول ایک ہی ہے، بس طریقے مختلف ہیں۔

اس لیے جب کوئی مغربی رہنما یا کاروباری شخصیت عوامی جگہ پر سادگی کا مظاہرہ کرے، تو اسے محض ظاہری حسنِ سلوک کے طور پر نہ دیکھا جائے بلکہ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس کے پیچھے کون سے طاقت کے مراکز کام کر رہے ہیں۔ بل گیٹس جیسے افراد کی اصل طاقت کسی برگر شاپ میں قطار میں کھڑے ہونے سے ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ عالمی صحت، ڈیجیٹل کنٹرول، اور پالیسی سازی پر ان کے اثر سے سامنے آتی ہے۔ یہی بات پاکستانی اشرافیہ پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ ان کا مسئلہ صرف شاہانہ طرزِ زندگی نہیں، بلکہ وہ نظام ہے جس کے تحت وہ اقتدار میں رہتے ہیں اور اپنے استحصالی ڈھانچے کو قائم رکھتے ہیں۔

اصل مسئلہ سادگی یا پروٹوکول نہیں، بلکہ وہ نادیدہ ڈھانچہ ہے جو طاقت کو برقرار رکھتا ہے۔ پاکستانیوں کو ان مغالطوں سے نکل کر حقیقی استعماری چالوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ صرف مغرب کی سادگی کو دیکھ کر مرعوب ہونا اور پاکستانی اشرافیہ کے ظاہری پروٹوکول کو تنقید کا نشانہ بنانا اصل مسئلے کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ حقیقی سوال یہ نہیں کہ طاقتور شخص کیسے نظر آتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی طاقت کہاں اور کیسے استعمال کر رہا ہے۔

منافقانہ مسکراہٹ کے پیچھے خونخوار جبڑے

استعماری طاقتیں ہمیشہ ایسے حربے اپناتی ہیں جن کے ذریعے ان کے استحصالی نظام پر پردہ ڈالا جا سکے اور ان کے مظالم کو ایک "مہذب" اور "انسان دوست" چہرہ دیا جا سکے۔ جدید دور میں میڈیا، سوشل نیٹ ورکس، اور خیراتی مہمات کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ عام عوام کو یہ محسوس ہو کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ قدرتی طور پر وقوع پذیر ہو رہا ہے، نہ کہ کسی منظم استحصالی حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ یہ وہ جدید غلامی ہے جو لوگوں کے ذہنوں کو قابو میں رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے تاکہ وہ حقیقی آزادی اور عدل و انصاف کے لیے بیدار نہ ہو سکیں۔

استعمار کے طریقے بدل چکے ہیں، مگر ان کا اصل مقصد وہی ہے: کمزور اقوام کو زیرِ نگیں رکھنا اور ان کے وسائل کو لوٹنا۔ آج کے دور میں براہِ راست نوآبادیات قائم کرنا مشکل ہو چکا ہے، اس لیے استعماری قوتیں ایک نیا حربہ اپناتی ہیں، جسے "نرم استحصال" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں عوام کو غربت میں مبتلا رکھنے کے باوجود یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ دنیا میں خیر کا وجود اب بھی باقی ہے اور اگر کوئی مدد کے لیے آگے بڑھتا ہے تو یہ ایک غیر معمولی عمل ہے جسے سراہا جانا چاہیے۔ چنانچہ ایک فرد کسی بھوکے کو کھانا کھلا دے، کسی بیمار کے علاج کا بندوبست کر

دے، یا کسی قرض دار کا بوجھ ہلکا کر دے، تو میڈیا اسے غیر معمولی واقعہ بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ اصل مسئلے سے توجہ ہٹائی جا سکے۔

استعمار کے یہ طریقے ان مظالم پر پردہ ڈالنے کے لیے ہیں جو وہ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر روا رکھے ہوئے ہیں۔ جب فلسطین، کشمیر، یمن، اور دیگر مظلوم اقوام کے حقوق غصب کیے جاتے ہیں، تو بین الاقوامی میڈیا ان جرائم کو یا تو نظر انداز کرتا ہے یا انہیں اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ مظلوم ہی قصوروار نظر آئیں۔ ایسے میں، اگر کوئی عالمی ادارہ کسی بے گھر فلسطینی کو چند ڈالر کی امداد دے، یا کسی شامی مہاجر کے لیے خیراتی کیمپ قائم کرے، تو یہی میڈیا اس "انسان دوستی" کی خوب تشہیر کرتا ہے تاکہ استعماری طاقتوں کے ہاتھوں کیے جانے والے اصل جرائم پسِ پردہ چلے جائیں۔

تاریخ میں بھی یہی طریقے استعمال کیے گئے۔ برطانوی سامراج نے ہندوستان میں لاکھوں افراد کو قحط اور غربت میں مبتلا کر دیا اور جب عوام بغاوت پر آمادہ ہوئے، تو انہوں نے چند خیراتی ادارے قائم کر دیے تاکہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ برطانوی حکومت انسان دوست ہے۔ فرانس نے الجزائر میں لاکھوں لوگوں کو قتل کیا، مگر ساتھ ہی ساتھ ایسے اسکول اور اسپتال بھی بنائے جہاں ان کی ثقافت کو مٹایا جا سکے اور انہیں مغربی سانچے میں ڈھالا جا سکے۔ یہی حربہ جدید دور میں نیو کالونیل طاقتیں استعمال کر رہی ہیں، جہاں غربت، استحصال، اور وسائل کی لوٹ مار جاری رہتی ہے، مگر میڈیا اور خیراتی ادارے اس استحصال کو چھپانے کے لیے میدان میں آجاتے ہیں۔

جدید استعماری طاقتوں کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے جو حکمت عملی اپنائی جاتی ہے، وہ تاریخ میں بارہا دہرائی جاچکی ہے۔ جب امریکہ نے ویتنام پر وحشیانہ بمباری کی اور لاکھوں بے گناہ شہریوں کو قتل کیا، تو ایک طرف وہ جنگ جاری رکھے ہوئے تھا اور دوسری طرف مغربی میڈیا میں امریکی خیراتی اداروں کو دکھایا جارہا تھا جو ویتنامی بچوں کو خوراک اور دوائیں فراہم کررہے تھے۔ یہ حکمت عملی صرف ویتنام تک محدود نہ رہی بلکہ عراق پر حملے کے بعد جب لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے اور بچوں کی ایک بڑی تعداد غذائی قلت کا شکار ہوئی، تو انہی استعماری طاقتوں نے این جی اوز کے ذریعے وہاں امداد بھیج کر دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ مظلوموں کے خیر خواہ ہیں۔ حالانکہ اگر یہی طاقتیں ان ممالک پر حملے نہ کرتیں تو ان بحرانوں کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

افغانستان پر بیس سالہ امریکی قبضے کے دوران یہی حکمت عملی مسلسل دہرائی جاتی رہی۔ پہلے اس ملک پر قبضہ کیا گیا، ہزاروں معصوم شہریوں کو مارا گیا، اور معیشت کو اس قدر تباہ کر دیا گیا کہ وہاں غربت اور بھوک عام ہو گئی۔ اس کے بعد انہی مغربی طاقتوں نے خیراتی مہمات شروع کیں، جہاں چند مغربی خواتین اور تنظیموں کو دکھایا جاتا تھا کہ وہ افغان بچوں کو تعلیم اور خوراک فراہم کررہی ہیں۔ میڈیا میں اس استحصالی سچائی کو اس طرح چھپایا گیا کہ دنیا کے بیشتر لوگ اصل مسئلے کو بھول کر ان "انسانی ہمدردی" کے اقدامات کو سراہنے لگے، حالانکہ اگر امریکہ اور نیٹو ممالک افغانستان میں تباہی نہ پھیلاتے تو یہ تمام خیراتی کاموں کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

افریقی ممالک میں بھی یہی استعماری حربہ استعمال کیا گیا۔ کانگو، نائجیریا اور دیگر افریقی ممالک میں یورپی اقوام نے بے تحاشا وسائل لوٹے، مقامی معیشتوں کو تباہ کیا، اور سیاسی عدم استحکام پیدا کیا۔ اس کے نتیجے میں قحط اور خانہ جنگیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا، اور پھر انہی مغربی طاقتوں نے بڑے پیمانے پر خیراتی ادارے قائم کیے جو افریقی بچوں کو خوراک، پانی اور دوائیں فراہم کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر افریقہ کے قدرتی وسائل کا استحصال نہ کیا جاتا تو یہ براعظم آج دنیا کے امیر ترین خطوں میں شمار ہوتا، مگر استعماری طاقتیں اس حقیقت کو چھپانے کے لیے "چیریٹی" کے ہتھیار کو استعمال کرتی ہیں تاکہ اصل مسئلے پر کوئی بات نہ کرے۔

شام کی جنگ میں بھی یہی عمل دہرایا گیا۔ جب مغربی ممالک نے دہشت گرد گروہوں کی پشت پناہی کی اور شام میں خانہ جنگی کو ہوا دی، تو اس کے نتیجے میں لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے اور لاکھوں بچوں کی زندگی برباد ہو گئی۔ اس کے بعد وہی مغربی ممالک جنہوں نے یہ تباہی پیدا کی تھی، مہاجرین کے لیے امدادی کیمپ اور خیراتی تنظیمیں قائم کرکے یہ تاثر دینے لگے کہ وہ انسانیت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ سب کچھ ان کے اپنے پیدا کردہ مسائل پر پردہ ڈالنے کا ایک نیا حربہ تھا تاکہ عوام کی توجہ جنگ کے اصل محرکات سے ہٹائی جا سکے۔

یہی کچھ یمن میں بھی ہو رہا ہے، جہاں مغربی ممالک نے سعودی عرب اور دیگر طاقتوں کو اسلحہ فراہم کیا تاکہ وہ یمنی عوام پر جنگ مسلط کریں۔ لاکھوں یمنی بچے قحط اور بیماریوں کا شکار

ہو گئے، اور پھر مغربی این جی اوز سامنے آکر یمنی عوام کو خوراک اور طبی امداد دینے لگیں۔ یہ ایک ایسا منافقانہ عمل ہے جہاں پہلے کسی قوم کو تباہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کی "مدد" کے نام پر اصل جرائم پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔

اسی طرح فلسطین میں، جہاں اسرائیل مغربی پشت پناہی سے مسلسل مظالم ڈھا رہا ہے، مغربی میڈیا بار بار ان این جی اوز کی تشہیر کرتا ہے جو فلسطینی بچوں کو تعلیم، صحت اور خوراک مہیا کر رہی ہیں، لیکن کوئی یہ سوال نہیں اٹھاتا کہ ان بچوں کو اس حالت میں پہنچانے کا ذمہ دار کون ہے۔ یہ تمام مثالیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ استعماری طاقتیں نہ صرف مظلوموں کو کچلتی ہیں بلکہ ان کے دکھوں کو چھپانے کے لیے "چیریٹی" اور "انسانی ہمدردی" کے نام پر اپنی ساکھ کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔

یہ حکمت عملی صرف جنگ زدہ علاقوں تک محدود نہیں بلکہ عالمی مالیاتی نظام میں بھی یہی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے جیسے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک ترقی پذیر ممالک کو ایسے قرضے دیتے ہیں جو ان کی معیشت کو مزید کمزور کر دیتے ہیں۔ جب ان ممالک کی معیشت دیوالیہ ہو جاتی ہے اور عوام غربت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو یہی عالمی ادارے امدادی پیکجز اور فلاحی پروگرام شروع کر کے خود کو انسانیت کے مسیحا کے طور پر پیش کرنے لگتے ہیں۔ اس کے ذریعے وہ اپنی اصل سازشوں کو چھپاتے ہیں اور عوام کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہی ان کی نجات دہندہ ہیں، حالانکہ یہ سب کچھ انہی کے پیدا کردہ بحرانوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

یہ تمام مثالیں ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ جدید غلامی اور استعماری طاقتیں براہ راست تسلط قائم کرنے کے بجائے نفسیاتی اور اقتصادی جنگ کے ذریعے قوموں کو غلام بناتی ہیں۔ وہ پہلے بحران پیدا کرتی ہیں، جنگوں کو ہوا دیتی ہیں، معیشتوں کو تباہ کرتی ہیں، اور پھر انہی بحرانوں کے حل کے طور پر خود کو پیش کر کے اصل حقیقت پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ اگر مظلوم اقوام اس چال کو نہ سمجھیں اور اس کے خلاف مزاحمت نہ کریں، تو وہ ہمیشہ انہی استعماری طاقتوں کی غلامی میں رہیں گی۔

مسلمانوں اور دیگر مظلوم اقوام کو یہ سمجھنا ہو گا کہ خیرات اور امداد کی ترغیب دینا کافی نہیں بلکہ ان مسائل کی جڑ کو ختم کرنا ضروری ہے جو استعماری طاقتوں نے پیدا کیے ہیں۔ اگر دنیا میں انصاف ہوتا، تو پھر خیرات کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، کیونکہ ہر شخص کو اس کا حق مل جاتا۔ جب فلسطینی بچے یتیم ہوتے ہیں، جب یمنی بچے غذائی قلت سے مرتے ہیں، جب شام اور افغانستان کے عوام مہاجر بن کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں، تو اس کی بنیادی وجہ وہ استحصالی نظام ہے جس نے انہیں اس حال تک پہنچایا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں خیرات سے زیادہ عدل اور انصاف پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ " معاشرے کفر پر تو قائم رہ سکتے ہیں، مگر ظلم پر نہیں۔" اگر آج مسلم دنیا اس استحصال کے خلاف کھڑی ہو جائے اور اپنی طاقت کو یکجا کر کے ان استعماری سازشوں کو بے نقاب کرے، تو یہی طاقتور مغربی سامراج کمزور ہو سکتا ہے۔ آج کا استعماری نظام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی تباہ حالی کو تقدیر سمجھ کر قبول کر لیں اور خیرات کے سہارے

اپنی زندگی گزاریں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر امتِ مسلمہ ایران کی مانند استقامت اور خود مختاری کا مظاہرہ کرے تو وہ نہ صرف خود ان استحصالی زنجیروں کو توڑ سکتی ہے بلکہ دیگر اقوام کے لیے بھی آزادی اور خود انحصاری کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔

مسئلہ یہ نہیں کہ کسی محتاج کی مدد کیوں کی جارہی ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ محتاجی پیدا ہی کیوں ہوئی اور اس کا مستقل حل کیا ہے؟ استعماری قوتیں نہیں چاہتیں کہ یہ سوال اٹھے، کیونکہ اگر مظلوم اقوام اپنے حقوق کے لیے کھڑی ہو جائیں، تو پھر خیرات دینے والے ہاتھ خود اپنے جرائم کی وجہ سے کٹ سکتے ہیں۔ جدید غلامی کا اصل ہتھیار یہی ہے کہ مظلوم کو احساس تک نہ ہونے دیا جائے کہ وہ غلامی میں جی رہا ہے۔ جب تک یہ شعور پیدا نہیں ہو گا، دنیا میں استحصال اور ظلم کا سلسلہ جاری رہے گا۔

نفسیاتی و جذباتی بلوغت کی علامات

جذباتی بلوغت ایک ایسی نعمت ہے جو انسان کو زندگی کے نشیب و فراز میں متوازن اور باوقار بناتی ہے۔ ایک بالغ اور پختہ ذہن رکھنے والا شخص نہ صرف اپنی غلطیوں کو تسلیم کرتا ہے بلکہ انہیں سدھارنے کے لیے بھی تیار رہتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "عقلمند وہ ہے جو اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لے اور اپنی اصلاح کرے۔" انسان کی ناپختگی کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ تنقید کو برا مانتا ہے، حالانکہ تنقید اگر تعمیری ہو تو وہ شخصیت سازی کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔ جو شخص اپنی اصلاح کے لیے تنقید کو سننے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہی کامیابی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

زندگی میں معذرت خواہی کا ہنر ایک بڑی خوبی ہے۔ بعض لوگ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں، لیکن جو شخص اپنی کوتاہی پر نادم ہو کر خلوص نیت سے معافی مانگ لیتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے، وہ حقیقی معنوں میں کامیاب ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں" :سب سے بڑا نادان وہ ہے جو اپنی غلطی پر اصرار کرے۔ " معافی مانگنا کمزوری نہیں بلکہ ایک مضبوط کردار کی علامت ہے۔

ہر انسان کو یہ حقیقت قبول کرنی چاہیے کہ دنیا میں ہر کوئی اسے پسند نہیں کرے گا۔ دوسروں کی پسند اور ناپسند پر زیادہ توجہ دینا خود اعتمادی کو کمزور کر دیتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ

فرماتے ہیں" : جس نے لوگوں کی خوشنودی کو اللہ کی ناراضی پر مقدم رکھا، وہ ہمیشہ خسارے میں رہا۔ "حقیقی اطمینان اسی میں ہے کہ ہم اپنی ذات کو بہتر بنانے کی کوشش کریں اور لوگوں کی غیر ضروری آرا سے متاثر نہ ہوں۔

مسائل اور اختلافات کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کا سامنا کرنا بالغ ذہنیت کی نشانی ہے۔ کئی لوگ مشکل باتوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وقت کے ساتھ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ٹال مٹول سے مسائل مزید پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ امام علیؑ فرماتے ہیں" : جب تمہیں سچ کہنے کا موقع ملے تو خاموشی اختیار نہ کرو۔ "جو شخص حقیقت کا سامنا کرنے کی جرات رکھتا ہے، وہی ذہنی سکون حاصل کرتا ہے۔

ناکامی کو تسلیم کرنا اور اس کا ذمہ دار دوسروں کو نہ ٹھہرانا ایک پختہ سوچ کی علامت ہے۔ جو شخص اپنی غلطیوں کے لیے بہانے تراشتا ہے، وہ کبھی سیکھنے اور بہتر ہونے کا موقع نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے" : بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔ "(سورہ الرعد: 11) جو شخص اپنی کوتاہیوں کو قبول کرکے ان سے سیکھتا ہے، وہی آگے بڑھتا ہے۔

دوسروں کی برائیاں کرنا اور غیبت میں مشغول رہنا کمزور اور غیر محفوظ ذہن کی علامت ہے۔ جو لوگ دوسروں کی خامیوں کو اچھالنے میں وقت ضائع کرتے ہیں، وہ درحقیقت اپنی شخصیت کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر رہے ہوتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا" :غیبت کرنا ایسا ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ "ایک بالغ اور متوازن شخصیت رکھنے والا شخص دوسروں کی اصلاح کے لیے دعا کرتا ہے، نہ کہ ان کے عیبوں کو اچھالنے میں مصروف رہتا ہے۔

کبھی کبھی دوسروں کو جیتنے دینا اور اپنے حق سے دستبردار ہونا حکمت اور بالغ نظری کی نشانی ہے۔ جو لوگ ہر وقت خود کو برتر ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں، وہ نہ صرف اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں بلکہ دوسروں کے دلوں میں بھی نفرت پیدا کر لیتے ہیں۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں" : عقلمند وہ ہے جو بعض اوقات جھکنا جانتا ہو۔ "ہر بحث جیتنا ضروری نہیں، بعض اوقات خاموشی اور درگزر زیادہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔

سچائی کو قبول کرنا اور اپنی غلطی تسلیم کرنا ایک بہادر انسان کی علامت ہے۔ جو لوگ اپنی کوتاہیوں کو چھپانے کے لیے بہانے بناتے ہیں، وہ خود فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ امام علیؑ فرماتے ہیں" : حق بات کو ماننے میں دیر نہ کرو، کیونکہ وہی تمہیں نجات دے گا۔ "پختہ ذہن رکھنے والا انسان اپنی اصلاح کو اپنی انا پر فوقیت دیتا ہے۔

دوسروں کی خوشی میں خوش ہونا اور حسد سے بچنا ایک اعلیٰ ظرفی کی علامت ہے۔ حسد کرنے والا شخص ہمیشہ بے سکون رہتا ہے، جبکہ جو شخص دوسروں کی کامیابی پر خوش ہوتا ہے، وہ حقیقی طور پر مطمئن ہوتا ہے۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے" : کیا وہ لوگوں سے اس چیز پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی

ہے؟) "سورہ النساء:54)جو دل دوسروں کی خوشیوں پر خوش ہونا سیکھ لیتا ہے، وہ ہمیشہ پر سکون رہتا ہے۔

دوسروں کی بات تحمل سے سننا اور فوراً دفاعی رویہ اختیار نہ کرنا ایک باشعور انسان کی خوبی ہے۔ جو شخص ہر بات کا فوری ردعمل دیتا ہے، وہ اپنی کمزوری ظاہر کرتا ہے، جبکہ تحمل سے سننے والا شخص ہمیشہ بہتر فیصلے کرتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" :جو خاموش رہا، وہ نجات پا گیا۔ "غور و فکر کے بغیر ردعمل دینا کئی بار ہمیں پریشانی میں ڈال دیتا ہے، اس لیے صبر اور تحمل ضروری ہے۔

نامناسب اور نقصان دہ تعلقات سے خود کو دور کرنا ایک بالغ اور سمجھدار انسان کی نشانی ہے۔ بعض اوقات جذبات کی شدت ہمیں ایسے رشتوں میں باندھ دیتی ہے جو ہمارے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں، لیکن سمجھدار وہی ہوتا ہے جو اپنی عزت نفس کی حفاظت کرتے ہوئے ایسے تعلقات سے کنارہ کش ہو جائے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں" :خود کو بے وقوفوں کی صحبت سے بچاؤ، کیونکہ وہ تمہیں بھی اپنی طرح کر دیں گے۔ "اپنی عزت نفس کا خیال رکھنا جذباتی بلوغت کی علامت ہے۔

علم کا حقیقی ادراک یہ ہے کہ انسان اپنی جہالت کو پہچانے اور بغیر علم کے دعویٰ نہ کرے۔ جو شخص بغیر علم کے گفتگو کرتا ہے، وہ خود کو اور دوسروں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں" :اگر نہیں جانتے تو کہو 'نہیں جانتا'، کیونکہ یہی علم کا

نصف حصہ ہے۔ "اپنی لاعلمی کو تسلیم کرنا شرمندگی کی بات نہیں بلکہ حکمت کی علامت ہے۔

زندگی میں جذباتی بلوغت کا مظاہرہ کرنا ہی اصل حکمت اور دانائی ہے۔ جو شخص اپنی ذات کی بہتری پر کام کرتا ہے، وہی دوسروں کے لیے بھی مثال بنتا ہے۔ نفس کی اصلاح اور حکمت کے ساتھ جینے والا شخص دنیا و آخرت میں کامیاب ہوتا ہے۔

جذباتی بلوغت کا سفر خود شناسی، صبر، اور حکمت کا امتزاج ہے۔ انسان جب اپنے جذبات کو سمجھنے اور ان پر قابو پانے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے، تبھی وہ زندگی کے مختلف نشیب و فراز کا سامنا وقار اور سمجھداری کے ساتھ کر سکتا ہے۔ حقیقی ذہانت صرف علم میں نہیں بلکہ اس علم پر عمل کرنے میں بھی ہے۔ جو شخص دوسروں کی بات سننے کا حوصلہ رکھتا ہے اور اختلافات کو عقل و بردباری سے حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہی ذہنی اور روحانی طور پر ترقی پاتا ہے۔

انسان کو ہمیشہ اپنی ذات پر کام کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ کمال کی راہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جو شخص خود کو بہتر بنانے میں لگا رہتا ہے، وہ نہ صرف اپنی زندگی کو سنوارتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک مثالی نمونہ بنتا ہے۔ زندگی میں جو چیزیں ہمارے قابو میں نہیں، ان پر بے جا پریشان ہونے کے بجائے، ان معاملات کو اللہ پر چھوڑ دینا سکونِ قلب کا ذریعہ بنتا ہے۔ حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے، وہ کبھی ناامید نہیں ہوتا۔ جو چیز

ہمارے اختیار میں ہے، اسے بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور جو اختیار میں نہیں، اس پر بے جا فکر مند ہونے کے بجائے اللہ کی رضا میں راضی رہنا چاہیے۔

زندگی میں بعض اوقات خاموشی سب سے طاقتور ردعمل ہوتا ہے۔ ہر بحث میں جیتنا ضروری نہیں، بعض اوقات عزت اور وقار خاموشی میں پنہاں ہوتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خاموش رہا، وہ نجات پا گیا۔ جذبات میں بہہ کر غیر ضروری باتوں میں الجھنے کے بجائے، حکمت کے ساتھ فیصلہ لینا عقلمندی کی نشانی ہے۔ بعض رشتے اور تعلقات زہریلے ہوتے ہیں، جو ہماری ذہنی اور روحانی نشوونما کو روک دیتے ہیں۔ ایسے تعلقات سے خود کو دور رکھنا اور اپنی عزت نفس کا خیال رکھنا جذباتی طور پر بالغ انسان کی علامت ہے۔

اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا اور انہیں سدھارنے کی کوشش کرنا انسان کو کامیابی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ ناکامی میں بھی سیکھنے کے مواقع ہوتے ہیں۔ جو شخص اپنی ناکامی سے سبق سیکھتا ہے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتا ہے، وہی درحقیقت زندگی میں کامیاب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔ اسی طرح، حسد اور منفی سوچ انسان کے سکون کو برباد کر دیتی ہے، جبکہ دوسروں کی کامیابی پر خوش ہونا اور دل سے دعا دینا روحانی پاکیزگی کی علامت ہے۔ جو شخص دوسروں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ رکھتا ہے، وہ خود بھی خیر اور برکت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

زندگی میں ہر چیز ایک وقت پر ہی آتی ہے، صبر اور محنت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو شخص وقت سے پہلے نتائج چاہتا ہے، وہ بے صبری اور اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اللہ ہر چیز کو بہترین وقت پر عطا کرتا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان اپنا کردار ادا کرے اور باقی معاملات اللہ پر چھوڑ دے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ صبر کامیابی کی کنجی ہے۔ جو لوگ اپنی زندگی میں صبر، حکمت، اور بہتر فیصلے کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں، وہی حقیقی معنوں میں جذباتی طور پر بالغ اور کامیاب ہوتے ہیں۔

خود شناسی اور خود احتسابی کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ جو شخص اپنی غلطیوں پر نظر رکھتا ہے اور انہیں درست کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ ہمیشہ بہتر ہوتا رہتا ہے۔ دوسروں پر تنقید کرنے کے بجائے اپنی ذات پر کام کرنا زیادہ مفید ہے۔ جو لوگ دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کرتے ہیں، وہی حقیقی طور پر اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ سب سے عقلمند وہ ہے جو اپنی ذات کو پہچان لے۔ یہی خود شناسی انسان کو حقیقی خوشی اور کامیابی کی راہ پر ڈالتی ہے۔

نوجوانوں کی دینی رہنمائی: فطری طریقہ اور حکمت عملی

نوجوانی کا دور انسانی زندگی کا ایک نازک اور اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ اس عمر میں جذباتی، فکری، اور روحانی نشوونما ایک خاص رخ اختیار کر رہی ہوتی ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب بچے خود کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنی آزادی اور خودمختاری کے متلاشی ہوتے ہیں، اور اپنے نظریات کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ایسے میں اگر والدین اور اساتذہ دین کو زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کریں تو اکثر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور نوجوان دین سے دوری اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ دین کی طرف ان کی رہنمائی فطری طریقے سے کی جائے، انہیں سختی کے بجائے حکمت اور نرمی سے اس راہ پر چلایا جائے، اور سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ غیر مستقیم انداز میں ان کے دلوں میں دینی جذبہ پیدا کیا جائے۔

اگر دین کو بوجھ اور جبر کے طور پر پیش کیا جائے تو نوجوانوں کے لیے اسے قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن اگر انہیں یہ بتایا جائے کہ اسلام محض چند احکام و عبادات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک مکمل طرزِ زندگی ہے، تو ان کی دلچسپی بڑھنے لگتی ہے۔ دین کی خوبصورتی کو ان کی فطرت، ان کی سوچ، اور ان کے سوالات کے مطابق پیش کرنا ضروری ہے۔ اگر انہیں آزادی دی جائے کہ وہ سوال کریں، اپنی الجھنوں کا اظہار کریں، اور پھر عقل و حکمت کے ساتھ ان کی رہنمائی کی جائے، تو وہ نہ صرف دین کو سمجھنے لگیں گے بلکہ اسے اپنی زندگی کا حصہ بھی بنا لیں گے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ نوجوانوں کو دین کے دشمنوں اور ان کی سازشوں سے آگاہ کیا جائے۔ انہیں یہ بتایا جائے کہ استعماری قوتیں، میڈیا، اور مغربی نظریات کیوں اسلام کو کمزور کرنا چاہتے ہیں، کیوں مسلمانوں کی شناخت مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور کیسے ذہنی غلامی کے جال میں نوجوانوں کو پھنسایا جاتا ہے۔ جب انہیں یہ شعور دیا جائے گا کہ دین سے دوری دراصل دشمنوں کے منصوبے کا حصہ ہے، تو وہ خود بخود دین کی گہرائی میں جانا شروع کریں گے۔ نوجوانوں کے اندر ایک فطری باغیانہ رجحان ہوتا ہے، اور اگر انہیں یہ باور کرایا جائے کہ اصل بغاوت وہی ہے جو استعماری طاقتوں کے خلاف ہو، تو وہ دین کی طرف زیادہ سنجیدگی سے متوجہ ہوں گے۔

اس مقصد کے لیے سب سے پہلے ان سے دوستی کا رشتہ قائم کرنا ہوگا۔ والدین اگر صرف احکامات جاری کرنے والے بن کر رہیں گے تو نوجوان ان سے دور ہو جائیں گے، لیکن اگر وہ اپنے بچوں کو یہ محسوس کرائیں کہ وہ ان کے جذبات، خیالات، اور احساسات کو سمجھتے ہیں، تو بچے خود بخود ان کی بات سننے لگیں گے۔ اگر نوجوانوں کو اعتماد دیا جائے، ان سے مشورہ کیا جائے، اور انہیں اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیا جائے تو وہ دین کی باتوں کو زیادہ توجہ سے سنیں گے اور ان پر غور کریں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ، دین کو محض عبادات کی فہرست کے طور پر نہ سکھایا جائے، بلکہ اس کے عملی فوائد اور اس کی حکمتیں بھی اجاگر کی جائیں۔ نماز کو محض ایک رسمی فریضہ کہنے کے بجائے اسے ذہنی سکون اور قوتِ ارادی کا ذریعہ بنا کر دکھایا جائے۔ روزے کو صرف بھوکا رہنے کا نام نہ دیا جائے، بلکہ اس کی جسمانی اور روحانی برکات پر روشنی ڈالی جائے۔ دینی

تعلیمات کو عقل و منطق کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ نوجوان اسے کسی جبر کے بجائے اپنے فائدے کی چیز سمجھیں۔

نوجوانوں کے لیے ایک مقصد متعین کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر ان کے سامنے کوئی اعلیٰ ہدف نہیں ہو گا، تو وہ فضول تفریحات، عارضی لذتوں، اور وقت کے ضیاع میں مبتلا ہو جائیں گے۔ انہیں یہ باور کرایا جائے کہ وہ اس امت کے معمار ہیں، ان کے اندر وہ صلاحیتیں ہیں جو امتِ مسلمہ کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتی ہیں، اور انہیں اپنی زندگی کو ایک عظیم مشن کے لیے وقف کرنا ہے۔ انہیں امام علیؑ، امام حسینؑ، اور دیگر اسلامی شخصیات کی جدوجہد سے روشناس کرایا جائے، تاکہ وہ انہیں اپنے لیے رول ماڈل بنائیں۔

یہ تمام چیزیں تدریجی انداز میں، حکمت کے ساتھ اور نرمی سے سکھانے کی ضرورت ہے۔ سختی کرنے سے نوجوان بغاوت پر اتر آتے ہیں، لیکن اگر انہیں محبت دی جائے، ان کی سوچ کو اہمیت دی جائے، ان سے مکالمہ کیا جائے، اور ان کی فکری نشوونما کے لیے مواقع فراہم کیے جائیں، تو وہ خود بخود دین کے محافظ اور مبلغ بن جائیں گے۔ دین کوئی بیرونی چیز نہیں ہے جو ان پر تھوپی جائے، بلکہ یہ ان کی فطرت کا حصہ ہے۔ ضرورت صرف اس فطرت کو بیدار کرنے کی ہے، اور یہی سب سے مؤثر حکمتِ عملی ہے۔

والدین کے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ ہوتی ہے کہ ان کے بچے کس فکری اور عملی راستے پر جا رہے ہیں۔ آج کے دور میں، جہاں میڈیا، تعلیمی نظام، اور سماجی ماحول نوجوانوں کے ذہنوں کو ایک مخصوص سمت میں لے جانے کی کوشش کر رہا ہے، وہاں والدین کے لیے سب سے ضروری کام یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو شعوری طور پر ایک ایسا راستہ دکھائیں جو انہیں نہ صرف ایک باعزت، باوقار، اور باہدف زندگی کی طرف لے جائے، بلکہ انہیں اس

عالمی ابلیسی نظام کے شکنجے سے بھی آزاد کرے، جو انسان کی اصل شناخت، ایمان، اور غیرت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عالمی استکباری طاقتیں کیوں نوجوانوں کو بے مقصدیت، تفریحی جنون، اور فکری غلامی میں مبتلا کرنا چاہتی ہیں۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ نوجوان کبھی اپنے دین، اپنی ثقافت، اور اپنی ذمہ داریوں کو نہ سمجھیں۔ وہ کبھی بھی ظلم کے خلاف کھڑے نہ ہوں، وہ کبھی بھی یہ سوال نہ کریں کہ ہمیں کن راستوں پر چلایا جا رہا ہے، اور وہ کبھی بھی اسلامی قیادت یعنی امامت وولایت کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ والدین کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ان حقیقتوں سے آگاہ کریں اور انہیں بتائیں کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ محض اتفاق نہیں بلکہ ایک منصوبے کے تحت ہو رہا ہے۔

نوجوانوں کے لیے دین کو سختی اور جبر کے بجائے ایک پرکشش اور عملی نظام کے طور پر پیش کرنا ضروری ہے۔ اگر والدین صرف نصیحتیں کرتے رہیں اور دین کو صرف ایک عبادتی رسم کے طور پر پیش کریں، تو نوجوان اسے ایک روایتی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔ لیکن اگر انہیں بتایا جائے کہ دین ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو ظلم کے خلاف کھڑے ہونے، باطل کا مقابلہ کرنے، اور خود کو دنیا میں ایک مثالی انسان بنانے کا درس دیتا ہے، تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔

والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے گھروں میں ایسی فضا قائم کریں جہاں دینی گفتگو صرف روایتی انداز میں نہ ہو بلکہ ایک فکری اور عملی جہت رکھتی ہو۔ بچوں سے سوال کریں، ان کی رائے جانیں، انہیں تحقیق کی طرف مائل کریں۔ انہیں بتائیں کہ دنیا میں جو جنگیں ہو رہی ہیں، جو میڈیا پر پروپیگنڈے کیے جا رہے ہیں، جو نظریاتی حملے ہو رہے ہیں، وہ دراصل اسلام کو کمزور

کرنے کے لیے ہیں۔ اگر نوجوان یہ شعور حاصل کر لیں کہ انہیں ایک مخصوص ایجنڈے کے تحت دین سے دور کیا جا رہا ہے، تو وہ خود بخود بیدار ہو جائیں گے۔

نوجوانوں کو دین سے جوڑنے کے لیے انہیں دینی شخصیات کی مجاہدانہ زندگیوں سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ امام علیؑ، امام حسینؑ، اور دیگر معصومینؑ کی زندگیوں کو صرف تاریخی واقعات کے طور پر پیش کرنے کے بجائے، انہیں عملی نمونہ بنا کر دکھایا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ اگر یہ ہستیاں بھی خاموش رہتیں، اگر یہ بھی سازشوں کے سامنے جھک جاتیں، تو آج دین کا کوئی نام و نشان نہ ہوتا۔ جب نوجوان یہ محسوس کریں گے کہ وہ بھی اسی مشن کا حصہ بن سکتے ہیں اور ان کے سامنے بھی ایک عظیم مقصد ہے، تو وہ اپنا راستہ خود متعین کریں گے۔

والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے ایک متبادل فکری اور عملی نظام قائم کریں۔ اگر والدین خود مغربی نظامِ تعلیم، میڈیا، اور ثقافت کو ہی زندگی کی کامیابی کا معیار سمجھیں گے، تو پھر وہ اپنے بچوں کو کیسے اس سے بچائیں گے؟ اس کے برعکس، اگر وہ اپنے گھروں میں دینی سوچ کو پروان چڑھائیں، اسلامی تاریخ اور تعلیمات پر بات کریں، اور نوجوانوں کو ایک ایسی فضا فراہم کریں جہاں وہ اپنے دین کو جدید دنیا کے مسائل کا حل سمجھ سکیں، تو وہ اس راستے کو خود اختیار کریں گے۔

نوجوانوں کو دین کی طرف مائل کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انہیں میدانِ عمل دیا جائے۔ اگر وہ صرف سننے والے بن کر رہیں گے، تو وہ جلد یا بدیر اس راستے سے ہٹ جائیں گے، لیکن اگر انہیں کسی تحریک، کسی مشن، کسی عملی سرگرمی کا حصہ بنایا جائے، تو وہ

دین کے عملی تقاضے کو سمجھنے لگیں گے۔ انہیں علمی، سماجی، اور فکری محاذوں پر کام کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں، تاکہ وہ محسوس کریں کہ وہ ایک بڑی تحریک کا حصہ ہیں۔

آخر میں، سب سے اہم چیز دعا اور والدین کا اپنا کردار ہے۔ اگر والدین خود اپنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ وہ دین کو زندگی کا حقیقی نظام سمجھتے ہیں، تو ان کے بچے بھی اسی راہ پر چلیں گے۔ اگر وہ خود بھی اسی مغربی طرزِ زندگی اور دنیاوی مادی کامیابیوں کے پیچھے دوڑیں گے، تو ان کے بچوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ دین کے راستے کو اپنائیں، غیر منطقی ہو گا۔ والدین کے کردار، گفتار، اور طرزِ زندگی میں جو اخلاص ہو گا، وہی ان کے بچوں کے دلوں پر اثر ڈالے گا۔

یہی وہ راستہ ہے جو نوجوانوں کو عالمی استکباری نظام سے آزاد کر کے، انہیں ایک حقیقی دینی، فکری، اور عملی قیادت کی طرف لے جا سکتا ہے۔ اگر والدین یہ ذمہ داری سنجیدگی سے نبھائیں، تو وہ نہ صرف اپنی نسل کو محفوظ کر سکتے ہیں بلکہ وہ ایک ایسی نسل کی تربیت کر سکتے ہیں جو دین کے حقیقی محافظ اور مبلغ بنے گی۔

ہر کام کا خاص موقع، ہر کام کا خاص محل ہوتا ہے

انسانی زندگی میں حکمت، صبر، خود آگاہی اور بہتر فیصلے کرنے کی صلاحیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بعض اوقات خاموش رہنا ہی سب سے بہترین جواب ہوتا ہے، کیونکہ الفاظ کے بے جا استعمال سے انسان اپنی اہمیت خود کم کر دیتا ہے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: "انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی گفتگو میں محتاط اور سوچ سمجھ کر الفاظ کا چناؤ کرتا ہے، وہی حقیقی دانشمند ہے۔

احساسات اور جذبات کا صحیح مصرف بھی حکمت کا حصہ ہے۔ ہر کسی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دینا نہ صرف نقصان دہ ہو سکتا ہے بلکہ بسا اوقات ناقدری کا باعث بھی بنتا ہے۔ اسی لیے اپنی محبت، وفاداری اور احساسات کو ان لوگوں کے لیے محفوظ رکھنا چاہیے جو واقعی ان کی قدر کریں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ دنیا میں ہر کوئی بدلتا رہتا ہے، وقت اور حالات کے ساتھ لوگ بھی بدل جاتے ہیں، اور انسان کو بھی اپنی زندگی میں بہتری کے لیے مثبت تبدیلیاں اپنانی چاہئیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: "جس کا آج اس کے کل سے بہتر نہیں، وہ خسارے میں ہے۔" لہٰذا، مسلسل خود کو بہتر بنانا اور وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے طرزِ زندگی میں حکمت اور فہم کو شامل کرنا ضروری ہے۔

زندگی میں آزمائشیں اور مشکلات کا سامنا ہر ایک کو کرنا پڑتا ہے۔ بسا اوقات انسان ہر چیز کو جلد حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر قدرت کے قوانین کے مطابق ہر چیز اپنے وقت پر ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا: "بے شک ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔" اس لیے، مشکلات کو قبول کرنا اور ان سے سیکھ کر آگے بڑھنا ہی کامیاب زندگی کا راز ہے۔

زندگی کا حسن یہ ہے کہ اس میں خوشی اور غم دونوں شامل ہیں۔ اگر ہر دن ایک جیسا ہو، تو انسان ترقی نہیں کر سکتا۔ برے دن ہمیں اچھے دنوں کی قدر سکھاتے ہیں اور ہماری ہمت کو آزماتے ہیں۔ وہی شخص زندگی میں کامیاب ہوتا ہے جو ہر تجربے سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے اور خود کو مسلسل بہتر بناتا ہے۔

حقیقی کامیابی اسی میں ہے کہ انسان اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی ذات کو بہتر بنائے۔ امام جعفر صادقؑ کا قول ہے: "جو شخص اپنے نفس کی اصلاح کرے، وہی حقیقی کامیابی حاصل کرتا ہے۔" اس لیے اپنی خامیوں کو پہچان کر انہیں درست کرنا اور ہر دن خود کو بہترین بنانے کی کوشش کرنا ہی انسان کے لیے سب سے بڑی جیت ہے۔

زندگی کا حسن توازن اور حکمت میں ہے۔ نہ ہر موقع پر بولنا دانشمندی ہے اور نہ ہر وقت خاموش رہنا عقلمندی۔ بعض باتوں پر خاموشی ہی بہترین ردعمل ہوتی ہے کیونکہ بعض اوقات الفاظ کی جگہ رویہ زیادہ اثر رکھتا ہے۔ امام سجادؑ فرماتے ہیں: "خاموشی حکمت ہے اور اس پر عمل کرنے والا کم ہوتا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ جب خاموشی اختیار کی جاتی ہے، تو لوگ اس کی گہرائی اور معنی پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

انسانی تعلقات میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم اپنی اہمیت ان لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں جو ہماری قدر نہیں کرتے۔ جو لوگ آپ کے جذبات کو نہیں سمجھتے، انہیں بار بار وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو آپ کی پرواہ کرتے ہیں، انہیں دلیلوں کی نہیں بلکہ آپ کی موجودگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: "اپنے راز صرف ان کے ساتھ بانٹو جو تمہارے دل کی قدر کرتے ہیں۔" اس لیے دل کی بات ہر کسی کے سامنے عیاں کرنا خود کو غیر محفوظ بنانے کے مترادف ہے۔

زندگی میں تبدیلی ایک حقیقت ہے، جس سے فرار ممکن نہیں۔ ہر شخص بدلتا ہے، ہر رشتہ وقت کے ساتھ نئی شکل اختیار کرتا ہے، اور ہر تجربہ انسان کو نیا سبق دیتا ہے۔ اگر دوسروں کی تبدیلی کو قبول کیا جا سکتا ہے، تو اپنی مثبت تبدیلی کو بھی اپنانا چاہیے۔ قرآن میں ارشاد ہے: "بے شک اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود اپنی حالت بدلنے پر آمادہ نہ ہو۔" اس لیے خود کو بہتر بنانے کی کوشش مسلسل جاری رکھنی چاہیے تاکہ زندگی میں کامیابی اور سکون دونوں حاصل ہو سکیں۔

زندگی کی آزمائشیں وقتی ہوتی ہیں، مگر ان کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان آزمائشوں میں ثابت قدم رہتے ہیں، وہی حقیقی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں: "مؤمن وہی ہے جو آزمائشوں میں صبر کرے اور اللہ پر بھروسہ رکھے۔" مشکلات ہمیشہ سکھانے کے لیے آتی ہیں، تو ان سے سبق لینا ضروری ہوتا ہے۔

زندگی کا ایک خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ ہر چیز اپنے وقت پر ہی ملتی ہے۔ اگر کچھ دیر سے ملے تو اس میں خیر ہوتی ہے، اور اگر کوئی چیز نہ ملے تو اس میں بھی اللہ کی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ جلد بازی اور مایوسی انسان کو کمزور کرتی ہے، جبکہ صبر اور یقین اسے مضبوط بناتے ہیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "صبر اور یقین کے ساتھ زندگی گزارو، کیونکہ اللہ کی رحمت ہمیشہ قریب ہوتی ہے۔"

ہر شخص کی زندگی میں برے دن آتے ہیں، مگر ان دنوں کو زندگی کی ناکامی سمجھنا نادانی ہے۔ برے دن انسان کو اس کی کمزوریوں سے آگاہ کرتے ہیں اور اس کی صلاحیتوں کو نکھارتے ہیں۔ ایک اچھی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ مشکلات کو قبول کیا جائے اور ان سے سیکھ کر آگے بڑھا جائے۔ جو شخص خود کو بہتر بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، وہی حقیقی کامیاب ہوتا ہے۔

مکتبِ اھلبیتؑ، دیگر فرق ھائے اسلامی اور جدید مکاتیب

مکتب اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کے مطابق، سرمایہ داری اور سوشلسٹ نظام، دونوں انسانی سماج میں عدل و انصاف کے قیام میں بنیادی نقائص رکھتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام نجی ملکیت، منافع کی حوصلہ افزائی اور آزاد منڈی کے اصولوں پر قائم ہے، جو ظاہری طور پر ترقی اور خوشحالی کا سبب بنتا ہے، مگر اس کے بطن میں شدید طبقاتی تفاوت، استحصال اور اقتصادی ناہمواری پنہاں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، سوشلسٹ نظام مساوات، اجتماعی ملکیت اور وسائل کی منصفانہ تقسیم پر زور دیتا ہے، مگر اس کا نتیجہ فرد کی معاشی آزادی کے خاتمے، ریاستی جبر اور تخلیقی صلاحیتوں کی محدودیت کی صورت میں نکلتا ہے۔ مکتب اہل بیت علیہم السلام ان دونوں انتہاؤں کو رد کرتے ہوئے ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کرتا ہے جو فرد اور معاشرے کے حقوق کے درمیان توازن قائم کرتا ہے اور دولت کے ارتکاز کو روکتے ہوئے عدل و انصاف پر مبنی معیشت کی بنیاد رکھتا ہے۔

سرمایہ داری نظام میں دولت کا بہاؤ مخصوص افراد یا گروہوں تک محدود رہتا ہے، جس کے نتیجے میں سماجی تفریق بڑھتی ہے۔ اس نظام میں ہر فرد کو اپنی معاشی سرگرمیوں میں مکمل آزادی دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے چند لوگ بے پناہ دولت اکٹھی کر لیتے ہیں، جبکہ عام افراد بنیادی ضروریات کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ اس استحصالی ڈھانچے میں

اخلاقی اقدار پس پشت چلی جاتی ہیں اور مادی ترقی کو ہی کامیابی کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، سوشلسٹ نظام میں نجی ملکیت کو محدود کر کے ریاستی کنٹرول کو بڑھا دیا جاتا ہے، جس کا مقصد مساوات قائم کرنا ہوتا ہے۔ تاہم، اس نظام میں فرد کی آزادی سلب ہو جاتی ہے، اختراعات کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، اور معیشت ایک جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً، ریاست ایک ایسا جابرانہ نظام قائم کر دیتی ہے جہاں عوام کی ضروریات حکومت کی مرضی سے پوری ہوتی ہیں، اور فکری و اقتصادی آزادی کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔

مکتب اہل بیت علیہم السلام کے مطابق، ایک عادلانہ اقتصادی نظام کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ دولت کی تقسیم منصفانہ ہو، مگر فرد کی محنت، صلاحیت اور جدوجہد کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ اسلام میں نجی ملکیت کی اجازت دی گئی ہے، مگر اس کے ساتھ زکوٰۃ، خمس، صدقات اور دیگر مالیاتی احکام کے ذریعے دولت کے بہاؤ کو منظم کیا جاتا ہے، تاکہ کوئی بھی شخص بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے۔ اسلامی معیشت میں منڈی کی آزادی کو مکمل بے لگام نہیں چھوڑا جاتا، بلکہ اخلاقی اور شرعی اصولوں کے ذریعے اسے محدود کیا جاتا ہے تاکہ استحصال اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نہ ہونے پائے۔

اس کے برعکس، سرمایہ داری نظام میں منڈی کو ہر قسم کی مداخلت سے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے، جس سے قیمتوں میں اتار چڑھاؤ، مہنگائی، غربت، اور استحصالی رویے جنم لیتے ہیں۔ دوسری جانب، سوشلسٹ نظام میں ریاست تمام معاشی وسائل کو کنٹرول کرتی ہے، جس کے نتیجے میں انفرادی کوششوں اور ترقی کی راہیں محدود ہو جاتی ہیں۔ اسلام ان دونوں

نظریات کے درمیان ایک متوازن راستہ اختیار کرتا ہے، جہاں فرد کو معیشت میں حصہ لینے کی آزادی دی جاتی ہے، مگر اس کے ساتھ دولت کی گردش اور تقسیم کو عدل و انصاف کے اصولوں کے مطابق منظم کیا جاتا ہے۔

مکتب اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں بیت المال کا تصور بھی پایا جاتا ہے، جو اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ معاشرے میں کوئی فرد غربت کی لکیر سے نیچے نہ چلا جائے۔ دولت کا ارتکاز روکنے کے لیے اسلامی نظام میں مختلف قوانین موجود ہیں، جن میں سود کی ممانعت، ناجائز منافع خوری پر پابندی، اور ضرورت مندوں کی کفالت شامل ہیں۔ یہ قوانین اس بات کی ضمانت فراہم کرتے ہیں کہ معاشی ترقی صرف چند افراد یا طبقات تک محدود نہ رہے، بلکہ پورے معاشرے میں اس کے اثرات ظاہر ہوں۔

سرمایہ داری اور سوشلسٹ نظام دونوں دنیاوی ترقی کو اپنا مقصد بناتے ہیں، جبکہ مکتب اہل بیت علیہم السلام کا نظریہ یہ ہے کہ معیشت کا مقصد صرف دنیاوی فوائد حاصل کرنا نہیں، بلکہ آخرت کی کامیابی کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ دولت کا اصل مصرف انسانیت کی فلاح و بہبود، سماجی انصاف اور اخلاقی اقدار کا فروغ ہے، نہ کہ محض ذاتی آسائشیں یا ریاستی طاقت کا استحکام۔ اسلامی معیشت کے اصول نہ صرف ایک مضبوط اقتصادی ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں، بلکہ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں جہاں ہر فرد کو معاشی تحفظ حاصل ہو اور وہ دینی و اخلاقی اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکے۔

ان نظریات کی روشنی میں، مکتب اہل بیت علیہم السلام کا معاشی ماڈل سرمایہ داری اور سوشلسٹ ماڈلز کی کمزوریوں کو ختم کرتے ہوئے ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس میں عدل و انصاف، سماجی فلاح، اور انفرادی ترقی کے مواقع یکساں طور پر موجود ہوں۔ سرمایہ داری کی بے لگام معیشت اور سوشلسٹ جبر سے بالاتر ہو کر، اسلام ایک متوازن اور منصفانہ راستہ فراہم کرتا ہے، جو نہ صرف معاشی خوشحالی بلکہ روحانی ترقی کا ضامن بھی ہے۔

مکتب امامت و اہل بیت علیہم السلام کے علاوہ کسی بھی نظریے کے پاس ایسا جامع اور متوازن سیاسی نظام موجود نہیں جو شریعت کی پشت پناہی کے ساتھ دنیاوی اور اخروی فلاح کا ضامن ہو اور عملی طور پر ایک مکمل معاشی، سیاسی اور سماجی نظام چلا سکے۔ اگر تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جتنے بھی غیر اسلامی سیاسی نظریات سامنے آئے، وہ یا تو مکمل طور پر دنیاوی مفادات پر مبنی تھے یا پھر ان میں دین کا کوئی محدود اور ناقص تصور شامل تھا جو عملی طور پر کسی بھی مستحکم نظام کے قیام میں ناکام رہا۔

سرمایہ داری اور جمہوریت کے امتزاج سے پیدا ہونے والے نظام میں فرد کی آزادی کو مطلق درجہ دے دیا گیا، جس کے نتیجے میں اخلاقی اصولوں سے عاری ایک ایسا سیاسی و معاشی ڈھانچہ وجود میں آیا جس میں طاقتور سرمایہ دار ہی اصل حکمران بن گئے۔ اس نظام میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور طبقاتی کشمکش کو ایک لازمی امر کے طور پر قبول کر لیا گیا، جس سے ایک استحصالی نظام پروان چڑھا۔ اگرچہ بظاہر یہ نظام جمہوریت کے اصولوں پر مبنی ہے، مگر درحقیقت یہ طاقت اور سرمائے کی سیاست کا ایک ایسا کھیل ہے جس میں عوام کو محض

ووٹ ڈالنے کا حق دیا جاتا ہے، جبکہ اصل فیصلے ایک مخصوص اشرافیہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اس میں نہ عدل و انصاف کی کوئی حقیقی ضمانت ہے اور نہ ہی انسان کی روحانی ترقی کا کوئی اہتمام۔

سوشلسٹ اور کمیونسٹ نظریات میں اگرچہ مساوات اور طبقاتی تفریق کے خاتمے کی بات کی گئی، لیکن عملی طور پر یہ نظریہ ایک سخت گیر اور جابرانہ حکومتی کنٹرول میں تبدیل ہو گیا۔ ان نظاموں میں فرد کی معاشی اور سماجی آزادی کو مکمل طور پر دبانے کی کوشش کی گئی، نتیجتاً ان میں وہ پائیداری اور استحکام باقی نہ رہا جو کسی بھی دیرپا سیاسی اور اقتصادی نظام کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، مکتب اہل بیت علیہم السلام میں حکومت کا تصور عدل، تقویٰ اور شریعت کی بالادستی پر مبنی ہے، جہاں حکمران محض طاقت یا اکثریت کی بنیاد پر حکومت نہیں کرتا، بلکہ وہ خود بھی شریعت کے تابع ہوتا ہے اور عوام کے درمیان ایک الٰہی نمائندے کے طور پر عدل قائم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

دیگر اسلامی مکاتب فکر میں بھی حکومت اور سیاست کے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں ایک بنیادی کمی یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر شریعت کے تابع حکومتی ڈھانچے کو عملی طور پر نافذ کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ کچھ نظریات میں بادشاہت کو اسلامی جواز فراہم کرنے کی کوشش کی گئی، جبکہ کچھ میں خالصتاً عوامی رائے کو ہی معیار بنا کر دینی اقدار کو محدود کر دیا گیا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نظام سامنے نہیں آیا جو حقیقی طور پر اسلامی عدل و انصاف کو نافذ کر سکے، کیونکہ یا تو وہ حکومت کے حقیقی اصولوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا

پھر دین کو محض اخلاقی نصیحتوں تک محدود رکھتے ہیں، جبکہ عملی سیاست میں وہ انہی غیر اسلامی طریقوں کو اپناتے ہیں جو دنیاوی مفادات کے تابع ہوتے ہیں۔

مکتب امامت و اہل بیت علیہم السلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حکومت کا اصل تصور *ولایت* پر مبنی ہے، یعنی حکومت ایک ایسے رہنما کے ہاتھ میں ہو جو خود الٰہی علم اور عصمت کا حامل ہو، یا اگر وہ معصوم موجود نہ ہو تو ایسا فقیہ ہو جو شریعت، عدل، تقویٰ اور عوامی فلاح کے اصولوں کا حقیقی علم رکھتا ہو۔ یہ نظام نہ تو شخصی آمریت کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی ایسی جمہوریت کو قبول کرتا ہے جو شریعت کی حدود سے آزاد ہو۔ اس میں سیاسی حکمران کو ایک ذمہ دار اور خدا کے سامنے جوابدہ فرد تصور کیا جاتا ہے، جو نہ صرف دنیاوی معاملات میں عدل قائم کرتا ہے بلکہ اس کا مقصد انسانی معاشرے کو روحانی اور اخروی کامیابی کی طرف بھی لے جانا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، دنیا کے کسی بھی اور سیاسی نظریے میں یہ قوت نہیں کہ وہ حکمرانی کے تمام پہلوؤں کو ایک متوازن اور عادلانہ اصولوں پر استوار کر سکے۔ جو نظریات مکمل جمہوریت کی بات کرتے ہیں، وہ شریعت کی بالادستی سے خالی ہو جاتے ہیں، اور جو نظریات سخت گیر دینی حکومت کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ عوامی ضروریات اور زمینی حقائق کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ مکتب اہل بیت علیہم السلام کا نظریہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک ایسا متوازن راستہ فراہم کرتا ہے جہاں نہ صرف سیاست و معیشت، بلکہ سماجی اور اخلاقی نظام بھی عدل

کے اصولوں پر قائم رہتا ہے، اور جس میں دنیا اور آخرت کی کامیابی کو یکجا کر کے ایک حقیقی اسلامی ریاست کا ماڈل پیش کیا جاتا ہے۔

ہمتوں کے امتحان کا وقت

زندگی میں ایسے لمحات ضرور آتے ہیں جب حالات انسان کو ہر چیز چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب انسان کا حقیقی جوہر سامنے آتا ہے، اس کا صبر، حوصلہ، عزم اور برداشت کی قوت آزمائش میں پڑتی ہے۔ بعض اوقات حالات اتنے کٹھن ہو جاتے ہیں کہ انسان کو اپنے خواب، اپنی محنت، اپنے رشتے، حتیٰ کہ اپنی شناخت تک قربان کرنی پڑتی ہے، لیکن یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جو اس کی شخصیت کی اصل تعریف کرتا ہے۔ اس وقت کا ردعمل ہی یہ طے کرتا ہے کہ انسان اپنی آزمائشوں سے نکھر کر نکلے گا یا بکھر جائے گا۔

حقیقی شعور اور بالغ نظری اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب انسان مشکلات کے طوفان میں خود کو ثابت قدم رکھے۔ اگر وہ ہمت ہار کر مایوسی کا شکار ہو جائے تو وہ حالات کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہوتا ہے، لیکن اگر وہ اپنی ہمت، حوصلے اور استقامت کو برقرار رکھے تو وہ نہ صرف حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکتا ہے بلکہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور باوقار شخصیت کے ساتھ ابھر سکتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بھی اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ آزمائشیں انسان کے کردار کی پہچان کا ذریعہ بنتی ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ

وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (البقرہ: 155) یعنی ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے خوف، بھوک، مال و جان اور پھلوں کی کمی کے ذریعے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ مشکلات انسان کے صبر اور ثابت قدمی کا امتحان ہیں اور جو ان آزمائشوں میں ثابت قدم رہتے ہیں، وہی کامیابی کے مستحق ہوتے ہیں۔

تاریخ میں ہمیں بے شمار مثالیں ملتی ہیں جہاں عظیم شخصیات کو سخت ترین حالات کا سامنا کرنا پڑا، مگر انہوں نے صبر اور حکمت سے کام لے کر اپنی شناخت کو قائم رکھا اور حالات کے بہاؤ میں بہنے کے بجائے اپنی منزل خود متعین کی۔ امام حسینؓ کربلا میں سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کر دیے گئے، مگر اس موقع پر ان کا کردار ہی ان کی اصل پہچان بنا اور آج بھی وہ استقامت، حق پرستی اور عزیمت کی اعلیٰ ترین مثال سمجھے جاتے ہیں۔

زندگی میں ایسے مواقع پر انسان کو اپنی اصل پہچان یاد رکھنی چاہیے اور وقتی مشکلات سے گھبرا کر اپنی اقدار اور اصولوں کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ وہی لوگ تاریخ میں امر ہوتے ہیں جو مشکل وقت میں اپنی ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور حالات کے ہاتھوں اپنی پہچان کو مٹنے نہیں دیتے۔

زندگی میں آزمائشیں ناگزیر ہیں۔ ہر انسان کو کسی نہ کسی مرحلے پر ایسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں اسے اپنی خواہشات، خوابوں اور بعض اوقات اپنی پہچان تک کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ ایسے لمحات میں جو چیز کسی شخص کے وقار اور عظمت کا تعین کرتی ہے، وہ اس کا

ردعمل ہے۔ کیا وہ حالات کے آگے جھک کر اپنی اقدار کو ترک کر دیتا ہے، یا وہ صبر، استقامت اور شعور کے ساتھ ان مشکلات کا سامنا کرتا ہے؟ یہی وہ وقت ہوتا ہے جو انسان کی اصل پہچان کو واضح کرتا ہے۔ جو لوگ مشکلات میں اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہیں، وہی حقیقی کامیابی حاصل کرتے ہیں، جبکہ جو لوگ حالات سے گھبرا کر خود کو بدل لیتے ہیں، وہ اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں۔

انسان کی اصل طاقت اس کے اندر موجود عزم و حوصلہ ہے، نہ کہ بیرونی سہولیات یا آسائشیں۔ وہ لوگ جو دنیاوی فائدے کے لیے اپنے اصولوں کو ترک کر دیتے ہیں، وقتی طور پر کامیاب نظر آ سکتے ہیں، مگر درحقیقت وہ اپنی روحانی طاقت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس کے برعکس، جو لوگ سختیوں میں بھی اپنی عزتِ نفس اور سچائی پر قائم رہتے ہیں، وہی تاریخ میں عزت پاتے ہیں۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: لَا یَکُنْ أَخْوَفَكَ لِشَیْءٍ إِلَّا لِنَفْسِكَ یعنی سب سے زیادہ خوف اپنی ذات کے لیے رکھو، کہ کہیں تمہاری روح اور کردار نہ بگڑ جائے۔ یہ اصول ہمیں بتاتا ہے کہ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، اصل کامیابی اپنی سچائی اور ایمان پر ثابت قدم رہنے میں ہے۔

ایسے مواقع پر اکثر لوگ دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں یا قسمت کو کوستے ہیں، جبکہ باشعور اور بلند نظر افراد خود احتسابی کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی اندرونی طاقت کو کیسے استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ مشکلات کو بطور چیلنج لیتے ہیں، ان سے سیکھتے ہیں اور مزید مضبوط ہو کر ابھرتے ہیں۔ سیرتِ انبیاء اور اولیاء کا مطالعہ کریں تو یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ

دنیاوی چمک دمک کو ترک کر کے حقیقی انسانی اقدار پر قائم رہے، اور تاریخ نے انہیں ہمیشہ زندہ رکھا۔

حالات کا دباؤ وقتی ہوتا ہے، مگر انسان کا وقار اور عزت ہمیشہ کے لیے باقی رہتی ہے۔ جو لوگ وقتی مفادات کے لیے اپنی شناخت کو ترک کر دیتے ہیں، وہ شاید وقتی طور پر کچھ حاصل کر لیں، مگر وہ اندرونی بے چینی اور اضطراب کا شکار رہتے ہیں۔ اس کے برعکس، جو لوگ سچائی اور صبر کے ساتھ حالات کا سامنا کرتے ہیں، وہ بالآخر ذہنی سکون، عزت اور طویل المدتی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ انسانی فطرت یہی بتاتی ہے کہ جب انسان اپنی فطرتِ سلیمہ کے مطابق عمل کرتا ہے، تو وہ ہمیشہ قلبی سکون میں رہتا ہے، جبکہ جو شخص حالات کے دباؤ میں آکر اپنی اقدار سے انحراف کرتا ہے، وہ اندرونی کشمکش، اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صبر، استقامت اور حق پرستی انسان کو نہ صرف عزت بخشتی ہے، بلکہ اس کی زندگی کو حقیقی معنوں میں کامیاب اور بامقصد بنا دیتی ہے۔

یکسانیت جمود جبکہ تنوع ارتقاء دیتا ہے

انسان کی فطرت میں ارتقا اور تنوع کی طلب موجود ہے۔ مسلسل ایک ہی معمول پر چلتے رہنا اور روزمرہ کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ لانا ذہنی دباؤ، تھکن اور اکتاہٹ کا سبب بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی ذہن کو متحرک اور تازہ دم رکھنے کے لیے زندگی میں نیا پن، تجربات اور مثبت تبدیلیاں ضروری ہیں۔ انسانی ذہن فطری طور پر جستجو، دریافت اور ترقی کا متقاضی ہے۔ جب انسان ایک ہی معمول میں مقید ہو جاتا ہے اور کوئی نئی راہ اختیار نہیں کرتا، تو اس کی ذہنی اور روحانی نشوونما رک جاتی ہے۔ روزمرہ کے یکسانیت بھرے معمولات بظاہر آسانی اور استحکام کا احساس دلاتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ ذہن کے لیے ایک پوشیدہ قید کی مانند ہیں، جو رفتہ رفتہ انسانی تخلیقی صلاحیتوں، جذباتی توازن اور فکری وسعت کو محدود کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام میں غور و فکر، تبدیلی، تجدید اور تنوع کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے تاکہ انسان جمود کا شکار نہ ہو، بلکہ وہ اپنے فکری، عملی اور روحانی افق کو وسعت دیتا رہے۔

اسلامی تعلیمات میں بھی غور و فکر، تجدید، اور متنوع تجربات کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں بارہا تدبر، تفکر اور نئی راہوں کی تلاش پر زور دیا گیا ہے۔ زندگی کے ایک ہی ڈگر پر چلتے رہنا اور کسی قسم کی فکری، روحانی یا عملی ترقی نہ کرنا انسان کو جمود کا شکار کر دیتا

ہے، جو ذہنی اور روحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ اسی لیے اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں وقت کے ساتھ اپنی عادات، انداز فکر اور طرز زندگی میں مثبت تبدیلیوں کو اپنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے بھی مزید دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے کائنات میں بے شمار نشانیوں کو بکھیر کر انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر انسان کو زمین و آسمان، فطرت، تاریخ، اور اپنے وجود پر تدبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ دعوتِ فکر دراصل اس بات کی علامت ہے کہ اسلام جامد طرزِ زندگی کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور انسان کو ہمہ وقت سیکھنے اور خود کو بہتر بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں" :جو شخص دو دنوں کو ایک جیسا گزارے، وہ گھاٹے میں ہے۔ "یہ فرمان ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ایک ہی معمول پر قائم رہنے کے بجائے، ہر دن کچھ نیا کرنے، نیا سیکھنے اور خود کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک متوازن زندگی گزارنے کی تلقین فرمائی، جہاں عبادات، سماجی تعلقات، محنت، تفریح اور غور و فکر سب شامل ہوں۔ اگر کوئی شخص ایک ہی طرح کے معمولات میں قید ہو جائے اور زندگی میں نیا پن نہ لائے، تو وہ ذہنی اور جذباتی دباؤ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ امام علیؑ نے فرمایا: "دلوں کو بھی آرام کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ جب وہ بوجھل ہو جاتے ہیں تو بصیرت کھو بیٹھتے ہیں۔" اس فرمان میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ یکسانیت اور جمود ذہنی تھکن اور فکری زوال کا سبب بن سکتا ہے۔

انسانی زندگی کا حسن اس کے تجربات میں ہے، اور تجربات تبھی حاصل ہوتے ہیں جب وہ نئے راستوں پر قدم رکھے، نیا علم حاصل کرے، نئے لوگوں سے ملے، اور خود کو بدلتے حالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ ایک ہی طریقے سے سوچنے، ایک ہی کام بار بار کرنے اور زندگی میں کوئی نیا رنگ نہ لانے سے ذہنی دباؤ، افسردگی اور پژمردگی کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بھی اس رویے کی مذمت کی گئی ہے جہاں انسان خود کو جامد بنالے اور کسی بھی قسم کی فکری یا عملی پیشرفت سے گریز کرے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں" : جس کا آج اس کے کل سے بہتر نہ ہو، وہ خسارے میں ہے۔ "اس فرمان میں زندگی کی مسلسل بہتری اور ترقی پر زور دیا گیا ہے، جو کہ اس وقت ممکن ہے جب انسان خود کو ایک ہی روش پر قید کرنے کے بجائے نئے زاویوں سے چیزوں کو دیکھنے کی کوشش کرے۔

رسول اکرمؐ کی سیرت ہمیں سکھاتی ہے کہ زندگی میں تنوع، نیا پن اور تازگی کتنی اہم ہے۔ آپؐ کی روزمرہ زندگی میں عبادات، علمی گفتگو، سماجی تعلقات، تفکر، سفر، اور دیگر سرگرمیاں شامل تھیں، جو اس بات کی دلیل ہیں کہ ایک متوازن زندگی میں مختلف عناصر کی آمیزش ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ایک محدود دائرے میں قید ہو جائے اور اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو متنوع تجربات میں نہ ڈالے، تو وہ رفتہ رفتہ پژمردہ ہونے لگتا ہے۔

جدید نفسیات بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ اگر روزمرہ زندگی میں کوئی نیا تجربہ، سیکھنے کا نیا موقع یا کسی مثبت سرگرمی کی شمولیت نہ ہو، تو ذہن پر ایک دباؤ طاری ہونے لگتا ہے، جس سے تخلیقی صلاحیتیں ماند پڑجاتی ہیں۔ اس کے برعکس، اگر انسان اپنی زندگی میں

علم، تفکر، نیک اعمال، نئی مہارتیں، صحت مند تعلقات اور متوازن تفریح کو شامل کرے، تو وہ ذہنی طور پر زیادہ فعال اور پرسکون رہتا ہے۔ سائنس بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ یکسانیت اور جمود ذہنی صحت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ ماہرینِ نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ اگر انسان اپنی زندگی میں نیا سیکھنے، تخلیقی سرگرمیوں میں مشغول ہونے اور اپنے ماحول میں کسی حد تک تبدیلی لانے کی کوشش نہ کرے، تو اس کے دماغ کی فعالیت کم ہو جاتی ہے، اور وہ بوریت، اداسی، اور بے حسی کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس، وہ لوگ جو مسلسل سیکھنے، غور و فکر کرنے، اور اپنی صلاحیتوں کو مختلف میدانوں میں آزمانے میں مصروف رہتے ہیں، وہ زیادہ ذہین، متحرک اور خوش باش زندگی گزارتے ہیں۔

زندگی کا اصل لطف اس میں ہے کہ انسان خود کو دریافت کرے، اپنی صلاحیتوں کو پہچانے، اور اپنے امکانات کو وسعت دے۔ اگر کوئی شخص ایک ہی معمول میں قید ہو کر زندگی گزارے، تو وہ اپنے اندر موجود بے شمار صلاحیتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسے نہ صرف اپنے خیالات اور جذبات میں تازگی لانی چاہیے بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا کرنی چاہیے تاکہ اس کا ذہن متحرک اور مثبت انداز میں فعال رہے۔ عبادات میں خشوع و خضوع پیدا کرنے کے لیے بھی لازم ہے کہ انسان غور و فکر کرے، اپنی دعاؤں اور عبادات میں تجدید لائے، اور ان میں زیادہ روحانی گہرائی پیدا کرے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب انسان ایک ہی قسم کی سرگرمیوں میں مشغول رہتا ہے تو وہ ایک خاص ذہنی دائرے میں قید ہو جاتا ہے اور اس کے خیالات میں وسعت پیدا نہیں ہو پاتی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں علمی و فکری جستجو پر بہت زور دیا گیا ہے تاکہ انسان مسلسل نئے علم، تجربات اور حکمتوں سے روشناس ہوتا رہے۔

اسلام نے سیر وسیاحت، قدرتی مناظر پر غور وفکر، دوسروں کے ساتھ نیکی، اور علمی جستجو کو اہمیت دی ہے تاکہ ذہن ہمیشہ تازہ اور بیدار رہے۔ ایک ہی روٹین پر اکتفا کر لینا اور کسی قسم کی تبدیلی نہ لانا دراصل زندگی کے امکانات کو محدود کر دینے کے مترادف ہے۔ ذہنی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان عبادت کے ساتھ ساتھ تفکر، مثبت سماجی تعلقات، تعلیمی اور تخلیقی سرگرمیوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنائے تاکہ وہ جمود کا شکار ہونے کے بجائے مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

خلاصہ، یہ کہنا درست ہے کہ اگر کوئی شخص مسلسل ایک ہی معمول پر کاربند رہے اور کسی بھی قسم کی مثبت تبدیلی یا ترقی کی کوشش نہ کرے، تو اس کی ذہنی صحت متاثر ہو سکتی ہے۔ ذہنی، روحانی اور جسمانی سکون کے لیے ضروری ہے کہ زندگی میں نئے زاویوں، تجربات اور تفکرات کو شامل کیا جائے، تاکہ جمود کی کیفیت ختم ہو اور انسان ایک متوازن اور خوشگوار زندگی گزار سکے۔

ذمہ داری کا ادراک یا حقوق کا مطالبہ

ذمہ داری اور حقوق وہ بنیادی اصول ہیں جن پر کسی بھی فرد، خاندان، معاشرے یا ریاست کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ ذمہ داری سے مراد وہ فرائض اور واجبات ہیں جو کسی بھی انسان پر عائد ہوتے ہیں، جنہیں پورا کرنا اس کا اخلاقی، سماجی اور قانونی فرض ہوتا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی دائرے میں اپنی ذمہ داریوں کا پابند ہوتا ہے، چاہے وہ ایک فرد کی حیثیت سے ہو، خاندان کے رکن کے طور پر ہو، یا ایک شہری کی حیثیت سے ہو۔ ذمہ داری کا تعلق انسان کے کردار، اس کی نیت، اور اس کے اعمال سے ہوتا ہے۔ ایک استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو علم و تربیت دے، ایک والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی پرورش اور رہنمائی کریں، ایک حکمران کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رعایا کے حقوق کی حفاظت کرے، اور ایک ملازم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے کام کو ایمانداری سے انجام دے۔

حقوق سے مراد وہ بنیادی مراعات، سہولتیں اور انصاف کے اصول ہیں جو ہر انسان کو اس کی حیثیت، ذمہ داریوں اور ضروریات کے مطابق حاصل ہونے چاہییں۔ حقوق کا تصور فطری بھی ہے اور سماجی و قانونی بھی۔ ہر انسان کا یہ حق ہے کہ اسے عزت، انصاف، آزادی اور بنیادی ضروریات میسر ہوں۔ والدین کا حق ہے کہ ان کی اولاد ان کا احترام کرے، شاگرد کا

حق ہے کہ اسے معیاری تعلیم دی جائے، ملازم کا حق ہے کہ اسے اس کی محنت کے مطابق معاوضہ دیا جائے، اور ایک شہری کا حق ہے کہ اسے انصاف، روزگار اور تحفظ حاصل ہو۔

ذمہ داری اور حقوق کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ایک منصفانہ اور متوازن نظام تب ہی قائم ہو سکتا ہے جب ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو پوری دیانتداری سے نبھائے اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری کرے۔ اگر کوئی اپنے فرائض انجام دے رہا ہو مگر اسے اس کے حقوق نہ ملیں تو یہ ناانصافی ہو گی، اور اگر کوئی اپنے حقوق کا مطالبہ کرے لیکن اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتے تو یہ بھی ایک غیر متوازن رویہ ہو گا۔ اس لیے ایک صحت مند معاشرہ وہی ہوتا ہے جہاں لوگ پہلے اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں، انہیں ادا کریں، اور پھر اپنے حقوق کے حصول کے لیے جائز طریقے سے کوشش کریں۔

اسلامی تعلیمات میں بھی ذمہ داری اور حقوق کو ایک دوسرے کا لازمی جزو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں عدل و انصاف کی تاکید کے ساتھ ساتھ فرائض کی انجام دہی اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری پر بھی زور دیا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اسی طرح، امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتا، وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کا بھی اہل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک متوازن اور کامیاب زندگی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے فرائض کو سمجھیں اور انہیں پورے اخلاص کے

ساتھ ادا کریں، تاکہ ہمارے حقوق بھی محفوظ رہیں اور معاشرے میں عدل و انصاف کا نظام قائم ہو۔

حقوق اور ذمہ داریوں کا باہمی تعلق انسانی معاشرت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔ اگر ہر فرد اپنے حقوق کے مطالبے سے پہلے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے تو ایک منظم اور متوازن معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ اکثر افراد اپنے حقوق کے حوالے سے حساس ہوتے ہیں اور ان کے حصول کے لیے آواز بلند کرتے ہیں، لیکن وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ اگر ہم معاشرتی سطح پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہر فرد کی کچھ ذمہ داریاں ہیں، جنہیں ادا کرنے کے بعد ہی وہ اپنے حقوق کے بارے میں بات کرنے کا اخلاقی اور عملی جواز حاصل کرتا ہے۔

ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا اصول ہمیں اسلامی تعلیمات میں بھی ملتا ہے۔ قرآن و حدیث میں بارہا اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ انسان کو دوسروں کے ساتھ عدل و انصاف کرنا چاہیے، اپنے فرائض ادا کرنے چاہییں اور کسی بھی حق کے مطالبے سے پہلے خود کو اس کا اہل ثابت کرنا چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی سیرت میں ہمیں بارہا یہ اصول نظر آتا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کی پاسداری کو اپنی ذمہ داریوں پر مقدم رکھتے تھے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "تم پر جو ذمہ داریاں ہیں انہیں ادا کرو، پھر اپنے حقوق کا مطالبہ کرو، کیونکہ جو اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتا، وہ اپنے حق کا مطالبہ کرنے کا اہل نہیں۔"

اگر ایک استاد اپنے طلبہ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے حوالے سے اپنی ذمہ داری کو پوری دیانتداری کے ساتھ ادا کرے تو طلبہ بھی علم حاصل کرنے میں دلچسپی لیں گے اور استاد کا احترام کریں گے۔ اگر والدین اپنی اولاد کی پرورش میں کوتاہی نہ کریں، انہیں اسلامی و اخلاقی اقدار سکھائیں، اور ان کے حقوق کا خیال رکھیں تو اولاد بھی ان کے ساتھ محبت اور عزت کا برتاؤ کرے گی۔ اسی طرح، اگر ایک ملازم اپنی ملازمت میں ایمانداری اور محنت سے کام کرے تو وہ اپنے حقوق، جیسے تنخواہ اور سہولتوں کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہو گا۔

ذمہ داریوں کو پورا کیے بغیر حقوق کا مطالبہ کرنا معاشرتی بگاڑ کو جنم دیتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنے فرائض سے غافل ہو کر صرف حقوق کے بارے میں سوچے تو معاشرے میں افراتفری، ناانصافی اور استحصال کا ماحول پیدا ہو جائے گا۔ ایک کامیاب معاشرہ وہی ہوتا ہے جہاں لوگ پہلے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں، انہیں پورا کریں، اور پھر حقوق کی بات کریں۔ یہی اصول خاندان، تعلیمی اداروں، دفاتر اور حکومتی نظام میں بھی لاگو ہوتا ہے۔ اگر ایک حکمران عوام کی خدمت اور عدل و انصاف کی ذمہ داری پوری کرے تو عوام بھی اس کی عزت کریں گے اور اس کے فیصلوں کو قبول کریں گے۔

لہٰذا، ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے فرائض کو پہچانیں اور انہیں پورے اخلاص کے ساتھ ادا کریں۔ جب ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے گا تو ایک ایسا ماحول پیدا ہو گا جہاں حقوق خود بخود میسر آ جائیں گے، اور یوں ایک مثالی اور متوازن معاشرہ وجود میں آئے گا۔

اگر کوئی شخص اپنی تمام ذمہ داریاں دیانتداری اور اخلاص کے ساتھ ادا کر رہا ہو، لیکن اس کے باوجود اسے اس کے جائز حقوق نہ مل رہے ہوں تو یہ ایک سنگین ناانصافی ہے۔ ایسا معاملہ اکثر ظالمانہ نظام، استحصالی رویوں، یا سماجی ناانصافی کی وجہ سے پیش آتا ہے، جہاں کمزور طبقے کے حقوق دبا دیے جاتے ہیں اور طاقتور افراد یا ادارے ان پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں صبر اور حکمت کے ساتھ حقوق کے حصول کے لیے مناسب جدوجہد کرنا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ محض ذمہ داریوں کی ادائیگی انصاف کے قیام کی ضمانت نہیں دیتی، بلکہ بعض اوقات حق لینے کے لیے کوشش اور قربانی دینا بھی لازم ہو جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بھی یہ واضح کیا گیا ہے کہ اگر کسی پر ظلم ہو رہا ہو اور اس کے حقوق پامال کیے جا رہے ہوں تو اسے خاموش نہیں رہنا چاہیے، بلکہ جائز اور شرعی طریقوں سے ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ظالم کے خلاف آواز بلند کرنا سب سے بڑی جہاد کی صورتوں میں سے ایک ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے بھی یزیدی ظلم کے خلاف قیام کرتے ہوئے یہی درس دیا کہ جب حقوق چھینے جا رہے ہوں اور عدل و انصاف کی جگہ جبر و استبداد کا راج ہو تو خاموش رہنا خود ایک گناہ بن جاتا ہے۔

ایسی صورتحال میں فرد کو چاہیے کہ وہ صبر، حکمت اور استقامت کے ساتھ اپنے حقوق کی بحالی کے لیے جدوجہد کرے۔ بعض اوقات ظلم کے خلاف قانونی راستہ اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے، اور کبھی اجتماعی شعور بیدار کر کے حق کی حمایت میں ایک مضبوط موقف اپنانا پڑتا ہے۔ تاریخ میں ہمیں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں انفرادی اور اجتماعی سطح پر لوگوں

نے ظلم اور استحصال کے خلاف مزاحمت کی اور اپنے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

تاہم، حقوق کے حصول کی جدوجہد میں حکمت اور اخلاقیات کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ایک مظلوم شخص اپنی بات منوانے کے لیے ظلم ہی کا راستہ اختیار کرلے، یا انتقام اور فساد کی راہ اپنائے، تو اس کا نتیجہ مزید خرابی کی صورت میں نکلے گا۔ اسلام ہمیں صبر، دعا، اور اللہ کی مدد پر یقین رکھنے کی تعلیم دیتا ہے، مگر ساتھ ہی اس بات کی بھی ہدایت کرتا ہے کہ ظالم کے خلاف معقول اور منظم طریقے سے مزاحمت کی جائے۔

ایسی صورتحال میں اجتماعی کوششوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے باوجود محرومی کا شکار ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی کمیونٹی، اہلِ علم اور دیگر مخلص افراد سے مشورہ لے تاکہ ایک منظم انداز میں حقوق کے لیے کام کیا جا سکے۔ بعض اوقات فرد اکیلا کچھ نہیں کر سکتا، لیکن اگر اجتماعی طور پر حق کے لیے کھڑے ہونے والے افراد مل جائیں تو تبدیلی ممکن ہو جاتی ہے۔

لہٰذا، جب حقوق میسر نہ ہوں تو مایوسی اور ناامیدی کی جگہ صبر، دعا، حکمت اور عملی اقدامات کے ذریعے ان کے حصول کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ دنیا کے بہت سے معاشروں میں حقوق کی جنگیں لڑی گئیں، اور آخرکار وہی لوگ کامیاب ہوئے جنہوں نے اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق کے لیے منظم اور صبر آزما جدوجہد کی۔ اس جدوجہد

میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ انسان اپنے اخلاقی اصولوں پر قائم رہے اور ظلم کے خلاف ایک مضبوط مگر باوقار موقف اختیار کرے، کیونکہ بالآخر اللہ کی نصرت انہی لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو حق پر ہوتے ہیں۔

بچے آپ کے پاس خدا اور امام عصرؑ کی امانت ہیں

بچوں میں احساسِ کمتری، احساسِ محرومی اور احساسِ گناہ مختلف نفسیاتی، سماجی اور خاندانی عوامل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے احساسات کا آغاز عام طور پر ابتدائی عمر میں ہوتا ہے اور ماحول، پرورش کے انداز، والدین کی توقعات، تعلیمی دباؤ اور سماجی تقابل سے جُڑا ہوتا ہے۔ اگر بچہ مسلسل تنقید، تقابل، عدمِ توجّہ یا غیر متوازن محبت کا شکار ہو تو اس کے اندر یہ احساسات جڑ پکڑ لیتے ہیں۔

احساسِ کمتری اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بچہ اپنی صلاحیتوں کو کمتر سمجھنے لگے، دوسروں سے خود کو کمتر محسوس کرے یا اس کی محنت کو سراہے بغیر اسے مسلسل دوسروں سے موازنہ کیا جائے۔ جب والدین یا اساتذہ بچوں سے ان کی استطاعت سے زیادہ توقعات وابستہ کرتے ہیں اور ناکامی پر حوصلہ دینے کے بجائے ملامت کرتے ہیں تو بچہ خود کو ناکام اور کمزور سمجھنے لگتا ہے۔ گھر میں اگر محبت، حوصلہ افزائی اور تسلیم کیے جانے کا ماحول نہ ہو، تو بچہ اپنی ذات کو کم تر محسوس کرتا ہے۔

احساسِ محرومی تب پیدا ہوتا ہے جب بچہ یہ سمجھنے لگے کہ اسے وہ چیزیں نہیں ملتیں جو دوسروں کو حاصل ہیں، چاہے وہ مادی اشیاء ہوں یا جذباتی توجہ۔ اگر والدین کی محبت مشروط ہو، اگر ان کی توجہ صرف مخصوص حالات میں بچے کو ملے، یا اگر بچے کو بار بار یہ باور کرایا

جائے کہ وہ دوسروں کی طرح خوش نصیب نہیں، تو اس کے اندر ایک مستقل احساسِ محرومی پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات مالی حالات، والدین کی مصروفیات، یا دوسرے بہن بھائیوں کی طرف زیادہ توجہ بھی کسی بچے کے اندر یہ احساس پیدا کر سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے برابر نہیں۔

احساسِ گناہ عام طور پر اس وقت جنم لیتا ہے جب بچے کو بار بار اس کی غلطیوں کے لیے موردِ الزام ٹھہرایا جائے، اسے احساس دلایا جائے کہ وہ اچھا نہیں یا وہ ہمیشہ کچھ غلط ہی کرتا ہے۔ اگر والدین یا اساتذہ ہر غلطی پر سخت ردعمل دیں اور غلطی کے اصلاحی پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف سزا اور شرمندگی کو اہمیت دیں، تو بچہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی مذہبی یا اخلاقی تعلیمات کو سختی سے لاگو کرنے کے نتیجے میں بھی بچے کے اندر بے جا احساسِ گناہ پیدا ہو سکتا ہے، خاص طور پر جب اسے نرمی اور رحمت کے بجائے صرف عذاب اور سزا کی تعلیم دی جائے۔

ان مسائل کا حل متوازن اور محبت بھرا رویہ اختیار کرنے میں ہے۔ والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچوں کی حوصلہ افزائی کریں، ان کی غلطیوں کو ان کی شخصیت پر حملہ کیے بغیر درست کریں، اور ان کی صلاحیتوں پر اعتماد بحال کرنے میں مدد کریں۔ بچوں کا موازنہ دوسروں سے کرنے کے بجائے ان کی اپنی ترقی پر توجہ دینی چاہیے اور ان کی کامیابیوں کو سراہنا چاہیے، چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہوں۔ جذباتی محرومی کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو غیر مشروط محبت دی جائے، اس کی بات کو سنا جائے اور اس کے

جذبات کو اہمیت دی جائے۔ احساسِ گناہ کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو غلطیوں کی اصلاح کا موقع دیا جائے، انہیں یہ سمجھایا جائے کہ غلطی کرنا انسانی فطرت ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ناقص یا برا انسان ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی محبت اور تربیت میں اللہ کی رحمت، درگزر اور نرمی کے پہلو کو نمایاں کریں تاکہ بچہ خوف کے بجائے محبت کے جذبے کے تحت نیکی کی طرف مائل ہو۔

بچوں میں احساسِ کمتری، احساسِ محرومی اور احساسِ گناہ پیدا ہونے کے کئی نقصانات ہوتے ہیں جو ان کی ذہنی، جذباتی، تعلیمی اور سماجی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جب کوئی بچہ خود کو دوسروں سے کمتر محسوس کرنے لگے تو اس کے اندر خود اعتمادی ختم ہونے لگتی ہے، وہ اپنے فیصلوں پر یقین نہیں رکھتا اور دوسروں کے مقابلے میں خود کو کمزور سمجھنے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نئے چیلنجز کو قبول کرنے سے کتراتا ہے، اپنی قابلیت کو آزمانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے اور ناکامی کے خوف سے اپنی زندگی کے کئی مواقع کھو دیتا ہے۔ یہ احساس اس کی تعلیمی کارکردگی پر بھی منفی اثر ڈالتا ہے کیونکہ وہ اپنی محنت پر یقین نہیں رکھ پاتا اور مسلسل مایوسی کا شکار رہتا ہے۔ ایسے بچے سماجی محافل میں بھی پیچھے رہ جاتے ہیں، لوگوں سے ملنے جلنے میں ہچکچاتے ہیں اور بعض اوقات اتنے زیادہ شرمیلے ہو جاتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے اپنی بات تک کہنے سے گھبراتے ہیں۔ یہ احساس ان کے اندر جذباتی کمزوری پیدا کر دیتا ہے اور وہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے بجائے دوسروں کے

فیصلوں پر انحصار کرنے لگتے ہیں، جو بعد کی زندگی میں ان کے لیے مزید مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔

احساسِ محرومی بچوں میں چڑچڑاپن، حسد اور غصہ پیدا کر دیتا ہے۔ جب بچہ یہ دیکھتا ہے کہ دوسروں کو وہ سب کچھ حاصل ہے جو اسے نہیں ملا، تو وہ یا تو شدید حسد کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر مکمل مایوسی میں چلا جاتا ہے۔ بعض بچے اس احساس کے باعث بغاوت پر اتر آتے ہیں، وہ ضدی ہو جاتے ہیں اور ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ان کی خواہشات پوری نہ ہوں تو وہ چڑچڑے، غصیلا اور غیر متوازن رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ احساسِ محرومی بعض اوقات بچوں کے اندر اخلاقی کمزوری پیدا کر دیتا ہے، وہ دوسروں کی چیزوں پر نظر رکھنے لگتے ہیں، غلط راستے اختیار کر لیتے ہیں یا اپنے دل کی محرومیوں کو پورا کرنے کے لیے غیر مناسب رویہ اپناتے ہیں۔ ایسے بچے بڑے ہو کر بھی ہر حال میں خود کو محروم ہی محسوس کرتے ہیں، چاہے انہیں دنیا کی ہر نعمت مل جائے، ان کے اندر تسکین اور اطمینان کا فقدان رہتا ہے اور وہ ہر وقت دوسروں کی زندگیوں کو دیکھ کر اپنی زندگی سے ناخوش رہتے ہیں۔

احساسِ گناہ بچوں کے ذہن پر خوف اور بے یقینی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ جب کسی بچے کو ہر وقت اس کی غلطیوں پر شرمندہ کیا جائے، اسے مسلسل ملامت کا سامنا ہو یا اس کی کسی کوتاہی کو معاف کرنے کے بجائے ہر بار اس کی طرف انگلی اٹھائی جائے تو وہ اپنے وجود کے بارے میں منفی سوچنے لگتا ہے۔ ایسے بچے اپنی فطری خوشیوں سے محروم ہو جاتے ہیں، ہر

کام کرتے وقت انہیں یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ وہ غلطی کر رہے ہیں اور ان سے کوئی نہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کسی بھی سرگرمی میں مکمل اعتماد کے ساتھ شامل نہیں ہو پاتے، اپنی صلاحیتوں کو دبانے لگتے ہیں اور بعض اوقات خود کو ناقابلِ معافی سمجھنے لگتے ہیں۔ بعض بچے اس احساس کے باعث دین سے دور ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا، جبکہ کچھ بچے غیر ضروری شدت پسندی میں مبتلا ہو کر اپنی ذات پر سختی کرنا شروع کر دیتے ہیں، اپنی خوشیوں کو گناہ سمجھنے لگتے ہیں اور خود کو بے جا سزا دینے لگتے ہیں۔ اس احساس کے زیرِ اثر وہ سماجی تعلقات میں بھی کمزور ہو جاتے ہیں، دوسروں کے ساتھ گھلنے ملنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں اور خود کو تنہائی میں قید کر لیتے ہیں۔

یہ تینوں احساسات اگر کسی بچے کی شخصیت میں پختہ ہو جائیں تو وہ ایک غیر متوازن، کمزور اور منفی شخصیت کا مالک بن سکتا ہے۔ ایسے بچے بڑے ہو کر اپنی زندگی میں کوئی بڑا اقدام اٹھانے سے ڈرتے ہیں، دوسروں پر انحصار کرتے ہیں اور معاشرتی طور پر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان احساسات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کی پرورش محبت، حوصلہ افزائی اور مثبت رویے کے ساتھ کی جائے۔ انہیں ان کی غلطیوں پر مکمل طور پر گناہگار محسوس کرانے کے بجائے اصلاح کا موقع دیا جائے، ان کی محنت کو سراہا جائے اور ان کی شخصیت کو تقویت دی جائے تاکہ وہ خود کو ایک باصلاحیت، خودمختار اور متوازن فرد کے طور پر دیکھ سکیں۔

خود اعتمادی اور خودی کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو اس کی صلاحیتوں پر یقین دلایا جائے اور اس کی مثبت کوششوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچوں کی غلطیوں پر انہیں کمتر محسوس کرانے کے بجائے ان کی اصلاح میں مدد کریں، ان کی خوبیوں کو اجاگر کریں اور انہیں اپنی قابلیت کو آزمانے کے مواقع فراہم کریں۔ بچے کی خودی کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے خود فیصلے کرنے کا موقع دیا جائے، تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور اپنی ذات پر بھروسہ پیدا کرے۔ انہیں سکھایا جائے کہ مشکلات زندگی کا حصہ ہیں اور ان سے گھبرانے کے بجائے سیکھنے اور آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ اسلام میں خودی اور خود اعتمادی کی بڑی اہمیت ہے، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: "اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی" (سورۃ النجم 39)۔ یہ آیت خودی کے تصور کو واضح کرتی ہے کہ کامیابی کا دارومدار اپنی محنت اور جدوجہد پر ہے، نہ کہ دوسروں کے سہارے پر۔

خود اعتمادی اور خودی کے مضبوط ہونے کے کئی فائدے ہیں۔ ایک خود اعتماد بچہ زندگی کے چیلنجز کا بہادری سے سامنا کرتا ہے، اپنے فیصلے خود کرتا ہے اور دوسروں پر غیر ضروری انحصار نہیں کرتا۔ اس کے اندر مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے، وہ معاشرتی اور تعلیمی میدان میں نمایاں کارکردگی دکھاتا ہے اور جذباتی طور پر بھی زیادہ مستحکم رہتا ہے۔ ایسے بچے مثبت رویے اپناتے ہیں، دوسروں سے حسد یا خوف محسوس کرنے کے بجائے اپنی ترقی پر توجہ دیتے ہیں اور زندگی میں بہتر کارکردگی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ دینِ

اسلام میں بھی خودی اور عزتِ نفس کی تعلیم دی گئی ہے، جیسا کہ امام علیؑ فرماتے ہیں: "جس نے اپنی قدر پہچان لی، وہ کبھی ذلیل نہیں ہو گا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خودی کی پہچان ہی درحقیقت کامیابی اور عزت کی بنیاد ہے۔

شادی میں رکاوٹ استعماری سازشیں

شادی ایک ایسا بندھن ہے جو حقوق اور ذمہ داریوں کے مجموعے پر مبنی ہوتا ہے اور اس کا بنیادی مقصد انسانی زندگی کو متوازن اور مکمل بنانا ہے۔ یہ تعلق نہ صرف دو افراد کو جوڑتا ہے بلکہ خاندان اور معاشرے کی بنیاد بھی مستحکم کرتا ہے۔ تاہم، استعماری اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے اس مقدس رشتے کو کمزور کرنے کے لیے ایک گہری سازش کی ہے، جس کے تحت شادی کو ایک بوجھ، زحمت اور قید کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اس ذہنیت کی سب سے عام اور مؤثر حکمت عملی یہ رہی ہے کہ شادی شدہ زندگی کو مزاحیہ لطیفوں اور طنزیہ تبصروں کا نشانہ بنایا جائے، جہاں شوہر کو ایک مجبور، بے بس اور محکوم فرد کے طور پر اور بیوی کو ایک جھگڑالو، حاکمانہ اور ناقابلِ برداشت ہستی کے طور پر دکھایا جائے۔ اس طرح کے نظریات ذرائع ابلاغ، فلموں، ڈراموں اور سوشل میڈیا کے ذریعے عام کیے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ تصور راسخ ہو جائے کہ شادی درحقیقت آزادی کی موت اور مشکلات کا آغاز ہے۔

یہ رجحان محض تفریح یا مزاح کی حد تک محدود نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک گہری حکمت عملی کارفرما ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ یہ نظام فرد کو اس بات پر مائل کرتا ہے کہ وہ انفرادیت کو ہر چیز پر مقدم رکھے، اپنے جذبات، خواہشات اور

مفادات کو اولین ترجیح دے، اور اجتماعیت، خاندان اور روایتی رشتوں کو غیر ضروری یا کم اہم سمجھے۔ اگر شادی کو ایک مثبت، خوشگوار اور متوازن تعلق کے طور پر فروغ دیا جائے تو اس سے خاندان مضبوط ہو گا اور اجتماعیت کو فروغ ملے گا، جس کا نتیجہ ایک مستحکم اور اخلاقی اقدار پر مبنی معاشرہ ہو گا۔

سرمایہ داری نظام اس مضبوط خاندانی ڈھانچے کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے کیونکہ اس نظام کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ افراد تنہائی کا شکار ہوں، زیادہ سے زیادہ خرید و فروخت پر مائل ہوں، اور صارفیت کی دوڑ میں مسلسل الجھے رہیں۔ جب خاندان کا ادارہ کمزور ہوتا ہے اور شادی کو ایک غیر ضروری یا ناخوشگوار تجربہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے تو لوگ انفرادی طرزِ زندگی اختیار کرنے لگتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ زیادہ خرچ کرتے ہیں، تفریحی صنعتوں پر زیادہ انحصار کرتے ہیں، اور نفسیاتی طور پر ایسی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جہاں وہ مصنوعی آسائشوں اور تسکین کے متلاشی بن جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ ماحول میں شادی کو ایک بوجھ اور ازدواجی زندگی کو ایک الجھن کے طور پر پیش کرنے کا عمل تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس پروپیگنڈے کے خلاف ضروری ہے کہ شادی کے اصل مفہوم کو سمجھا جائے اور اسے محض ایک سماجی یا قانونی معاہدہ نہیں بلکہ ایک مقدس، فطری اور متوازن زندگی گزارنے کا ذریعہ تصور کیا جائے۔ اسلام نے شادی کو صرف ایک اخلاقی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ ایک روحانی تعلق اور ایک پُرسکون، محبت بھرا رشتہ قرار دیا ہے، جس کا مقصد نہ صرف زوجین کے درمیان محبت اور

سکون کا قیام ہے بلکہ ایک مضبوط، متحرک اور باکردار نسل کی تربیت بھی ہے جو سماج کے استحکام میں اپنا کردار ادا کرے۔

اسلامی اصول اس استعماری اور سرمایہ دارانہ سازش کو جڑ سے اکھاڑنے کی طاقت رکھتے ہیں کیونکہ اسلام کا خاندانی نظام انفرادیت پسندی اور صارفیت کے اس مصنوعی تصور کے خلاف ایک مضبوط دیوار ہے۔ اسلام شادی کو محض ایک سماجی معاہدہ نہیں بلکہ ایک مقدس عبادت قرار دیتا ہے، جہاں مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے سکون، محبت، اور رحمت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ قرآن مجید میں واضح الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں، یعنی وہ ایک دوسرے کی کمزوریوں کو ڈھانپنے اور ایک دوسرے کے وجود کو مکمل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ تصور سرمایہ دارانہ سوچ کے اس بنیادی نظریے کو چیلنج کرتا ہے جو فرد کو تنہا، خود مختار اور صرف مادی فوائد کا متلاشی بنانے پر زور دیتا ہے۔

اسلام شادی کو صرف دنیاوی زندگی تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے ایک ایسا عمل قرار دیتا ہے جو آخرت میں بھی انسان کے لیے باعثِ برکت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کو نصف ایمان قرار دیا، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک متوازن ازدواجی زندگی دین کے مکمل ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس، سرمایہ دارانہ نظام انسان کو ایسی نفسیاتی حالت میں رکھنا چاہتا ہے جہاں وہ ہمیشہ اضطراب، بے چینی اور نا تمام خواہشات میں الجھا رہے، تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مادی آسائشوں کی تلاش میں رہے اور اپنی روحانی ترقی سے غافل ہو جائے۔

اسلام کا تصورِ قناعت اور باہمی تعاون بھی اس سرمایہ دارانہ ایجنڈے کو ناکام بناتا ہے۔ مغربی طرزِ زندگی شادی کو ایک ایسا مالی بوجھ بنا کر پیش کرتا ہے جہاں زندگی کا ہر لمحہ مادی آسائشوں اور دنیاوی کامیابیوں کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ لیکن اسلام سادہ طرزِ زندگی، باہمی رضا مندی، اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ زہر اسلام اللہ علیہا کی ازدواجی زندگی اس بات کی بہترین مثال ہے کہ ایک خاندان کا استحکام مادی وسائل پر نہیں بلکہ محبت، ایثار اور ایک دوسرے کی ضروریات کو سمجھنے پر منحصر ہوتا ہے۔

اسلام کا اصولِ اجتماعیت، جو خاندان کو ایک مضبوط اکائی سمجھتا ہے، سرمایہ دارانہ نظام کے انفرادیت پسند رویے کو رد کرتا ہے۔ ایک اسلامی معاشرے میں خاندان صرف دو افراد کے تعلق کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا مضبوط ادارہ ہوتا ہے جہاں والدین، اولاد، رشتہ دار اور قریبی احباب سب ایک دوسرے کی اخلاقی اور عملی تربیت میں شریک ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، سرمایہ داری افراد کو خاندانی اکائی سے کاٹ کر انہیں محض صارف بنا دیتی ہے، تاکہ وہ جذباتی اور نفسیاتی کمزوری کے عالم میں ہر وقت خریداری اور تفریحی سرگرمیوں میں مصروف رہیں۔

اسلام کا نظامِ عدل اور حقوق و فرائض کی تقسیم بھی اس پروپیگنڈے کو بے اثر کر دیتا ہے، کیونکہ اسلام میں شوہر اور بیوی دونوں کے لیے واضح حقوق اور ذمہ داریاں متعین ہیں، جنہیں نظر انداز کر کے ازدواجی زندگی کو ایک بوجھ کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن

اور احادیث میں میاں بیوی کے باہمی تعلق کو محبت اور رحمت کے اصولوں پر قائم کرنے کی بارہا تاکید کی گئی ہے، تاکہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ جبکہ سرمایہ دارانہ نظام رشتوں کو ذمہ داری کے بوجھ کے طور پر پیش کرتا ہے اور انہیں ختم کرنے کے جواز تلاش کرتا ہے، تاکہ لوگ غیر ذمہ دار زندگی گزاریں اور معاشرہ تیزی سے اخلاقی زوال کا شکار ہو جائے۔

یہی وہ اصول ہیں جو استعماری ذہنیت کے اس منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے کافی ہیں، کیونکہ جب انسان اپنی ازدواجی زندگی کو ایک مقدس ذمہ داری اور ایک روحانی سفر کے طور پر دیکھے گا، تو وہ سرمایہ دارانہ سوچ کے فریب میں نہیں آئے گا۔ اسلام فرد کو مادی آسائشوں اور جذباتی تنہائی کی بجائے ایک مضبوط خاندانی اور اجتماعی نظام کا حصہ بننے کی تلقین کرتا ہے، جو نہ صرف اس دنیا میں سکون کا ذریعہ ہے بلکہ آخرت میں بھی کامیابی کی ضمانت بنتا ہے۔

ازدواجی زندگی کے مسائل اور ان کا حل

شادی شدہ زندگی میں ناچاقیوں کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، جو زیادہ تر جذباتی، نفسیاتی، سماجی اور مالی عوامل سے جڑے ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا سبب غلط توقعات ہوتی ہیں، جہاں شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے سے غیر حقیقی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ جب یہ توقعات پوری نہیں ہوتیں تو مایوسی، ناگواری اور غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ ازدواجی تعلق میں اگر ایک دوسرے کی شخصیت، عادات اور جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے تو یہ رشتہ دھیرے دھیرے تلخیوں میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

کمیونیکیشن یعنی مؤثر گفتگو کی کمی بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اگر میاں بیوی ایک دوسرے سے کھل کر اپنے جذبات، خیالات اور پریشانیاں شیئر نہ کریں تو وقت کے ساتھ ساتھ خاموشی بدگمانی کو جنم دیتی ہے۔ اکثر جھگڑے معمولی باتوں سے شروع ہوتے ہیں مگر ان پر بات نہ کرنے یا غلط انداز میں بحث کرنے کی وجہ سے یہ بڑے تنازعات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح عدم برداشت اور غصہ بھی ازدواجی ناچاقی کی بڑی وجوہات میں سے ایک ہے۔ اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک یا دونوں معمولی باتوں پر غصے میں آ جائیں، ایک دوسرے کو الزام دینے لگیں یا طنزیہ رویہ اپنائیں تو رشتے میں محبت کی جگہ نفرت اور ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔

مالی معاملات بھی ایک اہم وجہ ہوسکتے ہیں۔ اگر شوہر کی آمدنی کم ہو، بیوی کو ضرورت سے زیادہ اخراجات کی عادت ہو، یا دونوں میں مالی امور پر ہم آہنگی نہ ہو تو اس سے تلخیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اکثر بیویاں یہ محسوس کرتی ہیں کہ ان کے شوہر انہیں مناسب وقت اور مالی سہولتیں نہیں دے رہے، جبکہ بعض شوہر یہ سمجھتے ہیں کہ بیویاں فضول خرچ ہیں اور غیر ضروری خواہشات رکھتی ہیں۔ اسی طرح سسرال کے مسائل بھی کئی گھروں میں ناچاقی کا سبب بنتے ہیں۔ اگر شوہر اپنی ماں اور بیوی کے درمیان توازن برقرار نہ رکھ سکے یا بیوی اپنے سسرال کے ساتھ ایڈجسٹ نہ کر سکے تو اس سے ازدواجی زندگی میں کشیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔

بعض اوقات، رشتے میں ناچاقی کی جڑ جذباتی لاتعلقی بھی ہوتی ہے۔ اگر شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو وقت نہ دیں، ایک دوسرے کی بات نہ سنیں یا جذباتی طور پر ایک دوسرے سے دور ہو جائیں تو شادی ایک بوجھ لگنے لگتی ہے۔ جب شوہر دفتر یا کاروبار میں حد سے زیادہ مصروف ہو جائے اور بیوی گھر میں تنہا یا غیر اہم محسوس کرے، تو اس سے بے چینی اور چڑچڑاپن پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح، اگر کوئی بھی فریق ازدواجی تعلقات میں سرد مہری کا شکار ہو، ایک دوسرے کے احساسات کی پرواہ نہ کرے، یا رشتے کی تازگی برقرار رکھنے کی کوشش نہ کرے تو اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ محبت کے خاتمے کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

بعض ازدواجی مسائل عدم اعتماد اور شک کی وجہ سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر بیوی شوہر پر بے جا شک کرے یا شوہر بیوی پر نظر رکھے، اس کے فیصلوں پر سوال اٹھائے یا اس کی

زندگی کو محدود کرنے کی کوشش کرے تو یہ جذباتی دباؤ بڑھاتا ہے۔ بعض صورتوں میں، باہر کے تعلقات یا غیر اخلاقی سرگرمیاں بھی رشتے میں دراڑ پیدا کر سکتی ہیں، جن کی وجہ سے ایک دوسرے پر بھروسہ ختم ہو جاتا ہے۔

ناچاقی کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی نفسیاتی ضروریات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ عورت کو محبت، توجہ، عزت اور حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ مرد کو عزت، تس ملیمیت اور حوصلہ افزائی چاہیے ہوتی ہے۔ اگر کوئی بھی فریق دوسرے کی بنیادی نفسیاتی ضروریات کو نہ سمجھے تو آہستہ آہستہ رشتہ کمزور ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح بچوں کی تربیت اور ان سے جڑے فیصلے بھی بعض اوقات جھگڑوں کا سبب بن سکتے ہیں، جہاں میاں بیوی کی رائے مختلف ہو اور وہ ایک دوسرے کے فیصلوں کو قبول نہ کریں۔

ازدواجی زندگی میں اگر اللہ کا خوف اور دین کی برکت شامل نہ ہو تو بھی ناچاقیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جب انسان صرف مادی مفادات کو ترجیح دے، حقوق کے بجائے فرائض کو نظر انداز کرے اور صبر و شکر کی جگہ شکایت اور ناشکری کا رویہ اپنائے تو گھر کا ماحول خراب ہونے لگتا ہے۔ اگر شوہر اور بیوی دونوں دین کے اصولوں کو اپنائیں، ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں اور رشتے کو عبادت سمجھ کر نبھائیں تو بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔

اگر بیویاں صرف حقوق کا مطالبہ کریں اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کریں تو ازدواجی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اسلام میں میاں اور بیوی دونوں کے لیے حقوق اور فرائض

متعین کیے گئے ہیں، اور اگر کوئی فریق صرف اپنے حقوق کی بات کرے لیکن اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرے تو یہ ناانصافی اور ازدواجی زندگی میں بے سکونی کا باعث بنتا ہے۔ ایک خوشحال ازدواجی زندگی اسی وقت ممکن ہے جب دونوں میاں بیوی نہ صرف اپنے حقوق کا خیال رکھیں بلکہ اپنی ذمہ داریوں کو بھی احسن طریقے سے نبھائیں۔

جب بیویاں اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرتی ہیں، تو گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ شوہر پر پہلے ہی معاشی ذمہ داری کا بوجھ ہوتا ہے، اور اگر وہ گھر آکر سکون کے بجائے شکایتوں اور مطالبوں کا سامنا کرے تو اس کا ذہنی دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ یا تو خاموشی اختیار کر لیتا ہے، جو ازدواجی تعلق میں سرد مہری پیدا کرتی ہے، یا پھر غصے میں آکر تلخ رویہ اپناتا ہے، جس سے رشتے میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں۔

بعض خواتین جدید سماجی رجحانات سے متاثر ہو کر صرف آزادی اور حقوق کی بات کرتی ہیں، لیکن وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ ایک مستحکم خاندان کے لیے ایثار، محبت اور ذمہ داری کا احساس بنیادی عناصر ہیں۔ اگر بیوی اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو بوجھ سمجھے، بچوں کی تربیت سے غفلت برتے، شوہر کے جذبات اور ضروریات کو نظر انداز کرے اور ہر وقت صرف اپنے مطالبات پیش کرے، تو اس کے نتیجے میں گھر کا ماحول کشیدہ ہو جاتا ہے۔ شوہر کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی قربانیوں کی کوئی قدر نہیں کی جا رہی، اور یوں اس کے دل سے محبت اور شفقت کی وہ کیفیت ختم ہو سکتی ہے جو ازدواجی زندگی کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔

یہ رویہ صرف شوہر کے لیے ہی نہیں بلکہ خود بیوی کے لیے بھی نقصان دہ ہوتا ہے، کیونکہ جب عورت اپنی ذمہ داریوں کو ترک کر دیتی ہے تو وہ گھر کے اندر اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ وہ نہ شوہر کے دل میں عزت برقرار رکھ پاتی ہے اور نہ ہی بچوں کی صحیح تربیت کر سکتی ہے، جس کے نتیجے میں پورا خاندان عدم استحکام کا شکار ہو جاتا ہے۔ بچوں کی شخصیت پر بھی اس کا برا اثر پڑتا ہے، کیونکہ وہ ایک ایسی ماں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو قربانی اور ایثار کی بجائے خود غرضی اور صرف حقوق کے مطالبے کی تعلیم دے رہی ہوتی ہے۔

اسلام میں بیوی کے حقوق کے ساتھ ساتھ اس کی ذمہ داریوں پر بھی زور دیا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے لیے سکون اور راحت کا باعث بنے۔ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی زندگی اس بات کی بہترین مثال ہے کہ ایک بیوی کیسی ہونی چاہیے۔ باوجود اس کے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی تھیں، انہوں نے کبھی اپنے حقوق کا مطالبہ کر کے اپنی ذمہ داریوں سے غفلت نہیں برتی۔ بلکہ انہوں نے صبر، محبت، اور ایثار کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ دیا، اور ان کے گھر کو ایک جنت میں تبدیل کر دیا۔

اگر بیویاں اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کریں تو شوہروں کے دلوں میں مایوسی اور بیزاری پیدا ہو سکتی ہے، جو ازدواجی تعلق کو کمزور کر دیتی ہے۔ اس کا حل یہی ہے کہ عورتیں حقوق کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو بھی سمجھیں، محبت اور اخلاص کے ساتھ اپنے گھریلو فرائض سرانجام دیں، اور رشتے میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جب

ایک عورت اپنے فرائض کو سمجھ کر ادا کرتی ہے تو وہ اپنے شوہر اور بچوں کے دلوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیتی ہے، اور یہی چیز ایک کامیاب ازدواجی زندگی کی بنیاد بنتی ہے۔

اگر شوہر اپنی ذمہ داریوں اور ضابطوں سے فرار کرے تو ازدواجی زندگی شدید مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے، کیونکہ اسلام نے مرد کو خاندان کا قوام قرار دیا ہے، یعنی وہ اپنی بیوی اور بچوں کا محافظ اور کفیل ہے۔ جب شوہر اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرتا ہے، تو بیوی عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی ہے اور گھر کا ماحول کشیدگی اور اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

معاشی ذمہ داریوں سے فرار کرنے والا شوہر گھر کے اخراجات پورے کرنے میں کوتاہی برتتا ہے، جس کی وجہ سے بیوی اور بچوں کو بنیادی ضروریات کے لیے دوسروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اگر شوہر کمانے کے قابل ہونے کے باوجود ناداری یا بے بسی کا بہانہ کرے اور اپنی محنت کی جگہ آرام اور تفریح کو ترجیح دے، تو اس کا نتیجہ گھریلو جھگڑوں اور ازدواجی تلخیوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ بیوی کو جب یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مالی طور پر غیر مستحکم ہو گئی ہے اور شوہر اسے بے سہارا چھوڑ کر اپنی ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کر رہا ہے، تو اس کے دل میں ناگواری اور شکوے پیدا ہونے لگتے ہیں، جو دھیرے دھیرے نفرت میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

گھریلو معاملات میں عدم دلچسپی اور بے توجہی بھی شوہر کے فرائض سے غفلت کی ایک شکل ہے۔ اگر شوہر گھر آ کر بیوی اور بچوں کے ساتھ وقت نہ گزارے، ان کے مسائل نہ سنے،

ان کی جذباتی ضروریات کا خیال نہ رکھے، اور صرف اپنی مصروفیات اور دلچسپیوں میں لگا رہے، تو اس سے ازدواجی زندگی میں دراڑیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر سے محبت، توجہ اور عزت کی امید رکھے، اور اگر اسے یہ سب کچھ نہ ملے تو اس کا دل افسردہ ہو جاتا ہے، اور وہ خود کو بے وقعت محسوس کرنے لگتی ہے۔

اخلاقی اور دینی ضابطوں سے فرار کرنے والا شوہر بھی ازدواجی زندگی کو مشکلات میں ڈال دیتا ہے۔ اگر شوہر جھوٹ بولے، بددیانتی کرے، دوسروں کی عورتوں میں دلچسپی لے، یا غیر شرعی راستوں پر چلے، تو اس سے بیوی کا اس پر اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ اسلام نے ازدواجی زندگی میں وفاداری، دیانت داری اور حسن سلوک کو لازم قرار دیا ہے، اور اگر شوہر ان اصولوں کو پامال کرے، بیوی پر ظلم کرے، اس کے جذبات کو مجروح کرے، یا اس کے ساتھ نرمی کے بجائے سختی اور بے رحمی سے پیش آئے، تو اس سے گھر کا ماحول جہنم بن جاتا ہے۔

بعض شوہر اپنی انا کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ وہ بیوی کی عزت اور اس کے احساسات کا لحاظ نہیں رکھتے۔ وہ اپنی بات کو حتمی سمجھتے ہیں، بیوی کے مشورے کو اہمیت نہیں دیتے، اور اپنی خواہشات کو ہر حال میں مقدم رکھتے ہیں۔ ایسے رویے سے بیوی کے دل میں احساسِ محرومی پیدا ہوتا ہے، اور وہ اپنے شوہر کو اپنا ساتھی نہیں بلکہ ایک آمر سمجھنے لگتی ہے۔ ازدواجی زندگی میں شراکت داری اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام لازمی ہے، اور اگر شوہر ان اصولوں سے انحراف کرے تو اس کے نتیجے میں رشتہ کمزور ہو سکتا ہے۔

اولاد کی تربیت سے فرار بھی شوہر کی بڑی کوتاہیوں میں سے ایک ہے۔ اگر شوہر بچوں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی نہ لے، ان کے اخلاق، کردار اور دینی معاملات کی نگرانی نہ کرے، اور ساری ذمہ داری بیوی پر ڈال دے، تو اس کا نقصان پورے خاندان کو ہوتا ہے۔ بچوں کو ماں اور باپ دونوں کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، اور اگر شوہر اس سے غافل ہو جائے، تو اس کے اثرات نہ صرف بیوی پر بلکہ بچوں کے مستقبل پر بھی پڑتے ہیں۔

اگر شوہر ازدواجی تعلقات میں اپنی ذمہ داریوں سے بھاگے اور صرف حقوق کا مطالبہ کرے تو یہ بھی ناانصافی ہے۔ اسلام نے شوہر کو بیوی کے ساتھ حسن سلوک، محبت، نرمی اور عدل کا پابند بنایا ہے۔ اگر وہ ان اصولوں کی خلاف ورزی کرے اور اپنی خواہشات کو مقدم رکھتے ہوئے بیوی کے حقوق کو نظر انداز کرے، تو اس سے ازدواجی رشتہ کھچاؤ اور تلخی کا شکار ہو سکتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سب سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بہترین سلوک کرے، اور اگر شوہر اس بنیادی ہدایت کو پس پشت ڈال دے، تو وہ خود اپنی ازدواجی زندگی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا ہوتا ہے۔

ازدواجی زندگی کا حسن اسی میں ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں نہ صرف اپنے حقوق کو سمجھیں بلکہ اپنی ذمہ داریوں کو بھی خوش دلی سے ادا کریں۔ اگر شوہر اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتے تو اس کا نقصان صرف بیوی کو نہیں بلکہ پورے گھرانے کو ہوتا ہے، اور ایک ایسا ماحول جنم لیتا ہے جہاں محبت اور سکون کی جگہ ناگواری، بے چینی اور رنجشیں لے لیتی ہیں۔

ازدواجی ناچاقیوں کا بنیادی حل یہی ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق اور فرائض کو صحیح معنوں میں سمجھیں اور عملی طور پر ان پر عمل کریں۔ ایک خوشحال اور متوازن ازدواجی زندگی کے لیے سب سے پہلے نیت کی درستگی ضروری ہے۔ اگر شادی کو محض ایک سماجی معاہدہ یا ذمہ داری سمجھا جائے، تو اس میں بوجھ اور جبر کا احساس پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر اسے اللہ کی رضا اور سنتِ رسولؐ کی پیروی کے طور پر اپنایا جائے، تو اس میں محبت، سکون اور برکت پیدا ہوتی ہے۔

میاں بیوی کے درمیان محبت اور باہمی احترام کا ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ محبت صرف زبانی دعوے یا وقتی جذبات کا نام نہیں، بلکہ اس کا اصل اظہار ایک دوسرے کی ضروریات، احساسات اور جذبات کی قدر کرنے میں ہے۔ اگر بیوی کو شوہر کی طرف سے عزت، شفقت اور محبت ملے تو وہ اپنی ذمہ داریوں کو خوش دلی سے نبھائے گی، اور اگر شوہر کو بیوی کی طرف سے وفاداری، احترام اور قدر دانی ملے تو وہ بھی اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

باہمی گفت و شنید ہر مسئلے کا بہترین حل ہے۔ اکثر ناچاقیاں غلط فہمیوں، بے جا توقعات، یا ایک دوسرے کی بات نہ سننے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر میاں بیوی اپنے مسائل کو جذبات میں بہہ کر یا غصے میں آکر حل کرنے کے بجائے، سنجیدگی اور تحمل سے بات چیت کے ذریعے حل کریں، تو زیادہ تر اختلافات خود ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کی سیرت ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ ازدواجی زندگی میں نرمی، برداشت اور گفت و شنید کے ذریعے مسائل کو حل کیا جائے۔

برداشت اور درگزر وہ خوبیاں ہیں جو ہر کامیاب شادی کی بنیاد ہوتی ہیں۔ میاں بیوی انسان ہیں اور ان سے غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ اگر دونوں ایک دوسرے کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر سختی برتنے کے بجائے درگزر اور نرمی کا رویہ اپنائیں تو ازدواجی زندگی میں سکون قائم رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے، اور یہی اصول شوہروں کے لیے بھی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے جذبات کی قدر کریں اور سخت رویہ نہ اپنائیں۔

ذمہ داریوں کی تقسیم اور ان کا احساس بھی ناچاقیوں کے خاتمے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ازدواجی زندگی میں اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک صرف حقوق کی بات کرے اور دوسرے کی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرے تو رشتہ ناپائیدار ہو جاتا ہے۔ شوہر کو اپنی معاشی اور اخلاقی ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں، جبکہ بیوی کو گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی تربیت اور شوہر کے سکون کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر کوئی اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برت رہا ہو تو دوسرے کو نرمی، محبت اور حکمت کے ساتھ اسے سمجھانا چاہیے، نہ کہ غصے یا بدتمیزی سے پیش آنا چاہیے، کیونکہ سختی اور ضد رشتے کو مزید کمزور کرتی ہے۔

اللہ سے تعلق مضبوط کرنا اور دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ازدواجی ناچاقیوں کا سب سے مؤثر حل ہے۔ اگر میاں بیوی اپنی زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق گزاریں، نماز، دعا، اور قرآن کی تلاوت کو معمول بنائیں، اور ایک دوسرے کو اللہ کے احکامات کی یاددہانی کراتے رہیں، تو ان کے درمیان محبت اور سکون بڑھے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شوہر اور بیوی مل کر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں تو اللہ ان کے درمیان محبت اور برکت نازل کرتا ہے۔

بچوں کی تربیت میں شراکت داری بھی ازدواجی تعلقات کو مضبوط کرتی ہے۔ اگر شوہر اپنی ذمہ داریوں سے فرار کرے یا بیوی بچوں کی پرورش میں لاپرواہی برتے، تو اس کا اثر نہ صرف ان کے تعلقات پر بلکہ بچوں کی شخصیت پر بھی پڑتا ہے۔ بچوں کی تربیت میں والدین کا مل کر کام کرنا، ان کے اخلاق و کردار پر توجہ دینا اور ان کے لیے ایک اچھا نمونہ بننا لازمی ہے تاکہ وہ ایک متوازن اور خوشحال خاندان میں پروان چڑھیں۔

اگر ازدواجی زندگی میں کوئی شدید تنازع پیدا ہو جائے، تو بڑوں یا کسی قابل اعتماد شخص سے مشورہ لینا ایک اچھا حل ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھار کسی تیسرے غیر جانبدار شخص کی رائے حالات کو بہتر بنانے میں مدد دے سکتی ہے، خاص طور پر جب دونوں میاں بیوی اپنے اختلافات کو خود حل کرنے سے قاصر ہوں۔ تاہم، اس میں احتیاط ضروری ہے کہ ایسے کسی شخص کا انتخاب کیا جائے جو دیانت دار ہو اور نیک نیتی سے مسئلے کو سلجھانے میں مدد کرے، نہ کہ مزید بگاڑ پیدا کرے۔

آخر میں، ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کا جذبہ رکھیں۔ اگر ہر فریق دوسرے سے صرف لینے کی خواہش رکھے اور دینے کے لیے تیار نہ ہو، تو یہ رشتہ دیرپا نہیں رہ سکتا۔ خوشحال ازدواجی زندگی کا راز اس میں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی ضروریات اور خواہشات کو اپنے اوپر ترجیح دیں، صبر، محبت، اور ایثار سے کام لیں، اور اپنے تعلق کو محض دنیاوی رشتہ نہ سمجھیں بلکہ اسے اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنائیں۔

اسلامی ثقافت، تہذیب اور تمدن

ثقافت، تہذیب اور تمدن — یہ تینوں اصطلاحات بظاہر ایک دوسرے کے مترادف معلوم ہوتی ہیں، مگر ان کے معانی، دائرہ کار اور اطلاق میں باریک مگر اہم فرق پایا جاتا ہے۔

ثقافت بنیادی طور پر کسی قوم یا معاشرے کی ذہنی، فکری اور روحانی حالت کا نام ہے۔ اس میں عقائد، رسوم و رواج، اخلاقی اقدار، زبان، ادب، مذہب، فنونِ لطیفہ، لباس، خوراک، شادی بیاہ کے طریقے اور انسانی رویّے شامل ہوتے ہیں۔ ثقافت انسان کی باطنی زندگی اور اس کے ذہنی رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ وہ غیر مادی اور فکری ورثہ ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا ہے، اور ایک قوم کی پہچان بناتا ہے۔ اگر کوئی معاشرہ صرف مادی ترقی حاصل کر لے لیکن اپنے اخلاقی اور فکری ورثے سے کٹ جائے تو وہ ثقافتی لحاظ سے خالی ہو جاتا ہے۔

تہذیب اس ثقافت کا وہ پہلو ہے جو دوسروں کے ساتھ تعامل، آداب، سلیقہ، حسنِ اظہار اور حسنِ تعلقات میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ انسانی رویّے کا نکھرا ہوا اور اعلیٰ روپ ہے۔ تہذیب اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی ثقافت میں فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور سماجی حسن بھی پیدا ہو جائے۔ تہذیب، ثقافت کا وہ حصہ ہے جو انسان کو مہذب بناتا ہے، یعنی ایسا انسان جو دوسروں کے ساتھ ہمدردی، نرمی، رواداری اور وقار کے ساتھ پیش آتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ثقافت اندرونی کیفیت ہے جبکہ تہذیب اس کا عملی اور خارجی اظہار ہے۔

تمدن مادی ترقی، سائنسی ایجادات، تکنیکی سہولیات، شہری نظم و نسق، اور انفراسٹرکچر سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کوئی قوم سڑکیں بناتی ہے، ادارے قائم کرتی ہے، ٹیکنالوجی میں آگے بڑھتی ہے، شہروں کو ترتیب دیتی ہے اور سائنسی علوم میں مہارت حاصل کرتی ہے تو یہ تمدن کہلاتا ہے۔ تمدن انسان کی ظاہری اور مادی ترقی کو ظاہر کرتا ہے، جبکہ تہذیب انسان کی باطنی خوبصورتی اور اخلاقی بلندی کی علامت ہے۔ تمدن کے بغیر زندگی مشکل ہو سکتی ہے، مگر تہذیب کے بغیر زندگی بدصورت اور درشت ہو جاتی ہے۔

تینوں اصطلاحات کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ ثقافت ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جس پر تہذیب تعمیر ہوتی ہے، اور تہذیب جب مادی ترقی کے سانچے میں ڈھلتی ہے تو تمدن بنتی ہے۔ ایک ترقی یافتہ تمدن اگر اپنی ثقافت اور تہذیب سے خالی ہو تو وہ مشینوں اور عمارتوں کا مجموعہ تو ہو سکتا ہے، مگر ایک زندہ انسانوں کا معاشرہ نہیں۔ اسی طرح ایک اعلیٰ ثقافت اگر تمدن اور تہذیب سے محروم ہو جائے تو وہ صرف خیالات کا ذخیرہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اصل مقصود نہ صرف تمدن ہے نہ صرف تہذیب، بلکہ ایک ایسی ہم آہنگی ہے جس میں فرد کی روح، سوسائٹی کی اخلاقیات، اور قوم کی مادی ترقی سب ایک خدا پرستانہ نظام کے تحت متوازن اور مربوط ہوں۔ اسلامی تمدن دراصل ایک ایسی تہذیب کا ظہور ہے جو وحی، عقل اور فطرت کی روشنی میں اپنی ثقافت کو سنوار کر ایک روحانی و مادی نظامِ زندگی میں ڈھالتی ہے۔ اسلام کی نظر میں ثقافت، تہذیب اور تمدن محض الفاظ یا تاریخی مظاہر نہیں بلکہ یہ سب انسانی زندگی کے ان شعبوں کی نمائندگی کرتے ہیں جن میں عقیدہ، اخلاق، عمل، علم اور اجتماعیت باہم مربوط ہو کر ایک خدائی نظامِ حیات کو

ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا اطلاقی اور عملی مظہر اسلامی معاشرے کی تشکیل میں نظر آتا ہے، جو نہ صرف خدا کے احکام کی اطاعت پر قائم ہوتا ہے بلکہ اس میں انسان کی روحانی، فکری، اخلاقی اور مادی ضروریات بھی خدا کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت پوری کی جاتی ہیں۔

ثقافت کی اگر بات کی جائے تو اسلام میں ثقافت کا سرچشمہ قرآن، سیرتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ، اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات ہیں۔ ایک اسلامی ثقافت وہ ہے جس میں توحید مرکزِ فکر ہو، انسان کی زندگی مقصد سے خالی نہ ہو، حلال و حرام کا شعور ہو، اور جہاں علم، ادب، شعر، فن، لباس، زبان، طرزِ گفتگو، طرزِ زندگی سب کچھ اللہ کی بندگی کے دائرے میں آکر اپنا رنگ اختیار کرے۔ اسلامی ثقافت کسی قوم کے رسم و رواج یا جغرافیائی حدود تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک فکری و روحانی کیفیت ہے جو انسان کے باطن کو خدا سے جوڑتی ہے اور اس کے ظاہر میں شائستگی، وقار اور دیانت داری کا رنگ بھر دیتی ہے۔

اسلامی تہذیب دراصل اسی ثقافت کا نکھرا ہوا اور سلوک یافتہ عملی روپ ہے۔ جب ایک فرد یا معاشرہ علم، ادب، اخلاق، طرزِ تعلق، حسنِ سلوک اور انسانی کرامت کے اصولوں پر عمل کرتا ہے تو وہ ایک مہذب معاشرہ بن جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی سیرتِ طیبہ، امام علی علیہ السلام کے فرامین، امام زین العابدین علیہ السلام کی دعائیں، اور دیگر آئمہ کی زندگی ہمیں بتاتی ہے کہ اسلامی تہذیب کا مظہر وہ ہے جہاں فرد تنہا بھی ہو تو بھی حق و عدل سے جڑا ہو، اور اجتماع میں بھی ہو تو خیر و انصاف کا علم بردار ہو۔ وہاں نہ جھوٹ ہے، نہ خیانت، نہ ظلم، نہ فحاشی، نہ غفلت—بلکہ ہر عمل کا پیمانہ خدا کی رضا ہے۔

تمدن کی جب بات آتی ہے تو اسلام میں تمدن کا مفہوم صرف سڑکیں، عمارتیں، ٹیکنالوجی یا اقتصادی ترقی تک محدود نہیں، بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام ہے جس میں عدل ہو، امن ہو، علم کی روشنی ہو، وسائل کی منصفانہ تقسیم ہو، اور حاکمیت اللہ کی ہو۔ اسلامی تمدن وہ ہے جہاں حکمرانی کا اصول "اطیعو اللہ والرسول و اولا الامر" پر ہو، جہاں علم و معرفت کو فوقیت دی جائے، جہاں معیشت سود سے پاک ہو، جہاں انصاف خریدا نہ جا سکے، جہاں کمزور کی فریاد سنی جائے، اور جہاں ترقی کا معیار فقط مال نہیں بلکہ تقویٰ اور خدمتِ خلق ہو۔

اس عملی مظہر کی روشن ترین مثال مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست ہے، جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے ایک ایسی معاشرت قائم کی جو دین و دنیا دونوں کا امتزاج تھی۔ وہاں مسجد مرکزِ فکر بھی تھی، عدالت بھی، تعلیمی ادارہ بھی اور سماجی تحفظ کا مرکز بھی۔ یہی نمونہ امام علی علیہ السلام کی حکومت میں ہمیں نظر آتا ہے اس کے بعد اس کی جھلک ایران میں انقلاب کے بعد قائم ہونے والی حکومت ملتی ہے، جہاں انتظامی نظم، اقتصادی عدل، تعلیمی فروغ، فکری آزادی اور روحانی بالیدگی ایک ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔

لہٰذا، اسلام کی نظر میں ثقافت وہ روح ہے جو فرد کے اندر بیداری اور خدا آشنائی پیدا کرتی ہے، تہذیب وہ روشنی ہے جو اس کے کردار میں نرمی، شائستگی اور توازن لاتی ہے، اور تمدن وہ معاشرتی سانچہ ہے جس میں یہ سب عملی شکل اختیار کرتے ہیں۔ یہ تینوں مل کر ایک ایسے نظامِ زندگی کی تشکیل کرتے ہیں جو نہ صرف دنیا میں فلاح لاتا ہے بلکہ آخرت کی کامیابی کا زینہ بھی بنتا ہے۔

سعادت حسن منٹو اور استعمار کی غیر شعوری خدمت

سعادت حسن منٹو برصغیر کے ان ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بے باکی اور بے رحم سچائی کے ساتھ بیان کیا۔ ان کا قلم زہر خند سچائی کا وہ آئینہ ہے جس میں سماج کی منافقت، جنسی گھٹن، طبقاتی تقسیم اور انسانی اقدار کی پامالی کو پوری شدت سے پیش کیا گیا۔ تاہم، جب ہم منٹو کی فکریات کا جائزہ اسلامی فکریات کے تناظر میں لیتے ہیں تو ہمیں کئی پہلو ایسے نظر آتے ہیں جو متصادم اور بعض ایسے بھی ملتے ہیں جن میں تقابل و تفہیم ممکن ہے۔

اسلامی فکریات کا بنیادی مرکز انسان کی تطہیر باطن، تزکیۂ نفس، اور اخلاقی ارتقاء ہے۔ قرآن و سنت کا پیغام انسان کو فحاشی، بے حیائی، اور مایوسی سے بچا کر اُمید، تقویٰ اور عفت کی جانب لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس، منٹو کا بیانیہ اکثر مایوسی، اضطراب اور جنسی کرب میں گھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانے "ٹھنڈا گوشت"، "بو"، "کالی شلوار" اور "کھول دو" جیسی کہانیوں میں عورت کی مظلومیت، مرد کی درندگی، اور سماج کی اخلاقی پستی کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے، وہ قاری کے ضمیر کو جھنجھوڑ تو دیتا ہے مگر اصلاح کا کوئی واضح راستہ نہیں دکھاتا۔

اسلام میں ادب کا مقصد محض حقیقت نگاری نہیں بلکہ ہدایت، عبرت اور تزکیہ بھی ہے۔ منٹو نے انسانی نفسیات کے تاریک گوشوں کو بے نقاب تو کیا، لیکن اکثر یہ بے نقابی بے حیائی اور نفسیاتی دباؤ کی حد تک چلی جاتی ہے۔ وہ انسان کی پستی کا بیان کرتے ہیں مگر اسے بلندی کی جانب مائل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جبکہ اسلامی ادب کا مزاج یہ ہے کہ اگر وہ کسی برائی کو بیان کرتا ہے تو ساتھ ہی اس کا حل بھی پیش کرتا ہے، یا کم از کم اصلاح کی جستجو کو ابھارتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ منٹو کی سچائی، اسلام کے اس تصور سے ہم آہنگ ہے جو منافقت، طبقاتی جبر، اور جھوٹ سے بیزار ہے۔ منٹو کی تحریروں میں ہمیں جھوٹے سماجی نقابوں سے بغاوت، مظلوموں کی آواز، اور ظاہری شرافت کے پسِ پردہ چھپے گناہوں کی نشاندہی ملتی ہے۔ یہ بغاوت اگرچہ اسلام کی روح کے مطابق ہو سکتی تھی، لیکن اسے دینی سانچے میں ڈھالنے کے بجائے منٹو نے اسے محض انسانی ردعمل اور جمالیاتی بغاوت کی صورت دی۔ ان کے ہاں اللہ، رسول، یا دین کا ذکر کم ہی ملتا ہے، اور اخلاقیات کا پیمانہ بھی ذاتی مشاہدے اور احساسات پر قائم ہے، نہ کہ کسی آفاقی اصول پر۔

الغرض یہ کہنا بجا ہو گا کہ منٹو کی فکریات کو اگر اسلامی اصولوں کی روشنی میں پرکھا جائے تو وہ ایک حساس، مگر دینی رہنمائی سے محروم، مشاہدہ نگار نظر آتے ہیں۔ ان کا درد حقیقی ہے، مگر اس کا درماں اسلامی فکر کی روشنی کے بغیر ادھورا ہے۔ اگر منٹو کا مشاہدہ، اسلامی حکمت اور تربیتِ نفس کے اصولوں سے مربوط ہوتا، تو شاید ان کی تحریریں نہ صرف سماج کا آئینہ ہوتیں بلکہ اس کی اصلاح کا ذریعہ بھی بنتیں۔

منٹو کو نوجوانوں میں پروموٹ کرنا، اسلامی فکریات کے تناظر میں، فکری انتشار، ذہنی اضطراب اور اخلاقی بے یقینی کو فروغ دینے کا ایک ایسا ذریعہ بن سکتا ہے جو بالآخر استعمار کے مقاصد کو تقویت دیتا ہے۔ استعمار ہمیشہ ایسے فکری رجحانات کو ہوا دیتا ہے جو امت کو اپنی روحانی، اخلاقی اور تہذیبی بنیادوں سے کاٹ کر ایک بے سمت، مایوس اور خود سے بیگانہ معاشرے میں بدل دیں۔ منٹو کی تحریریں، اگرچہ حقیقت نگاری کے لبادے میں لپٹی ہوئی ہیں، مگر ان میں امید، اصلاح اور روحانیت کی کمی نوجوان ذہنوں کو تاریکی اور بے مقصدی کی طرف دھکیل سکتی ہے۔

جب ایک نوجوان منٹو کے افسانوں کے ذریعے معاشرے کی گندگی، جنسی استحصال، اور اخلاقی زوال کو بغیر کسی دینی یا اخلاقی حل کے دیکھتا ہے تو اس کے اندر یا تو ایک لاچار قبولیت جنم لیتی ہے یا پھر ایک باغیانہ روش جو کسی تعمیری مقصد سے عاری ہوتی ہے۔ اس طرح کے ذہن نہ تو کسی اجتماعی نظام کی بنیاد بن سکتے ہیں اور نہ ہی کسی اسلامی نظریے کے سپاہی۔ وہ خود کو ایک ایسے ماحول میں پاتے ہیں جہاں سب کچھ بدبودار، مکروہ اور ناقابلِ اصلاح نظر آتا ہے، اور یوں ان میں عمل کی بجائے مایوسی، احتجاج کی بجائے بے حسی اور اصلاح کی بجائے طنز اور تمسخر کا رویہ پروان چڑھتا ہے۔

استعمار کے لیے ایسے اذہان نہایت کارآمد ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنی شناخت، نظریہ، اور تہذیبی اقدار سے بیگانہ ہو کر مغربی ماڈل کو یا تو نجات دہندہ سمجھنے لگتے ہیں یا پھر nihilism کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اسلامی فکر جو انسان کو عبدیت، مقصدِ حیات، اُمید اور اصلاحِ نفس کے راستے پر گامزن کرتی ہے، ایسے فکری حملوں کی زد میں آکر پس منظر میں چلی جاتی

ہے۔ یوں نوجوانوں کو منٹو جیسے ادیبوں کے ذریعے جو فکری زہر دیا جاتا ہے، وہ رفتہ رفتہ ان کی روحانی ساخت کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور استعمار کو ایک ایسی نسل مہیا کرتا ہے جو اپنے ماضی سے شرمندہ، حال سے مایوس اور مستقبل کے بارے میں بے یقینی کا شکار ہو، اور یہی فکری غلامی کی بدترین شکل ہے۔

منٹو کو آزادی، سچائی اور فن کے نام پر پوجنے کا رجحان درحقیقت ان استعمار زدہ ذہنوں کی تشکیل کرتا ہے جو ظلم کو صرف تماشا سمجھتے ہیں، مظلومیت کو جنسی کشش کے پیرائے میں دیکھتے ہیں، اور سماجی برائیوں کو تبدیل کرنے کی بجائے ان کا مزہ لینے لگتے ہیں۔ نتیجتاً، منٹو کی پروموشن صرف ایک ادیب کی ترویج نہیں بلکہ ایک مخصوص فکری ایجنڈے کا حصہ بن جاتی ہے جو نوجوانوں کو ان کی ایمانی بنیادوں سے ہٹانے میں معاون ثابت ہوتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں منٹو کا قلم، نادانستہ طور پر، استعمار کے فکری ہتھیار میں ڈھل جاتا ہے۔

نوجوانوں میں جون ایلیاء کی مقبولیت اور استعماری مفادات

جون ایلیاء کی فکریات کو جب اسلامی فکریات کے تناظر میں پرکھا جائے تو ان کی شخصیت ایک ایسے انسان کی جھلک دیتی ہے جو شعور، احساس، تاریخ اور وجود کے گہرے سوالات سے نبرد آزما ہے، مگر ان سوالات کے جوابات کی طرف وہ راستہ اختیار نہیں کرتا جو وحی، نبوت، اور الٰہی ہدایت سے منسلک ہے۔ اسلامی فکریات کا مرکزی محور "توحید"، "نبوت"، "معاد"، اور "عدل" جیسے اصول ہیں جو انسان کے شعور اور عمل کو ایک ایسی بنیاد فراہم کرتے ہیں جس میں فکری اضطراب کا علاج موجود ہے۔ جون کی فکریات اس بنیاد سے ایک فاصلہ رکھتی ہیں، اور یہی فاصلہ ان کے فکری بحران، تنہائی، اور مزاحمت کا اصل سرچشمہ ہے۔

اسلامی فکر انسان کو مقصدِ حیات، اخلاقی ذمہ داری، اور روحانی ارتقاء کے ایک منظم نظام کے تحت دیکھتی ہے۔ یہ فکر زندگی کو ایک بامعنی سفر قرار دیتی ہے جس میں ہر سوال کا ایک الہامی جواب موجود ہے، اور ہر درد، ہر تضاد، ہر شکست کے پیچھے ایک حکمت پوشیدہ ہے۔ جون کی فکر اس حکمت کی تلاش میں تو دکھائی دیتی ہے، لیکن وہ وحی پر مبنی یقین، صبر، اور توکل کے عناصر سے محروم نظر آتی ہے۔ وہ شعور کے اُس مقام پر کھڑے ہیں جہاں سچائی کی جھلک تو نظر آتی ہے، مگر اس کو قبول کرنے کی داخلی آمادگی اور قلبی تسلیم نہیں ملتی۔ وہ فکری سطح پر ایک انکار کی حالت میں ہیں جو مذہبی روایت کو محض معاشرتی جبر یا فرسودہ

عقیدہ سمجھ کر رد کر دیتی ہے، جبکہ اسلامی فکر مذہب کو فطرتِ انسانی کا تقاضا اور عقل و قلب دونوں کی تسکین کا ذریعہ قرار دیتی ہے۔

جون کی شاعری میں تاریخ، تہذیب، مذہب، اور تقدیر پر مسلسل سوالات اور شکوے نظر آتے ہیں، مگر یہ سوالات کسی مکالمے کے دروازے نہیں کھولتے، بلکہ زیادہ تر داخلی شکست، تھکن، اور روحانی بیگانگی کو جنم دیتے ہیں۔ اسلامی فکریات سوال کو رد نہیں کرتیں بلکہ سوال کو سچائی تک رسائی کا دروازہ قرار دیتی ہیں، اور عقل و وحی کے امتزاج سے انسان کو اس کے مقامِ عبودیت، خلیفہ ہونے، اور قربِ الٰہی کے سفر پر گامزن کرتی ہیں۔ جون اس سفر کے ابتدائی مرحلوں میں الجھ کر رہ گئے، انہوں نے سوال کیے مگر جواب کی طرف وہ رجوع نہیں کیا جو قرآن و اہل بیت علیہم السلام کی حکمت میں مضمر ہے۔

ان کی شاعری میں جو مسلسل شکست خوردگی، غم، اور دنیاوی ناپائیداری کا بیان ہے، وہ اس فرد کا نقشہ ہے جو نہ "رضا" کی حالت میں ہے اور نہ "تسلیم" کی۔ اسلامی فکر میں انسان کا دل اگر ذکرِ الٰہی سے خالی ہو تو وہ بے چینی، تشکیک اور نفی کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ جون کی فکریات اسی حالت کی عکاسی کرتی ہیں جہاں عقل تو بیدار ہے، لیکن دل یقین کی روشنی سے خالی ہے۔ وہ ظاہری طور پر مذہب کے نظام سے بد ظن ہیں، مگر باطنی طور پر ان کی کشمکش ایک ایسے روحانی خلا کی نشاندہی کرتی ہے جسے فقط الٰہی ہدایت ہی پُر کر سکتی تھی۔

یوں جون ایلیاء کی فکریات ایک حساس، علم دوست، مگر روحانی اعتبار سے بے راہ فرد کی فکری تصویر ہیں، جو اسلامی فکریات کے معیار پر پورے نہیں اترتیں۔ وہ اپنے سوالات، مشاہدات، اور تجربات میں سچائی کے قریب ہیں، مگر چونکہ وہ ایمان اور وحی کے چشمے سے

سیر اب نہیں ہوئے، اس لیے ان کی فکر کا انجام ایک ایسے اندھیرے میں گم ہوتا ہے جہاں علم ہے، روشنی نہیں؛ سوالات ہیں، سکون نہیں؛ اظہار ہے، مگر تسلیم اور تسکین کی وہ کیفیت موجود نہیں جو اسلامی فکر انسان کو عطا کرتی ہے۔

جون ایلیاء کو نوجوانوں میں بطور ایک فکری، تخلیقی اور بغاوتی علامت کے طور پر پروموٹ کرنا، اسلامی فکریات کے تناظر میں ایک گہرا فکری انتشار اور روحانی اضطراب پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ جون کی شاعری اور شخصیت کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے وہ ایک سچے، حساس اور دنیاوی نظام سے بیزار انسان کی نمائندگی کرتے ہوں، جو ہر چیز سے سوال کرتا ہے، کسی چیز کو حتمی تسلیم نہیں کرتا، اور مذہبی و تہذیبی اصولوں کو ایک طرح سے شک اور نفی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ نوجوانوں کے لیے ایسے کردار پر کشش اس وقت بن جاتے ہیں جب ان کے اپنے ذہن میں بھی سوالات ابھر رہے ہوں، مگر ان سوالات کی رہنمائی کے لیے کوئی مستند، الہامی اور مطمئن کرنے والی فکری روایت موجود نہ ہو۔

اسلامی فکریات انسان کو یقین، تسلیم، عدل، قربِ الٰہی اور مقصدِ حیات جیسی اقدار کی طرف بلاتی ہیں، جبکہ جون کی شاعری میں ان تمام تصورات پر ایک غیر یقینی، شکست خوردہ اور مایوسانہ پردہ پڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جون کا احتجاج، انکار اور شکوہ اسلامی روایت سے مکمل جُڑنے کی بجائے اس سے بیزاری اور بغاوت کی کیفیت پیدا کرتا ہے، جسے نوجوان "سچائی" یا "جرأتِ اظہار" سمجھ کر قبول کرتے ہیں، مگر درحقیقت وہ شعوری و روحانی کمزوری کی تصویر ہوتی ہے، جو فرد کو تخلیقی صلاحیت دینے کے ساتھ ساتھ ایمان، عمل اور قربِ الٰہی سے دور بھی لے جاتی ہے۔

یہی فکری بے سمتی اور روحانی خلا استعمار کے لیے ایک نعمت ہے، کیونکہ وہ نوجوان جنہیں اپنے عقیدے، تاریخ، تہذیب اور روحانی اقدار پر فخر ہونا چاہیے، وہ ایسے شعرا اور شخصیات سے متاثر ہو کر ایک ایسی ذہنی فضا میں چلے جاتے ہیں جہاں وہ ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، خود کو کمزور محسوس کرتے ہیں، اور اجتماعی مزاحمت کے بجائے انفرادی غم، تنہائی اور لاچارگی میں پناہ لیتے ہیں۔ استعمار چاہتا ہے کہ مسلم نوجوان اپنے اصل فکری سرچشموں یعنی قرآن، سیرتِ نبوی، اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات، اور اسلامی تہذیب سے دُور ہو جائیں، تاکہ وہ نہ صرف اپنی شناخت کھو دیں بلکہ ایک ایسی فکری خلا میں مبتلا ہو جائیں جہاں ان کے لیے استعمار کے تیار کردہ ماڈلز اور ثقافتی سانچے ہی سچ، خوبصورتی اور علم کی آخری شکل بن جائیں۔

جون ایلیاء کو جب ایک "ہیرو" کے طور پر نوجوانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، تو گویا ان کے دل میں شکوک، اضطراب، انکار، اور مذہب بیزاری کی ایک نرم لہر ڈالی جاتی ہے، جو وقتی طور پر تخلیقی لگتی ہے، مگر دیرپا طور پر ان کی فکر، ایمان اور شناخت کو کمزور کرتی ہے۔ یہی استعمار کا اصل ہدف ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے باطن میں شکست دے کر ظاہری آزادی کے دھوکے میں مبتلا کر دے۔ اس لیے جون کا اندھا پروموشن نوجوانوں کے اندر وہ فکری و روحانی کمزوری پیدا کر سکتا ہے جو امت کو اجتماعی سطح پر بیداری، مزاحمت، اور قربِ خداوندی کے سفر سے روک دیتی ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں استعمار کو فتح اور امت کو فکری غلامی نصیب ہوتی ہے۔

اسلامی سوشلزم یا صرف اسلام؟!!

"اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح بظاہر دو مثبت چیزوں کو آپس میں جوڑتی ہے—اسلام، جو عدل، مساوات، اور رحم کا دین ہے، اور سوشلزم، جو معاشی انصاف اور طبقاتی استحصال کے خلاف ایک نظریہ ہے۔ تاہم جب ہم اس اصطلاح کو گہرائی سے دیکھتے ہیں، تو اس کے کئی فکری، نظریاتی اور عملی نقصانات سامنے آتے ہیں، جو اسلام کی خالص روح اور اس کے مکمل نظامِ حیات کے ساتھ تضاد پیدا کرتے ہیں۔

سب سے پہلا نقصان اصطلاحی خلط مبحث کا ہے۔ "سوشلزم" ایک مغربی اور الحادی فلسفے سے نکلا ہوا نظام ہے، جس کی فکری جڑیں خدا بیزاری، وحی کی نفی، اور مادہ پرستی میں پیوست ہیں۔ مارکس اور لینن جیسے سوشلسٹ نظریہ دانوں نے مذہب کو انسان کی ترقی میں رکاوٹ اور ایک طبقاتی استحصال کا آلہ قرار دیا۔ جب "اسلامی سوشلزم" کی بات کی جاتی ہے، تو چاہے نیت کتنی ہی نیک ہو، مگر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کو بھی کسی جدید مغربی فلسفے کے تابع کیا جارہا ہے یا اسے قابلِ قبول بنانے کے لیے سوشلسٹ اصطلاحوں کا سہارا لینا ضروری ہے۔ یہ درحقیقت اسلام کی فکری خودمختاری اور اس کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کی حیثیت کو نقصان پہنچاتا ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح اسلامی تعلیمات کو ایک محدود معاشی نظام میں قید کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اسلام صرف معاشی مساوات کا علمبردار نہیں، بلکہ

روحانی، اخلاقی، معاشرتی، اور سیاسی تمام پہلوؤں میں ایک متوازن اور ہم آہنگ نظام پیش کرتا ہے۔ وہ انسان کو صرف ایک معاشی حیوان نہیں سمجھتا بلکہ ایک روحانی و اخلاقی مخلوق مانتا ہے جس کا ہدف آخرت کی کامیابی ہے۔ جبکہ سوشلسٹ نظام انسان کی تعریف صرف معاشی مساوات اور طبقات کی نفی کی بنیاد پر کرتا ہے، اور روحانیت کو غیر ضروری یا مضر سمجھتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کرنا فکری سطح پر ایک گہری لغزش ہے، جو اسلامی نظامِ عدل کو اس کی روحانیت سے جدا کر دیتی ہے۔

اسلامی عدل و مساوات کا نظریہ اس بنیاد پر قائم ہے کہ تمام انسان خدا کی مخلوق ہیں، اور ان میں سے کسی کو کسی پر برتری صرف تقویٰ، علم اور نیک عمل کی بنیاد پر حاصل ہے، نہ کہ نسل، مال، رنگ یا عہدے کی بنیاد پر۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" یعنی "بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔" یہاں مساوات کو صرف سطحی معاشی پیرائے میں نہیں بلکہ ایک روحانی معیار کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔

اسلام میں عدل کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ یہ صرف دولت کی تقسیم کا معاملہ نہیں، بلکہ ہر فرد کو اس کا حق دینا، ہر ذمہ داری کو اس کے دائرے میں رکھنا، اور ہر ظلم کو روکنا عدل میں شامل ہے۔ امام علی علیہ السلام کے مطابق "عدل ہر شے کو اس کے مقام پر رکھنے کا نام ہے۔" لہٰذا اسلامی عدل صرف طبقات کے درمیان فرق مٹانے تک محدود نہیں، بلکہ وہ انسانی معاشرے کے ہر گوشے میں توازن، ہم آہنگی، اور ذمہ داری کا شعور پیدا کرتا ہے۔

اسلامی مساوات بھی ایک عظیم روحانی مفہوم رکھتی ہے۔ یہ صرف اس بات پر اصرار نہیں کرتی کہ سب کو برابر دولت ملے، بلکہ یہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ ہر انسان کو وہ سہولت، احترام، اور ترقی کا موقع دیا جائے جس کا وہ مستحق ہے، اور کوئی بھی فرد غربت، محرومی یا ناانصافی کا شکار نہ ہو۔ اسلام زکات، خمس، صدقات، انفاق فی سبیل اللہ اور بیت المال جیسے اداروں کے ذریعے ایسا منصفانہ نظام قائم کرتا ہے جو نہ صرف فقر کا خاتمہ کرتا ہے بلکہ دلوں کو بھی پاکیزہ بناتا ہے، اور دولت کو اخلاص و تقویٰ کے ساتھ خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

یہی وہ ہمہ گیر، متوازن، اور روحانی نظام ہے جو اسلامی عدل و مساوات کو سوشلسٹ اصولوں سے ممتاز اور برتر بناتا ہے۔ یہ صرف مادی نجات نہیں، بلکہ اخلاقی بلندی، دینی وابستگی اور معاشرتی ہم آہنگی کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا اسلام کو کسی "ازم" میں سمو کر پیش کرنا نہ صرف اس کی جامعیت کو کمزور کرتا ہے بلکہ اس کی انقلابی تاثیر کو بھی محدود کر دیتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام کے عدل و مساوات کو اس کی اصل اصطلاحات اور مفاہیم کے ساتھ پیش کریں، تاکہ اس کی الٰہی حیثیت، فکری بالادستی، اور روحانی طاقت اپنی تمام تر تابناکی کے ساتھ نمایاں ہو سکے۔

کیا مسلمانوں کے خلاف سازشیں "افسانہ" ہیں؟!!

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کفار و مشرکین کی سازشوں، مکارانہ تدبیروں، اور خفیہ چالوں کا واضح اور تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ یہ محض تاریخی بیانات نہیں بلکہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے ایک بصیرت بخش رہنمائی ہے۔ ان آیات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ دنیا کی تاریخ ہمیشہ دو قوتوں کے درمیان کشمکش سے عبارت رہی ہے: ایک طرف وہ قوتیں ہیں جو عدل، ہدایت اور رحم پر مبنی نظامِ الٰہی کی نمائندگی کرتی ہیں، اور دوسری طرف وہ طاغوتی عناصر جو فریب، مکر، اور ظلم پر مبنی استعماری نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ تصور کہ "سازشی نظریات صرف افسانہ ہیں" بذاتِ خود قرآن کے خلاف ہے۔ اگر سازشیں محض خیالات یا مفروضے ہوتیں، تو قرآن ان کا اتنی بار اور اتنی شدت سے ذکر نہ کرتا۔ حضرت عیسیٰؑ کے خلاف یہودیوں کی خفیہ چال ہو، یا نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف قریش کی سازشیں، یا حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا خفیہ مشورہ، یا مختلف قوموں کی مکاریاں — ہر مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان کی چالوں کا پردہ فاش کیا اور بتایا کہ اللہ خود بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔

یہ دنیا واقعی آج بھی انہی سازشوں کی گرفت میں ہے۔ طاقتور سرمایہ دارانہ نظام، میڈیا کا جھوٹا جال، اخلاقی انحطاط، قوموں کی غلامی، عوام پر نفسیاتی و معاشی دباؤ، خاندانی نظام کی تباہی، اور انسانی اقدار کی پامالی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ دنیا کسی ظالم اور طاغوتی طاقت

کے کنٹرول میں ہے۔ ایسی طاقت جو لالچ، ہوس، اقتدار، اور کنٹرول کی بھوک میں انسانوں کو نعمتوں سے محروم کر کے انہیں غلام بنا رہی ہے۔ یہ قوتیں وہی ہیں جنہیں قرآن نے "مجرموں کے سردار"، "بستیوں کے وڈیرے"، اور "مفسدین فی الارض" کے ناموں سے یاد کیا ہے۔

اللہ رب العزت کا تعارف قرآن میں "الرحمٰن" اور "الرحیم" کے طور پر ہوا ہے۔ وہ تو انسانوں کو بن مانگے نعمتیں عطا فرماتا ہے، اس نے رزق کو عام کیا، ہوا، پانی، روشنی، عقل، محبت، والدین، اولاد، علم، اور ہدایت جیسے تحفے دیے۔ وہ بندوں کو غلام نہیں بناتا بلکہ آزاد کرتا ہے، انہیں اپنے نمائندے اور خلیفہ کے طور پر زمین پر بھیجتا ہے۔ پس جب انسان ان نعمتوں سے محروم ہوتا ہے، اپنے فطری حقوق سے دور ہوتا ہے، تو اس کا سبب وہ مکار طاقتیں ہیں جو خدا کی زمین پر خدائی کا دعویٰ کرتی ہیں۔

قرآن کا پیغام بڑا واضح ہے: انسان اگر ظلم، جبر، استحصال اور طاغوت کے خلاف اٹھ کھڑا ہو، اگر وہ خدا کے قوانینِ فطرت کا ساتھ دے، اگر وہ عدل، سچ، اور حریت کی راہ پر چلے، تو اللہ خود اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ مظلوموں کا ولی ہے، ان کے دلوں میں امید جگاتا ہے، ان کے لیے راہیں کھولتا ہے، اور ظالموں کے جال انہی پر الٹ دیتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود اپنی حالت کو بدلنے کے لیے کھڑی نہ ہو۔ لہٰذا انسانی نجات نہ محض دعا سے ہے اور نہ خوابوں سے، بلکہ بیداری، شعور، اور جدوجہد سے ہے۔

سازشی نظریات درحقیقت دنیا کی تلخ حقیقتوں کے عکس ہیں۔ وہ انسانوں کی آنکھیں کھولتے ہیں، انہیں جھوٹے خداؤں سے نجات دلانے کی دعوت دیتے ہیں، اور ایک ایسے نظامِ عدل

کی طرف بلاتے ہیں جو صرف اللہ کے قانون پر مبنی ہو۔ اس جدوجہد میں اگر انسان سچائی، استقامت، اور ہمت سے کام لے تو قرآن کی گواہی کے مطابق اللہ بھی اس کا ساتھ دیتا ہے، اور انجام کار زمین انہی متقین کو وراثت میں دے دی جاتی ہے۔

پس یہ فرض ہے کہ ہم قرآن کی روشنی میں دنیا کے حالیہ استعماری نظام کا تجزیہ کریں، طاغوتی سازشوں کو پہچانیں، ان کے خلاف علمی، اخلاقی، اور عملی سطح پر جہاد کریں، اور یقین رکھیں کہ انجام کار اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور مکر و فریب کی بنیادوں پر قائم نظام فنا ہونے والا ہے۔ حق ہمیشہ غالب رہنے والا ہے، کیونکہ وہ رب کی سنت ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

ذیل میں قرآن کریم کی وہ چیدہ آیات بیان کی جارہی ہیں جس میں کفار و مشرکین کی سازشوں کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

۱۔ پھر (یہودی) کافروں نے (عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے) خفیہ سازش کی اور اللہ نے (عیسیٰ علیہ السلام کو بچانے کے لئے) مخفی تدبیر فرمائی، اور اللہ سب سے بہتر مخفی تدبیر فرمانے والا ہے۔3:54

۲۔ (ان منافقوں کا یہ حال ہے کہ آپ کے سامنے) کہتے ہیں کہ (ہم نے آپ کا حکم) مان لیا، پھر وہ آپ کے پاس سے (اٹھ کر) باہر جاتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ آپ کی کہی ہوئی بات کے برعکس رات کو رائے زنی (اور سازشی مشورے) کرتا ہے، اور اللہ (وہ سب

کچھ) لکھ رہا ہے جو وہ رات بھر منصوبے بناتے ہیں۔ پس (اے محبوب!) آپ ان سے رُخِ انور پھیر لیجئے اور اللہ پر بھروسہ رکھئیے، اور اللہ کافی کارساز ہے۔ 4:81

۳۔ جب کافر لوگ آپ کے خلاف خفیہ سازشیں کر رہے تھے کہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو (وطن سے) نکال دیں، اور (اِدھر) وہ سازشی منصوبے بنا رہے تھے اور (اُدھر) اللہ (ان کے مکر کے ردّ کے لئے اپنی) تدبیر فرما رہا تھا، اور اللہ سب سے بہتر مخفی تدبیر فرمانے والا ہے۔ 8:30

۴۔ (اے حبیبِ مکرّم!) یہ (قصّہ) غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم آپ کی طرف وحی فرما رہے ہیں، اور آپ (کوئی) ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ (برادرانِ یوسف) اپنی سازشی تدبیر پر جمع ہو رہے تھے اور وہ مکروفریب کر رہے تھے۔ 12:102

۵۔ اور انہوں نے خفیہ سازش کی اور ہم نے (بھی اس کے توڑ کے لئے) خفیہ تدبیر فرمائی اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ 27:50

۶۔ تو آپ دیکھئے کہ ان کی (مکارانہ) سازش کا انجام کیسا ہوا، بیشک ہم نے ان (سرداروں) کو اور ان کی ساری قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ 27:51

۷۔ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وڈیروں (اور رئیسوں) کو وہاں کے جرائم کا سرغنہ بنایا تاکہ وہ اس (بستی) میں مکاریاں (سازشیں) کریں، اور وہ (حقیقت میں) اپنی جانوں کے سوا کسی (اور) سے فریب نہیں کر رہے اور وہ (اس کے انجامِ بد کا) شعور نہیں رکھتے۔ 6:123

۸۔ کیا وہ (سازش کار) لوگ اللہ کی مخفی تدبیر سے بے خوف ہیں؟ پس اللہ کی مخفی تدبیر سے کوئی بے خوف نہیں ہوا کرتا سوائے نقصان اٹھانے والی قوم کے 7:99

۹۔ اور جب ہم لوگوں کو تکلیف پہنچنے کے بعد (اپنی) رحمت سے لذت آشنا کرتے ہیں تو فوراً (ہمارے احسان کو بھول کر) ہماری نشانیوں میں ان کا مکر و فریب (شروع) ہو جاتا ہے۔ فرما دیجئے: اللہ مکر کی سزا جلد دینے والا ہے۔ بیشک ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے، جو بھی فریب تم کر رہے ہو (اسے) لکھتے رہتے ہیں۔ 10:21

۱۰۔ کیا وہ (اللہ) جو ہر جان پر اس کے اعمال کی نگہبانی فرما رہا ہے اور (وہ بت جو کافر) لوگوں نے اللہ کے شریک بنا لئے (ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں)۔ آپ فرما دیجئے کہ ان کے نام (تو) بتاؤ۔ (نادانو!) کیا تم اس (اللہ) کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جس (کے وجود) کو وہ ساری زمین میں نہیں جانتا یا (یہ صرف) ظاہری باتیں ہی ہیں (جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں) بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) کافروں کے لئے ان کا فریب و سازش خوش نما بنا دیا گیا ہے اور وہ (سیدھی) راہ سے روک دیئے گئے ہیں، اور جسے اللہ گمراہ ٹھہرا دے تو اس کے لئے کوئی ہادی نہیں ہو سکتا۔ 13:33

۱۱۔ اور بیشک ان لوگوں نے بھی مکر و فریب کیا تھا جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں سو ان سب تدبیروں اور سازشوں کو توڑنا (بھی) اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ خوب جانتا ہے جو کچھ ہر شخص کما رہا ہے، اور کفّار جلد ہی جان لیں گے کہ آخرت کا گھر کس کے لئے ہے۔ 13:42

۱۲۔ اور انہوں نے (دولت و اقتدار کے نشہ میں بدمست ہو کر) اپنی طرف سے بڑی فریب کاریاں اور سازشیں کیں جبکہ اللہ کے پاس ان کے ہر فریب کا توڑ تھا، اگرچہ ان کی مکّارانہ تدبیریں وسازشیں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی اکھڑ جائیں۔14:46

۱۳۔ بیشک اُن لوگوں نے (بھی) فریب کیا جو اِن سے پہلے تھے تو اللہ نے اُن (کے مکر و فریب وسازشوں) کی عمارت کو بنیادوں سے اکھاڑ دیا تو ان کے اوپر سے ان پر چھت گر پڑی اور ان پر اس طرف سے عذاب آپہنچا جس کا اُنہیں کچھ خیال بھی نہ تھا۔16:26

۱۴۔ کیا وہ بُرے مکر وفریب اور سازشیں کرنے والے لوگ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ انہیں زمین میں دھنسا دے یا (کسی) ایسی جگہ سے ان پر عذاب بھیج دے جس کا انہیں کوئی خیال بھی نہ ہو۔16:45

۱۵۔ (اے حبیبِ مکرّم!) صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا اللہ ہی کے ساتھ ہے اور آپ ان (کی سرکشی) پر رنجیدہ خاطر نہ ہوا کریں اور آپ ان کی فریب کاریوں اور سازشوں سے (اپنے کشادہ سینہ میں) تنگی (بھی) محسوس نہ کیا کریں۔16:127

۱٦۔ اور انہوں نے خفیہ سازش کی اور ہم نے (بھی اس کے توڑ کے لئے) خفیہ تدبیر فرمائی اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔27:50

۱۷۔ تو آپ دیکھئے کہ ان کی (مکارانہ) سازش کا انجام کیسا ہوا، بیشک ہم نے ان (سرداروں) کو اور ان کی ساری قوم کو تباہ وبرباد کر دیا۔ 27:51

۱۸۔ اور (اے حبیبِ مکرّم!) آپ ان (کی باتوں) پر غم زدہ نہ ہوا کریں اور نہ اس مکر و فریب و سازش کے باعث جو وہ کر رہے ہیں تنگ دلی میں (مبتلاء) ہوں۔27:70

۱۹۔ جو شخص عزت چاہتا ہے تو اللہ ہی کے لئے ساری عزت ہے، پاکیزہ کلمات اسی کی طرف چڑھتے ہیں اور وہی نیک عمل (کے مدارج) کو بلند فرماتا ہے، اور جو لوگ بری چالوں میں لگے رہتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کا مکر و فریب نیست و نابود ہو جائے گا۔35:10

۲۰۔ (انہوں نے) زمین میں اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھنا اور بری چالیں چلنا (اختیار کیا)، اور برُی چالیں اُسی چال چلنے والے کو ہی گھیر لیتی ہیں، سو یہ اگلے لوگوں کی رَوِشِ (عذاب) کے سوا (کسی اور چیز کے) منتظر نہیں ہیں۔ سو آپ اللہ کے دستور و قوانین میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے، اور نہ ہی اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی پھرنا پائیں گے۔35:43

۲۱۔ اور (عوام کو گمراہی میں رکھنے کے لئے) وہ بڑی بڑی چالیں چلتے رہے۔71:22

حوزہ جانے سے پہلے اور بعد

جب کوئی دینی شعور رکھنے والا فرد، جو صدقِ نیت سے دین کی خدمت اور اصلاحِ امت کے جذبے سے سرشار ہو، علمی میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کی علمی جدوجہد ایک محدود ذاتی مقصد یا شہرت کا راستہ نہیں بلکہ ایک بڑے سیاسی اور تمدنی ہدف سے جڑی ہوتی ہے۔ یہ فرد اپنی ذات سے باہر ایک بڑی دنیا کو دیکھتا ہے جس میں عدل، توحید، ولایت، بصیرت اور اخلاق جیسے اصولوں پر مبنی سماجی نظام قائم ہو۔ وہ علم کو محض معلومات کا مجموعہ نہیں سمجھتا بلکہ ایک تبدیلی کا ذریعہ جانتا ہے، جس کے ذریعے وہ دین کے نظری اصولوں کو عملی معاشروں میں نافذ ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا علم، اس کی تحریر، اس کی تقریر، حتیٰ کہ اس کی خاموشی بھی، اس کی اسی عظیم جدوجہد کا حصہ ہوتی ہے۔

تاہم، جب وہی فرد دیکھتا ہے کہ جن اہداف کو اس نے اپنے فہم، ریاضت اور اخلاص کے ساتھ تشکیل دیا تھا، وہ اہداف پہلے ہی کسی اور شخصیت، جماعت یا قوم میں بیدار اور متحقق ہو چکے ہیں، یا ان پر پیش رفت اس سے کہیں زیادہ گہرائی، ہم آہنگی اور طاقت سے جاری ہے، تو وہ ایک داخلی اضطراب میں مبتلا ہونے لگتا ہے۔ اس کا دل، جو پہلے مکمل طور پر اپنے بنائے ہوئے راستے کی سچائی پر مطمئن تھا، اب دو متوازی حقیقتوں کا سامنا کرنے لگتا ہے۔ ایک وہ جس کی بنیاد اس نے رکھی تھی، اور دوسری وہ جو پہلے سے جاری تھی مگر اس کی نگاہ سے پوشیدہ یا اس کی دسترس سے باہر تھی۔

اس مرحلے پر اس کا شعور دو راستوں میں تقسیم ہو جاتا ہے: ایک طرف اسے اپنا سابقہ فہم، مشقت اور جدوجہد نظر آتی ہے، اور دوسری طرف ایک بہتر، مربوط، ہمہ جہتی اور وسیع تحریک۔ یہ تصادم بظاہر نظریاتی معلوم ہوتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک گہرا روحانی اور نفسیاتی بحران ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ جس دینی مشن کو اس نے اپنی روح سے جوڑا تھا، وہ اب کسی اور کی ملکیت یا قیادت میں آگے بڑھ رہا ہے، اور اس کا اپنا کردار غیر متعلق یا محدود سا بن گیا ہے۔

یہاں سے دو ممکنہ رویے جنم لیتے ہیں۔ پہلا رویہ نفاق کا ہے، یعنی وہ اس نئے اور مربوط نظام کا حصہ بن تو جاتا ہے، مگر باطن میں احساسِ شکست، حسد یا منافقت پالے رکھتا ہے۔ وہ ظاہری طور پر تو اس بڑی تحریک کی تائید کرتا ہے، لیکن دل میں اپنے مقاصد کے کھو جانے کا غم، اپنے نظریاتی تفاخر کا زوال، یا قیادت کے منصب سے محرومی کی چبھن اسے کھائے رکھتی ہے۔ وہ ایسی شخصیت بن جاتا ہے جو اعلیٰ نظام کا نمائندہ دکھائی دیتی ہے، مگر اس کے افکار میں، تحریر میں اور طرزِ عمل میں ایک خفی لطیف تضاد چھپا ہوتا ہے۔

دوسرا رویہ روحانی بلندی اور فکری بالغ نظری کا ہے، اور یہ وہ راستہ ہے جسے صرف وہی افراد اختیار کر پاتے ہیں جو واقعی "طالبِ حق" ہوں، نہ کہ "طالبِ نفس"۔ ایسے افراد جب دیکھتے ہیں کہ ان کا ہدف کسی اور جگہ بہتر طور پر زندہ ہے تو وہ اپنے نفس کے دعویٰ کو فنا کر دیتے ہیں، اپنی انا کو پگھلا کر ایک بڑی تحریک کا شعوری اور خالص حصہ بن جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اصل مقصد ذاتی قیادت نہیں بلکہ الٰہی اہداف کی تکمیل ہے۔ وہ اپنے علم، فکر اور جدوجہد کو اس تحریک کے تابع کر دیتے ہیں، اور یوں وہ "مستقل طالب علم" بن جاتے

ہیں —ایسے طالب علم جو ہر لمحہ سیکھنے کے لیے تیار ہوتا ہے، اپنی رائے کو مکمل سمجھنے کے خمار سے بچتا ہے، اور سچائی جہاں بھی پائے، اسے قبول کر لیتا ہے۔ وہ علمی و فکری بلوغت کے ساتھ اپنے سابقہ احساسات کو ایک متاعِ شکستہ نہیں بلکہ ایک سبق بنا لیتا ہے۔

ایسے لوگوں کی علمی تحریک سیاسی حرارت کھو کر سست نہیں پڑتی، بلکہ ایک نیا توازن پا لیتی ہے۔ وہ جان لیتے ہیں کہ جوش کے بغیر ہوش خطرناک ہے، اور ہوش کے بغیر جوش گمراہ کن۔ ان کی علمی تحریر میں وہ سوز ہوتا ہے جو صرف اخلاص اور شکستِ نفس سے پیدا ہوتا ہے، اور ان کی تقریر میں وہ یقین ہوتا ہے جو صرف تب پیدا ہوتا ہے جب انسان سچائی کے سامنے اپنی ذات کی دیواریں گرا دیتا ہے۔

لہٰذا، وہ لوگ جو اپنے خواب کسی اور کے قافلے میں زندہ دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں، انہیں چاہیے کہ یا تو اپنے اندر جھانک کر نفاق کی ظاہری چمک سے نکلیں، یا پھر سچائی کے سامنے جھک کر اپنے آپ کو ایک بڑے علمی کارواں میں شامل کریں —ایک ایسے کارواں میں جہاں "قیادت" سے زیادہ "خدمت" کو عزت حاصل ہو، اور جہاں ہر قدم اللہ کی خوشنودی اور حقیقت کے فروغ کی نیت سے اٹھایا جائے، نہ کہ اپنی ذات کو منوانے کی ضد سے۔ یہی وہ سفر ہے جس میں انسان خود فنا ہو کر حق میں باقی ہو جاتا ہے، اور یہی فنا اصل بقا ہے۔

حوزہ علمیہ میں داخل ہونے والے افراد مختلف پس منظر، نیتوں، اہداف، اور شخصی رجحانات کے ساتھ آتے ہیں۔ بعض افراد خالص طلبِ علم کے لیے آتے ہیں، ان کے دل میں دین کی گہرائیوں کو سمجھنے اور تقرب الی اللہ کی طلب ہوتی ہے۔ کچھ افراد خاندان یا معاشرے کے دباؤ کے باعث حوزہ کا رخ کرتے ہیں، کہ خاندان میں علما موجود ہیں یا اس راستے کو باوقار

اور با اثر سمجھا جاتا ہے۔ کچھ افراد امام خمینیؒ جیسے انقلابیوں سے متاثر ہو کر اسلامی حکومت کے قیام کے خواب لیے آتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دینی علم میں محض دلچسپی ہوتی ہے، مگر اس کے ساتھ کسی واضح مقصد یا پختہ نیت کے بغیر حوزہ آتے ہیں۔ بعض افراد اس امید سے آتے ہیں کہ یہاں انہیں سکون، روحانی تجربہ، یا نفسیاتی توازن حاصل ہو گا۔

لیکن حوزہ صرف نیت کا آئینہ نہیں، بلکہ ایک تربیتی نظام ہے جو وقت، محنت، فکری کشمکش، اخلاقی مجاہدے، اور روحانی سفر سے گزرتا ہے۔ جب طالب علم اس ماحول میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایک پیچیدہ تجربے سے گزرتا ہے۔ ہر شخص کے لیے یہ تجربہ مختلف ہوتا ہے، اور یہی تجربہ رفتہ رفتہ ان کے باطنی رجحانات، فکری پختگی، اور عملی ترجیحات کو واضح کرتا ہے۔

چند سال بعد جب یہ افراد حوزہ سے خارج ہوتے ہیں، یعنی جب وہ تعلیم مکمل کر چکے ہوتے ہیں یا حوزہ ترک کرتے ہیں، تو ان کی شخصیات میں نمایاں تبدیلی آ چکی ہوتی ہے، اور وہ مختلف اقسام میں بٹ چکے ہوتے ہیں۔ کچھ افراد وہی خلوص اور مقصد لے کر نکلتے ہیں جس کے ساتھ آئے تھے، بلکہ مزید پختگی اور گہرائی کے ساتھ، اور وہ دینی تبلیغ، اصلاحِ معاشرہ، اور سچے خادمِ دین بن جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو رسمی علما بن چکے ہوتے ہیں، مگر ان کی علمی بصیرت، روحانی تڑپ، اور دینی احساس کمزور ہو چکا ہوتا ہے، وہ فقط رسومات، منصب یا خطابات تک محدود ہو جاتے ہیں۔

کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو آغاز میں انقلابی سوچ رکھتے تھے، مگر حوزہ کے اندرونی ماحول، تنقید، علمی جمود یا تضادات سے متاثر ہو کر مایوس ہو جاتے ہیں، یا تو مکمل طور پر بے عملی اختیار کر لیتے ہیں یا صرف اپنے مفادات کی حد تک دین کو استعمال کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی

ہوتے ہیں جو حوزہ میں پختہ نظریاتی تربیت کے بجائے محدود فکری وسعت کے ساتھ باہر آتے ہیں، اور معاشرتی سطح پر فرقہ واریت، تنگ نظری یا شدت پسندی کے مظاہر بنتے ہیں۔ کچھ افراد وہ بھی ہوتے ہیں جو خود کو مکمل طور پر حوزہ کی روایتی حدود سے آزاد کرتے ہیں اور جدید علوم یا سوشیولوجی، فلسفہ، سیاسیات جیسے میدانوں میں جا کر اپنے دینی فہم کو وسعت دیتے ہیں، اور بعض اوقات اس کے نتیجے میں وہ اعتقادی تبدیلیوں یا نظریاتی نرمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بعض طالب علم، جنہوں نے حوزہ میں روحانی ارتقاء کے بجائے صرف علمی رسومات پر توجہ دی ہوتی ہے، وہ معاشرے میں فقط علمی نمائندگی کرتے ہیں مگر روحانی یا اخلاقی اثر چھوڑنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جبکہ کچھ وہ ہوتے ہیں جنہوں نے حوزہ میں اخلاص، فکر، اور معنویت کی محنت کی ہوتی ہے، اور وہ اپنے کردار، گفتار، اور عمل سے معاشرے پر ایسا اثر ڈالتے ہیں جو صرف خطابت یا ظاہری علم سے ممکن نہیں ہوتا۔

یعنی حوزہ ایک دریا کی مانند ہے، جس میں ہر شخص ایک برتن لیے داخل ہوتا ہے۔ کوئی چھوٹا برتن لاتا ہے، کوئی بڑا، کوئی خالی، کوئی بھرا ہوا۔ مگر وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو برتن خالی لے کر آتا ہے، صبر سے، اخلاص سے، اور مسلسل جدوجہد سے اسے بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ داخلے کے وقت جو کچھ ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے، وہ اس کی نیت، اخلاص، ظرف، اور وقت کے ساتھ چلنے کی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔ حوزہ سب کو برابر دیتا ہے، مگر سب برابر نہیں لیتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حوزہ سے نکلتے ہوئے افراد کی اقسام ان کی اصل نیتوں،

داخلی تبدیلیوں، اور دینی فہم کی گہرائی پر مبنی ہو جاتی ہیں، جو صرف علمی ڈگری یا عمامہ سے ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ ان کے وجود سے جھلکتی ہیں۔

یہ مشاہدہ نہایت اہم اور قابلِ غور ہے کہ جو افراد امام خمینیؒ کی شخصیت اور انقلابِ اسلامی ایران سے متاثر ہو کر حوزہ علمیہ قم کا رخ کرتے ہیں، ان کے دل میں ایک ہمہ جہتی دینی، سیاسی اور تمدنی بیداری کا خواب ہوتا ہے۔ وہ اپنے ملکوں کی پستی، استعماری جکڑ بندی، فکری غلامی اور ظالمانہ نظاموں کو دیکھ کر یہ عزم لے کر آتے ہیں کہ وہ بھی امام خمینیؒ کی طرح اپنی قوم میں بیداری لائیں گے، ظلم کا نظام گرادیں گے اور عدل، امامت اور دین پر مبنی معاشرہ قائم کریں گے۔ یہ عزم ان کے لیے ایک روحانی قوت اور فکری سرمایہ ہوتا ہے، جو انھیں ہر دشواری سہنے، ترکِ وطن کرنے، نئی زبان سیکھنے اور علمی مشقتیں جھیلنے پر آمادہ کرتا ہے۔

لیکن جیسے ہی وہ حوزہ علمیہ میں قدم رکھتے ہیں، ایک گہرا اور پیچیدہ تجربہ ان کا منتظر ہوتا ہے۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ وہ جو انقلاب کے لیے بے تاب تھے، وہی حوزہ نہ صرف انقلاب کے متحرک عناصر سے خالی نظر آتا ہے بلکہ کئی جگہ انقلابی فکر کی نسبت محتاط، حتیٰ کہ کبھی کبھی مخالف رویے بھی موجود ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جیسے کئی طلباء کو دیکھتے ہیں جو صرف علمی درجے حاصل کرنے، دینی وظیفہ پانے یا ذاتی علمی ترقی تک محدود ہیں، اور وہ انقلاب و سیاست کی باتوں کو ناپختہ، جذباتی یا غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔

یہ منظر ان کے اندر ایک شدید فکری و روحانی دھچکا پیدا کرتا ہے۔ ان کا پہلے سے قائم کردہ "تصورِ حوزہ" —یعنی کہ حوزہ ایک انقلابی اکیڈمی ہے جہاں ہر فرد ایک امام خمینی ہے، ہر

درس انقلاب کا پیغام ہے، اور ہر استاد ایک سیاسی مجاہد —وہ تصور آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ اور چونکہ وہ اس تصور کو فقط علمی نقشے کے طور پر نہیں بلکہ اپنے جذبہ، دعا، ہجرت اور اخلاص کا مرکز سمجھتے تھے، اس لیے اس کا ٹوٹنا ان کے لیے صرف فکری بحران نہیں بلکہ روحانی بحران بھی بن جاتا ہے۔

یہی وہ موڑ ہوتا ہے جہاں وہ طلباء تین ممکنہ راستوں میں بٹتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اس تضاد کو برداشت نہیں کر پاتے، ان کے اندر مایوسی، بدظنی اور انزواپیدا ہوتا ہے۔ وہ علمی حلقوں سے کٹنے لگتے ہیں یا سطحی طور پر شریک ہوتے ہیں مگر دل سے ٹوٹ چکے ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ماحول کے اثر میں آکر اپنی انقلابی روح کو ترک کر دیتے ہیں اور فقط علمی درجہ، فقہ واصول کی گہرائی، اور حوزوی روایت کے پابند ہو جاتے ہیں، اور یوں رفتہ رفتہ وہ وہی بن جاتے ہیں جن کے خلاف انہوں نے ہجرت کی تھی۔

مگر ایک تیسری قسم ان افراد کی ہوتی ہے جو اس صدمے کو ایک دروازہ بناتے ہیں، دیوار نہیں۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو منظر انہوں نے باہر سے دیکھا تھا، وہ مکمل نہیں تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ امام خمینی نے خود حوزہ کے اندر سے ہی انقلاب کو پروان چڑھایا تھا، مگر اس کے لیے انہیں برسوں کی علمی مشقت، تہذیبِ نفس، بصیرتِ زمان اور فکری پختگی حاصل کرنی پڑی تھی۔ چنانچہ یہ طلباء اپنے انقلابی جذبے کو خلوص کے ساتھ محفوظ رکھتے ہوئے اپنے نظریات کو پختہ کرنے، اپنی زبان و بیان کو سنوارنے، اپنی فکر کو عمیق کرنے، اور اپنے مقام و وقت کا شعور حاصل کرنے کی طرف بڑھتے ہیں۔

وہ جان لیتے ہیں کہ انقلاب فقط نعرہ نہیں، بلکہ ایک فکری نظام، اخلاقی ارتقاء اور اجتماعی شعور کا نام ہے۔ وہ حوزہ میں خود کو ایک "انقلابی داعی" کے بجائے "ایک خاموش سیکھنے والے" میں بدل دیتے ہیں، تاکہ کل وہ دن آئے جب ان کا عمل ان کے قول سے زیادہ با اثر ہو، اور ان کی شخصیت خود ایک دلیل بن جائے۔ وہ ذاتی تشخص کے بجائے حقیقی معنوں میں "فرزندِ حوزہ" بن کر اس علمی و روحانی ورثے کے حامل بنتے ہیں جس سے امام خمینی جیسے مجدد و مجاہد پیدا ہوئے۔

یوں یہ بحران اگرچہ تکلیف دہ ہوتا ہے، مگر جو طالب علم اس سے گزر کر اپنی نیت کی خلوص کو بچا لے، وہ نہ صرف خود بچتا ہے بلکہ اپنے ملک، قوم اور امت کے لیے مستقبل کا چراغ بھی بن جاتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں "سیاسی جوش" خاموشی سے "الٰہی بصیرت" میں ڈھلتا ہے، اور طالب علم علم و عمل کے سفر میں ایک نیا جنم لیتا ہے۔

About Author: S. Jahanzaib Abidi is a distinguished author known for his extensive collection of articles covering a wide range of subjects, including philosophy, religion, education, politics, economics, media, and society. His prolific writings showcase a deep understanding and insightful analysis across diverse topics, making him a notable figure in the realm of article series.

With a keen intellect and a penchant for thorough exploration, Abidi's contributions offer readers a nuanced perspective on various issues, establishing him as a respected writer whose work resonates across different spheres of thought and discourse. His thought-provoking articles contribute significantly to the intellectual landscape, fostering a deeper understanding of complex subjects.